نوادرِ اقبال نمبر

شعبۂ اردو جامعہ پشاور

۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

شعبۂ اُردو کے دو مرحوم سابقہ اساتذہ

ڈاکٹر طاہر فاروقی مرحوم

پروفیسر اعجاز الرحمٰن مرحوم

کے نام، جن کی گونج گاہے ماہے شعبۂ اُردو کے درودیوار سے سنائی دیتی رہتی ہے۔

نوادرِ اقبال نمبر

بسلسلہ تقریباتِ سالِ اقبال ۲۰۰۲ء

سرپرستِ اعلیٰ : ڈاکٹر ذوالفقار گیلانی

وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی

مرتب : ڈاکٹر صابر کلوروی

صدرِ شعبۂ اُردو

شعبۂ اُردو جامعہ پشاور

۲۰۰۳ء

خیابان: نوادرِ اقبال نمبر

سلسلہ مطبوعات (۳)

ناشر	:	ڈاکٹر صابر کلوروی
مطبع	:	دستاویز پبلشرز لاہور
اہتمامِ اشاعت	:	خالد مجید
کمپوزنگ	:	شہزاد حمد، وہاب اعجاز، امجد
ٹائیٹل ڈیزائننگ	:	شہزاد احمد
سالِ اشاعت	:	۲۰۰۳ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	-/۲۰۰

فہرستِ مضامین

حصہ سوم علامہ کے چار اہم اسفار

حصہ چہارم سیمی نار کے مقالات

حصہ پنجم نایاب مضامین ومقالات

حصہ ششم گوشہ طلبہ

حصہ ہفتم متفرق تحریریں اور عکس

باعث تحریر

''اصناف سخن نمبر'' کے بعد اب خیابان کا ''نوادرِ اقبال'' نمبر شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ نمبر بھی دراصل ان تینوں سیمی ناروں کی ایک کڑی ہے جو میڈم منور روف نے اپنے دورِ صدارت میں باڑہ گلی کے تفریحی مقام پر کامیابی سے منعقد کئے تھے۔ آخری سیمی نار جو اقبال کے موضوع پر تھا، ۱۹۹۵ء میں منعقد ہوا۔ منور روف صاحبہ کا دورِ صدارت ختم ہوا اور اس دوران میں وہ شعبہ سے ریٹائر بھی ہو گئیں۔ سیمی نار میں پڑھے جانے والے بیشتر مقالات جہاں تہاں شائع ہو گئے۔ جو کچھ غیر مطبوعہ ہے اس نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے۔

۲۰۰۲ء کے سال کو حکومت نے اقبال کا سال قرار دیا۔ مجھے اس امر کا شدت سے احساس تھا کہ سالِ اقبال کے ضمن میں پشاور یونیورسٹی میں کوئی اہم تقریب منعقد نہ کی جا سکی۔ چنانچہ میں نے پروفیسر عدنان سرور کی معیت میں وائس چانسلر صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس اہم قومی موضوع پر ''خیابان'' کا ایک خصوصی نمبر چھاپنے کی اجازت مرحمت کریں۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ حسبِ معمول وائس چانسلر ڈاکٹر ذوالفقار گیلانی صاحب نے بڑی فراخ دلی سے خیابان کے لئے گرانٹ کی منظوری دے دی۔

خیابان کے اس شمارے کو ''نوادرِ اقبالؒ'' کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ سالِ اقبال کے حوالے سے کچھ ایسا مواد سامنے لانا مقصود تھا جس سے اقبالیاتی تحقیق کو فروغ حاصل ہو۔ چنانچہ میں نے اپنے ذاتی ذخیرے سے بہت سا مواد اس نمبر کے لئے مختص کر دیا۔

خیابان کے اس نمبر میں دیگر مواد بھی نوادر ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ مثلاً مجھے شعبۂ اُردو کے ریکارڈ سے وہ لیکچر مل گیا جو این میری شمل نے شعبۂ اُردو میں آ کر دیا تھا۔ شعبۂ اُردو کے دو سابقہ صدور ڈاکٹر طاہر فاروقی اور ڈاکٹر شمس الدین کے نادر مضامین بھی مجھے دستیاب ہو گئے۔ پروفیسر ڈاکٹر اشرف عدیل صاحب نے میری درخواست پر ''خیابان'' کے لئے ایک خوبصورت مقالہ قلم بند کیا۔

اس برس شعبۂ اُردو کا نیا نصاب لاگو ہوا جس میں اقبال کے پرچے میں بعض نئے موضوعات شامل کئے گئے چنانچہ محسوس کیا گیا کہ بعض موضوعات پر طالب علموں کو مواد کے ضمن میں مشکلات درپیش ہوں گی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے گوشہ طلبہ کے عنوان سے بھی بعض مقالات شامل کئے گئے ہیں۔ اس گوشے میں اقبال کے فن پر

ڈاکٹر نوار الحسن نقوی کا مضمون خاصے کی چیز ہے اور میرے خیال میں اس مضمون کو اس موضوع پر حرفِ آخر کا درجہ حاصل ہے۔ نیز اقبال کی نظم ''محراب گل افغان کے افکار'' پر بھی ایک مضمون شامل کیا گیا ہے۔ افسوس پروفیسر خاطر غزنوی کا گراں قدر مقالہ ہمیں ایسے وقت میں موصول ہوا جب کہ مسودہ پریس کے لئے تیار تھا۔ انشاء اللہ یہ مضمون خیابان کی اگلی اشاعت میں شائع کیا جائے گا۔

رسالے کی تیاری میں سب سے مشکل مرحلہ پروف ریڈنگ کا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں بادشاہ منیر بخاری، سلمان علی، شیر علی، اسحاق وردک، عامر رؤف، محمد ستار اور محمد عباس کے نام نمایاں ہیں۔ کتابت کا مرحلہ وہاب اعجاز، امجد اور شہزاد احمد کی کاوشوں کا مرہون منت ہے۔ رسالے کی اشاعت کے لئے ہم ''دستاویز'' لاہور کے خالد مجید صاحب کے شکر گذار ہیں۔

الحمد اللہ ہمارا پہلا سیمی نار ''نصاب اور تدریس اُردو''، دوسرا ''تحقیق'' کے موضوع پر کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ ان دونوں سیمی ناروں کے مقالات مقتدرہ قومی زبان سے شائع ہو رہے ہیں۔ اب تیسرا سیمی نار ''صوبہ سرحد کے ادب (اُردو)'' کے موضوع پر ۲۶ تا ۳۰ اگست ۲۰۰۳ء بارہ گلی سمر کیمپ میں منعقد ہو رہا ہے۔ ان شاء اللہ اس سیمی نار کے مقالات کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا جائے گا۔ ہمیں یہ امید بھی ہے کہ ہم سیمی نار کے موقع پر اس خصوصی نمبر کو منصۂ شہود پر لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اور یہ نمبر بھی نہ صرف آپ کو پسند آئے گا بلکہ اسے حوالے کے طور پر بھی استعمال کیا جائے گا۔

۱۴ اگست ۲۰۰۳ء

صابر کلوروی

صدرِ شعبہ اُردو پشاور یونیورسٹی

Lahore
2nd Aug. 1936

Dear Ghulam Rasul Khan,

As I am not well I shd. like the Parliamentary Bd. to appoint somebody else as provisional President of the Bd. Please place my resignation from the Provincial Presidentship of the Bd. before the Bd.

Also call an emergency meeting of the Bd. on the 13th of Aug. 6 P.M. — Barkat Ali Mohammedan Hall with the following agenda:

1. Finance & payment of bills.
   My proposal that each member of the Bd. should pay Rs 25/- towards the expenses of the Bd. or cease to be a member of the Bd.
2. Election of Provincial President.
3. Miscellaneous e.g. passing of bills & addition of members.

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

مسلم لیگ کے سیکریٹری غلام رسول کے نام علامہ کا ایک غیر مطبوعہ خط

نوادراتِ اقبال

خطوط، غیر مطبوعہ کلام، نثری تحریریں، بیاناتِ وتقاریر،
مضامین، شذرات، انٹرویو، اخبارِ اقبال، ملفوظاتِ اقبال

(ا) منشی غلام قادر فرخ امرتسری کے نام اہم خط

عام طور پر اقبال کے ہاں دوقومی نظریے کا آغاز خطبہ آلہ آباد ۱۹۳۰ء سے کیا جاتا ہے۔ مشہور تاریخ دان کے۔ کے عزیز نے History of idea of pakistan کے ارتقا میں اسی خطبے کو پیش نظر رکھتے ہوئے دوقومی نظریے کے ارتقاء میں علامہ کا مقام چالیسویں نمبر پر رکھ کر اُن سے یہ اعزاز چھیننے کی کوشش کی کہ موصوف دوقومی نظریے کے اولین علمبرداروں میں تھے۔ راقم الحروف منشی غلام قادر فرخ امرتسری کی خودنوشت ''سفینہ حیات'' میں شائع شدہ ایک خط تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۱۹۰۹ء ہی میں علامہ کے ذہن میں دوقومی نظریے کا واضح تصور موجود تھا۔ علامہ کے ذہنی ارتقاء کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جب ہم بانگ درا کے اس شعر پر پہنچتے ہیں تو اس خط کے مندرجات کی مزید تصدیق ہوجاتی ہے۔ شعر یہ ہے۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا

بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحاد وطن نہیں ہے

علامہ کا یہ شعر غزلیات کا ہے اور ۱۹۰۸ء سے پہلے کے کلام میں درج ہے۔ یوں اگر کے۔ کے عزیز کی تحقیق کو درست تسلیم کیا جائے تو بھی علامہ کا نام دوقومی نظریے کے داعین میں اولین سات آٹھ لوگوں میں آسانی سے شامل کیا جاسکتا ہے۔ اب ہم زیرِ بحث خط کا پس منظر پیش کرتے ہیں۔ امرتسر میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی ایک مشترکہ علمی وادبی تنظیم تھی جس کا نام ''منروالاج'' تھا۔ اس تنظیم کے تحت ایک ماہوار رسالہ ''منروا'' نکلتا تھا مارچ ۱۹۰۹ء میں منشی غلام قادر فرخ۔ نے علامہ کو اس کے سالانہ جلسے میں شرکت کرنے کی دعوت دی چونکہ انہی تاریخوں میں لاہور میں انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ ہورہا تھا اس لئے علامہ نے شرکت سے معذوری ظاہر کردی اور لکھا کہ '' مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ امرتسر کے مسلمانوں کے خیالات ''منروالاج'' کی نسبت اچھے نہیں ہیں۔'' علامہ کا یہ خط دستیاب نہیں ہوسکا تاہم اس خط کے جواب میں منشی صاحب نے علامہ کو لکھا کہ اس لاج میں مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے لیکن سب اسلامی اخوت ومساوات پر کاربند ہیں۔ بہت کوشش کی جارہی ہے لیکن مسلمان اس تنظیم میں شامل ہونے سے کترا رہے ہیں۔ علامہ کا درج ذیل مکتوب اسی خط کے جواب میں ہے۔ مکمل خط اب دستیاب نہیں۔

مکتوب:

باوجود کوششِ بلیغ کے مسلمان برہموسماج اور کانگریس کی مجالس سے متنفر رہے اور اب تک ہیں۔ خیر ان کی نسبت تو کہا جا سکتا ہے کہ ان ہر دو تحریکوں سے روکنے والے بہت سے تھے مگر میں دیکھتا ہوں کہ جس شہر یا گاؤں میں دو سکول تھے ایک ہندوؤں کا اور دوسرا عیسائیوں کا تو مسلمان فطرتاً عیسائیوں کے سکول کی طرف متوجہ ہوئے خواہ ہندوؤں کا مدرسہ بھی ان کے لئے کشادہ ہو۔ یہ ایسے واقعات ہیں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے کوئی متفقہ حکمت عملی سوچنے کے لئے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

میں خود اس خیال کا حامی رہ چکا ہوں کہ امتیازِ مذہب اس ملک سے اُٹھ جانا چاہیے اور اب تک پرائیویٹ زندگی میں اس پر کاربند ہوں مگر اب میرا یہ خیال ہے کہ قومی شخصیت کو محفوظ رکھنا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے ضروری ہے۔ ہندوستان میں ایک مشترک قومیت پیدا کرنے کا خیال اگرچہ نہایت خوبصورت ہے اور شعریت سے معمور ہے تاہم موجودہ حالت اور قوموں کی نادانستہ رفتار کے لحاظ سے ناقابل عمل ہے۔"

(۲۸ مارچ ۱۹۰۹ء)

---

(۲) مکتوب بنام ڈاکٹر کچلو

پس منظر:

اسلامیہ کالج کے یونیورسٹی سے الحاق کرنے یا جدا کرنے کے متعلق مسلمانوں کے ایک جلسہ عام میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ جمیعتہ العلمائے ہند کے فتویٰ کے مطابق حکومت کے ساتھ تعاون کرنا شرعاً حرام ہے اس لئے کالج کا یونیورسٹی سے الحاق ختم کر دینا چاہیے اور جب تک متبادل انتظامات نہیں ہو جاتے کالج ۱۱ دسمبر کو نہ کھولا جائے۔ لیکن چونکہ کالج کھولنے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اس ضمن میں انجمن کے سرکردہ اراکین دو گرہوں میں بٹے ہوئے تھے اس لئے تصادم سے بچنے کے لئے یہ راہ نکالی گئی کہ کالج کو فی الحال کھلنے دیا جائے۔

علامہ کا یہ خط اسی سلسلے میں لکھا گیا۔ سیف الدین کچلو مسلمانان لاہور کے اُس گروہ سے سرخیل تھے جو کسی بھی صورت میں الحاق کا حامی نہ تھا۔ اقبال پہلے پہل خود بھی کچلو کے ہمنوا تھے لیکن انجمن کے سیکریڑی کی حیثیت سے ان کی یہ بھی ذمہ داری تھی کہ وہ انجمن کو انتشار سے بچائیں۔ چنانچہ ڈاکٹر کچلو نے اقبال کو مہلت دے دی اور اُمید ظاہر کی کہ انجمن

احکام الٰہی کے مطابق فیصلہ کرے گی۔ [1]

مکتوب:

لاہور

۱۰ دسمبر ۱۹۲۰ء

ڈیر ڈاکٹر کچلو

بعض ممبران کونسل انجمن کی طرف سے ریکوازی الیشن (مطالبہ) مجھے اس وقت شفاعت اللہ صاحب سے موصول ہوگئی ہے۔ اب انشاء اللہ مسلہ الحاق کونسل کے سامنے پھر پیش ہو جائے گا۔ اور اس بات کی پوری کوشش کی جائے گی کہ انجمن اپنے فیصلہ میں علماء سے استصواب کرے۔ جہاں تک ممکن ہوگا جلد کونسل کا اجلاس منعقد کر کے یہ ریکوازی ایشن (مطالبہ) پیش کی جائے گی۔ تا فیصلہ میری رائے میں کالج کھول دینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو بھی اس سے اتفاق ہوگا۔ موجودہ حالات میں غالباً یہ سب سے بہتر طریق عمل ہے۔ مہربانی کر کے اپنی رائے سے مطلع فرما کر ممنون فرمائیے۔ [2]

والسلام

مُخلص

محمد اقبال

[1] ملاحظہ ہو مکتوب ڈاکٹر کچلو بنام ڈاکٹر محمد اقبال مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۰ء : اقبال اور انجمن حمایت اسلام ص ۱۰۴
کچلو کا یہ خط زمیندار میں بھی شائع ہوا۔

[2] اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام ص ۱۰۴ ، زمیندار اخبار ۱۱ دسمبر ۱۹۲۰ء

(۳) خط بنام محمد عثمان

پس منظر:

محمد عثمان حیدر آباد دکن کے ماہرِ تعلیم تھے۔ والد کا نام محمد قاسم تھا۔ ۱۸۹۵ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ گئے جہاں سے ۱۹۱۶ء میں بی اے کیا ۱۹۲۰ء میں حیدر آباد کی نظامت تعلیمات سے منسلک ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے اور واپس آ کر عثمانیہ ٹریننگ کالج میں وائس پرنسپل مقرر ہوئے ۱۹۳۷ء میں صوبہ اورنگ آباد میں ڈائریکٹر آف

ایجوکیشن بنے۔ان کی تصانیف میں ''رہنمائے سعادت''، ''اخلاقیات'' اصول تعلیم (۱۹۳۸ء)، مبادی نفسیات (۱۹۳۵ء) اور نفسیاتِ تعلیمی اہم ہیں۔ آخر الذکر کتاب جس پر علامہ نے تبصرہ کیا مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدر آباد سے شائع ہوئی۔

مکتوب: [1]

''کئی سال قبل اسپنسر[2] کا اُردو ترجمہ شائع ہوا تھا مجھے نہیں معلوم کہ لوگوں نے اس کتاب کو پڑھا یا اس سے استفادہ کیا۔ لیکن مجھے کوئی شبہ نہیں کہ آپ کی ''نفسیات تعلیم'' ان حضرات کے تخیل کے لیے تازہ غذا بہم پہنچائے گئی جنہیں تعلیم سے دلچسپی ہے''[3]

[1] اقبال کی یہ رائے ایک خط کی شکل میں تھی جو کتاب ''نفسیات تعلیمی'' کے دوسرے ایڈیشن کے آغاز میں مولوی سجاد مرزا، عبدالماجد دریابادی اور مسٹر پکھتال کی آرا کے ساتھ شامل تھی۔ کتاب پر سنہ درج نہیں لیکن ڈاکٹر معین الدین عقیل کا خیال ہے کہ یہ خط مصنف کی انگلستان سے واپسی (یعنی ۱۹۳۲ء) کے بعد لکھا گیا ہوگا۔

[2] اسپنسر کے ترجمے سے مراد خواجہ غلام الحسنین کا وہ ترجمہ ہے جو ۱۹۰۶ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا۔

[3] مشمولہ غالب بعنوان دو نوادر از معین الدین عقیل

---

(۴) مکتوب بنام مولانا عبدالماجد بدایونی

پس منظر:

یہ خط بدایونی صاحب کی کتاب ''نظام عمل'' کے سلسلے میں ہے۔اس کتاب میں مسلمانوں کی دینی اور دینوی زندگی سے متعلق آیات واحادیث جمع کی گئی ہیں علاوہ ازیں مسائل فقہ، فرائض وعبادات احکام اسلام کی فلسفانیہ بحثوں پر مواد موجود ہے۔اقبال کی رائے کے علاوہ علامہ عبداللہ یوسف علی' مولانا عبدالماجد دریابادی' سید راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کے خطوط بھی کتاب میں درج ہیں۔

مکتوب:

جناب مولانا۔ السلام علیکم

''آپ کی کتاب نظام عمل میں نے دیکھی۔اس زمانے میں جبکہ احکام دین سے بے خبری عام ہوگئی ہے

آپ کی کتاب عام مسلمانوں کے لئے ہدایت کا مرقع ثابت ہوگی۔ جزاك الله احسن الجزا

محمد اقبال ۵ نومبر ۳۶ء

۱؎ مشمولہ ''نظام عمل''۔ ناشر محمد عابد القادری

---

(۵) خط بنام مولانا محمد علی ۱؎

مرزا یعقوب بیگ سے علامہ کے تعلقات بہت پرانے تھے۔ اقبال کی لدھیانہ والی شادی میں جو چند احباب اقبال کے ہمراہ تھے ان میں مرزا صاحب بھی شامل تھے۔ علامہ نے ان کے انتقال پر تعزیت کا یہ خط مولانا محمد علی کو لکھا، جسے مرزا صاحب کے بیٹے میرزا مسعود بیگ نے اپنی کتاب ''آئنیہ صدق وصفا'' میں شامل کیا۔

مکتوب:

مولانا محمد علی

مکرمی مولوی صاحب: ابھی اخبار انقلاب میں ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب مرحوم کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت رنج ہوا۔ وہ شرافت کا پیکر مجسم تھے اور فطرتاً بنی نوع انسان کے ہمدرد، خدا تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کے صاحبزادے کہاں ہیں آپ از راہِ عنایت میرا پیغام ہمدردی ان تک پہنچادیں۔ میں کئی روز سے نزلہ کی وجہ سے صاحب فراش ہوں۔ ورنہ اس مقصد کے لئے خود ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔

والسلام

محمد اقبال

۱؎ مولانا محمد علی لاہوری مراد ہے جو انجمن احمدیہ لاہور کے صدر تھے اور قران حکیم کا انگریزی میں ترجمہ کیا احمدیہ مسجد براندرتھ روڈ لاہور کے خطیب تھے۔ ۱۳ اکتوبر 9151ء کو فوت ہوئے اور میانی کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

(وقیات مشاہیر پاکستان ص ۲۵۸)

۲ مرزا یعقوب بیگ کا انتقال ۱۱۔۱۲ فروری ۱۹۳۳ء کو ہوا۔ انقلاب میں خبر ۱۲ فروری کو چھپی۔ اس لحاظ سے یہ خط بھی ۱۲ فروری ۱۹۳۳ء کو لکھا گیا۔

۳ مشمولہ ''آئینہ صدق وصفا'' سوانح حیات مرزا یعقوب بیگ۔ مولف میرزا مسعود بیگ شائع کردہ انجمن اشاعت اسلام لاہور ۱۹۶۵ء

---

(۶) خط بنام امجد نجمی

درج ذیل خط شاخسار کے ایڈیٹر امجد نجمی کے نام ہے۔

نجمی ۲۹ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو کٹک میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد یوسف تھا۔ پہلے حبیب اللہ تسنیم جبلپوری سے اصلاح لینا شروع کی اور انہی کے کہنے پر اپنا تخلص امجد سے نجمی کر دیا۔ اقبال سے یک گونہ عقیدت تھی لہٰذا ان سے اصلاح لینے کی کوشش کی لیکن اقبال نے انہیں ٹال دیا۔ محکمہ ریلوے میں ملازمت کی۔ پھر ڈرامے کی طرف مائل ہو گئے مدتوں کٹک کے دوماہی رسالے شاخسار کے مدیر رہے۔ یہ رسالہ ۱۹۶۵ء میں جاری ہوا یکم فروری ۱۹۷۴ء کو انتقال ہوا اور درگاہِ بازار کٹک کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ ۱؎ طلوع سحر (۱۹۶۱ء) اور جوئے کہکشاں (۱۹۶۹ء) دو شعری مجموعے ہیں جو شائع ہو چکے ہیں۔

مکتوب:

جنابِ من۔ السلام علیکم

آپ کے اشعار کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ اُمید ہے کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا۔ شعر کے لئے بہترین ہدایت ہے کہ بہترین اساتذہ کے کلام کو مطالعہ کیا جائے۔

مخلص محمد اقبال

۱۲ دسمبر ۳۴ء

۱؎ تذکرہ معاصرین جلد ۳ از مالک رام صفحہ ۳۰

۲؎ شاخسار شمارہ ۲۔۳ ۱۹۲۷ء (انڈیا)

خطوط بنام ظفر علی خان (ایڈیٹر زمیندار)

ذیل میں ایڈیٹر زمیندار، ظفر علی خان کے نام علامہ اقبال کے ایسے خطوط شامل کئے جا رہے ہیں جو ہنوز غیر مدّون ہیں۔ یہ خطوط نہ تو اقبال کے کسی مجموعے میں شامل ہیں اور نہ انہیں "اقبال اور ظفر علی خان" مرتبہ جعفر بلوچ میں جگہ مل سکی ہے۔ اس مجموعے میں صفحہ ۲۰۱ تا ۲۱۵ پر اقبال کے ظفر علی خان کے نام دس (۱۰) خطوط شامل کئے گئے ہیں درج ذیل خطوط ان خطوط کے علاوہ ہیں اور پہلی بار مدّون شکل میں سامنے لائے جا رہے ہیں۔

خط نمبر ۱

پس منظر:۔

علامہ محمد شبلی نعمانی کا انتقال ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء (۲۸ ذیعجہ ۱۳۳۲ھ بروز چہارشنبہ صبح ہوا۔ اکبر الہ آبادی اور خواجہ عزیز الدین لکھنوی نے تاریخ نکالی۔ اقبال نے بھی ایک تاریخ نکالی۔ غلطی سے اقبال سے ایک لفظ چھوٹ گیا جس سے ۱۰۰ اعداد کم ہوگئے۔ اس غلطی کی نشان وہی مولوی سیدّ علی زینی نے کی جو دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں ادب کے استاد تھے ایڈیٹر زمیندار کے نام درج ذیل دونوں خطوط اسی ضمن میں ہیں۔

بنام ایڈیٹر زمیندار

"مندرجہ ذیل الفاظ مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے لوح مزار کے لیے نہایت موزوں و مناسب ہوں گے۔ انہی سے ان کی تاریخ وفات کا سال بھی نکلتا ہے۔"(۱)

امام الہند شبلی طاب ثراہ

(زمیندار۔۳ دسمبر ۱۹۱۴ء)

"میں نے جو جملہ مولانا شبلی کے لوحِ مزار کے لیے تجویز کیا تھا وہ اصل میں یہ تھا۔

" امام الہند والانژاد شبلی طاب ثراہ"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو خط میں نے آپ کو لکھا تھا اُس میں میری غلطی سے لفظ "والانژاد" تحریر میں نہ آیا اور آپ کے اخبار میں بھی اسی طرح شائع ہوگیا۔ بہر حال میں اپنی فروگذاشت سے خوش ہوں کہ اس وجہ سے مولانا سید علی پروفیسر ادب دار العلوم لکھنؤ کو ایک ایسا تاریخی جملہ سوجھ گیا جو میرے جملے سے بہت زیادہ موزوں ہے۔" (۲)

محمد اقبال

خط نمبر۳

پس منظر:۔

اقبال کے ایک خط سے یہ اقتباس "نذرِ اقبال" کے عنوان سے زمیندار میں چھپا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط مئی کے آخری ہفتے میں لکھا گیا عرشی امرتسری نے اقبال کی خاموشی کو توڑنے کے لیے ایک قطعہ لکھا تھا جس کا مثبت اثر ہوا۔ مدیر زمیندار اس خط کی تمہید بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"جناب عرشی کے گلہ آفریں پیام کا اہلِ دل کو منت گذار ہونا چاہیے کہ علامہ اقبال کو اپنا طلسم سکوت توڑتے ہی بنی اور چرخ حقہ باز کے شعبدوں کو اپنی انکھوں دیکھ لینے کے باوجود گفتگو کا دروازہ انہوں نے بند نہ کیا بلکہ چشم عاشق کی طرح کھول دیا۔ اشاعت امروزہ میں کسی دوسری جگہ ان کے ایک قصیدے کے چند ابتدائی اشعار درج ہیں جو ہنوز نا تمام ہے۔ جب یہ نظم ختم ہو کر ان اوراق میں چھپے گی تو گریبان و دامن کا رہا سہا فرق بھی جاتا رہے گا۔"

خط بنام مدیر زمیندار

"مضامین تازہ کے انبار کہاں سے لا کر لگاؤں۔ وہی اگلی باتیں ہیں جو سیکڑوں دفعہ دہرائی جا چکی ہیں۔ وہی پرانا دُکھڑا ہے جو ہزار بار رویا جا چکا ہے۔ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" میں کون سی ایسی حقیقت ہے جو بے نقاب نہیں کی جا چکی۔ کون سا ایسا نکتہ ہے جو صراحتہً یا کنایتہً بیان نہیں کیا جا چکا" (۳)

خط نمبر ۴

پس منظر:۔

زیرِ نظر خط میں لدھیانہ والی بیگم کی وفات کا ذکر ہے جس کا انتقال ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو زچگی کے دوران ہوا۔(۴)

علامہ نے اپنے بھائی شیخ عطا محمد کو اس موقع پر لکھا۔

"تقدیر الٰہی کا مقابلہ تدبیر انسانی سے نہیں ہوسکتا۔ مرحومہ کی موت کا منظر نہایت دردانگیز تھا۔۔۔ بہترین ڈاکٹروں کا علاج تھا مگر اللہ کے علم میں مرحومہ کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ "(۵)

بنام ایڈیٹر زمیندار

السلام علیکم:۔

آپ کے اخبار کی وساطت سے میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس موقع پر مجھ سے اظہارِ ہمدردی کیا ہے۔ مرحومہ کے علاج میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کیا گیا مگر تقدیر الٰہی کے سامنے سوائے تسلیم کے اور کیا چارہ ہے۔(۶) کافر نتوانی شہ ناچار مسلماں مشمو

مخلص محمد اقبال

خط نمبر ۵

پس منظر:۔

دسمبر ۱۹۲۶ء میں جب پنجاب کونسل میں علامہ اقبال کی کامیابی کا اعلان ہوا تو مختلف لوگوں نے مبارک باد کے خطوط اور تار بھیجے۔ ان کے جواب آپ نے درج ذیل خط کے ذریعے ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے انہیں مبارک باد دی تھی۔

بنام ایڈیٹر زمیندار

"جن بے شمار احباب نے پنجاب کونسل کی ممبری میں میری کامیابی پر مبارکباد کے تار اور خطوط ارسال فرمائے ہیں ان کا فرداً فرداً جواب دنیا میرے لیے بے انتہا مشکل ہے اس لیے زمیندار کی وساطت سے ان سب کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ (۷)

محمد اقبال۔ لاہور

خط نمبر ۶

پس منظر:۔

اقبال کا یہ خط زمیندار میں بعنوان "قبائل سرحد پر بم باری کے خلاف احتجاجی جلسہ کا التو۔ اعلامہ سر اقبال کا اعلان" لاہور ۱۰ اگست۔ علامہ سر محمد اقبال کی طرف سے مدیر زمیندار کو ذیل کا مکتوب موصول ہوا ہے۔

لاہور۔

۱۰ اگست ۱۹۳۳ء

مکرمی مولانا صاحب

السلام علیکم:۔

مندرجہ ذیل اعلان "زمیندار" میں شائع فرما کر ممنون فرمائیں

"میں عام مسلمانوں کی اطلاع کے لیے اس بات کا اعلان مناسب سمجھتا ہوں کہ وہ جلسۂ عام جو آج شام (۱۰ اگست ۳۳) کو بیرون دہلی دروازہ میری صدارت میں ہونے والا تھا بعض ایسے مصالح کی بنا پر جو مسلمانانِ ہند کے مفادِ خصوصی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں فی الحال ملتوی کیا جاتا ہے۔ مجھے یقینِ واثق ہے مولانا ظفر علی خان صاحب اور دیگر احباب کو بھی جن کی ان مصالحِ عالیہ پر نظر ہے اس فیصلے سے اتفاق ہوگا" (۸)

محمد اقبال

حواشی:۔

(۱) شائع شدہ رسالہ اردو اپریل ۱۹۶۷ء صفحہ ۹۲ تا ۹۴

(۲) شائع شدہ زمیندار ۱۱ دسمبر ۱۹۱۴ء

(۳) شائع شدہ ایضاً یکم جون ۱۹۲۰ء

(۴) بحوالہ مکتوباتِ اقبال بنام نذیر نیازی صفحہ ۲۲۸ تا ۲۲۹

(۵) مفکرِ پاکستان حنیف شاہد صفحہ نمبر ۴۸۶

(۶) یہ خط ۵ نومبر ۱۹۲۴ء کو لکھا گیا اور زمیندار میں ۶ نومبر ۱۹۲۴ء کو شائع ہوا۔

(۷) زمیندار ۱۰ اگست ۱۹۳۳ء

خطوطِ اقبال بنام قائداعظم

(نیا اضافہ)

قائداعظم کے نام علامہ کے کل ۱۹ خطوط میں ایک خط وہ ہے جو علامہ کی ہدایت پر غلام رسول خان نے ۴ نومبر ۱۹۳۷ء کو لکھا۔ چونکہ علامہ کو موتیا کا مرض لاحق تھا لہذا اُسے زمانے میں ان کی بیشتر خط کتابت غلام رسول خان، م۔ ش یا ڈورس احمد کے ذریعے ہوتی تھی۔ اقبال کا یہ خط تمام کتابوں میں اب تک نامکمل شائع ہو رہا ہے۔ قائداعظم کے ذاتی کاغذات کی مدد سے پہلی بار اس خط کا مکمل متن مع ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لیے یہ خط یقیناً ایک عمدہ اضافہ تصور کیا جائے گا۔ خط کی اہمیت کی پیش نظر اس کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا جا رہا ہے

No. 2495 M. L.
Punjab Provincial Muslim League
12 Temple Road, Lahore
Dated: - 4th November 1937

Dear Mr. Jinnah,

With reference to your letter dated 1st November 1937, addressed to Dr. Sir Muhammad Iqbal, I am directed by him to reply as follows:

The agreement reached between Sir Sikandar and yourself at Lucknow has formed the subject matter of keen controversy in this Province. As soon as Sir Sikandar returned to the Punjab he issued a statement to the effect that so far as the Punjab was concerned there was no change in the position except " that Muslims members of the Unionist party, who are not members of the Muslim League, would be advised to join the League, if they so desired." It was further stated that in " future Bye –elections the Muslim members who would contest the election on the League ticket would have to give an undertaking that they would join the Unionist party on being elected, and they would naturally have the support of the Unionist party." Other members of Sir Sikandar's

party also issued statement to the effect that the Punjab Provincial Muslim League would under the Jinnah-Sikandar agreement , pass under the control of the Unionist party.

Sir Chhotue Ram in a signed statement issued to the press stated "that the Punjab Parliamentary Board will pass under the control of the Unionist party" and that the result would be that the League in the Province would have no independent existence except as a subordinate body of the Unionist party. Theses statements of the members of the Unionist party created a great sensation amongst the Musalmans of the Province who were astounded that an agreement should have been reached under which the league instead of being the dominant party should take up the roll of a subordinate body to the existing Unionist party which in popular esteem is a group of down right reactionaries. Under the circumstances, I, as Secretary of the Punjab Provincial Muslim League and with the concurrence of Dr. Sir Mohammad Iqbal issued a statement in which the misunderstandings created regarding the position of the Punjab Provincial Muslim League were sought to be dispelled.

I merely reproduced the salient features of the agreement and repeated that the Muslim League party so formed would be subject to the rules and regulations of the all India Muslim League and the Muslim League Central and Provincial Parliamentary Boards. Malik Barkat Ali, M.L. A. also issued another statement in which he reproduced the terms of the agreement and made it clear that it would be the Muslim League party within the Legislature which sall maintain or enter into alliances or coalitions with other groups consistently with the fundamental principles of the policy and programme of the All India Muslim League. In enclose herewith the copies of these statements. These statements had a very reassuring effect on the Muslim masses, but the prominent members of the Unionist party were displeased with these statement. I also enclose herewith the comments of the "Tribune" on these statements.

2. On 22nd of October, 1937, I under orders of Dr. Sir Mohammad Iqbal sent 90 application forms to Sir Sikandr with the request that he may get them signed

by the Muslim members of the Unionist party in the Legislature. This opportunity was taken as all the said members were in Lahore in connection with the Viceregal visit. Not a single form has yet been got signed and sent to us. in fact I myself asked some Muslim members of the Legislature to sign these forms. Some of them gladly did, but word was sent round by Sir Sikandar that they should not sing the forms. This is the present position. Sir Sikandar and some of his friends are creating the impression that the Muslim League has come under the control of the existing Unionist party and that the result of the Jinnah –Sikandar agreement is that the only Muslim League members in the Legislature will join the Ministerial party without any Muslim League block coming into existence in the assembly. Such an impression is deemed fatal to the \reputation of the All India Muslim League and if permitted to continue, will completely alienate the sympathies of the Muslim public in the Province. I may state that if our statements had not been issued, the credit of All India Muslim League would have suffered a terrible decline in this Province.

3. You will be glad to know that a deputation of the Punjab Provincial Muslim League consisting of K. B. Malik Zaman Mehdi Khan, Malik Barkat Ali, myself and several others has been touring the Province and addressing very huge gatherings in various towns. The enthusiasm displayed by the Muslims public on these occasions in support of the All India Muslim League and the Punjab Provincial Muslim League and the Punjab Provincial Muslim League was simply wonderful. As a result of this effort on our part already 34 braches have been opened and more are opening. The coming month is of "Ramzan Sharif" and we may have to postpone our tours during that month. On the occasion of these tours not a single members of Sir Sikandar's party accompanied us.

4. Mr. Maqbul Mahmud did not supply Malik Barkat Ali with a copy of the Jinnah- Sikandar agreement. Hence a telegram was sent to you. In the meantime Dr. Sir Mohammad Iqbal sent word toSir Sikandar that he might supply him with a copy of the said agreement. The said copy has been

supplied. I can not say whether the copy so supplied is correct because I understand from Mr. Maqbul Mahmud that after the terms had been agreed upon on the 14th October, 1937 at 11p.m in your room, Sir Sikandar suggested further changes and ultimately an agreement in the form supplied to Dr. Sir Mohammad Iqbal was reached. As we have to knowledge of these suggested changes it is requested that a copy of the agreement in your possession may be sent us. Mir Maqbul Mahmud told Malik Barkat Ali when the latter asked for a copy from him that the copy had been sent to you.

5. I am desired to draw you attention to the fact that out of II seats in the Central Parliamentary Board, 7 have been allotted by you to the members of Sir Sikandars party namely those of Malik barkat Ali and Pir Taj-ud-Din. Mr. Hussain Malik is not a member of the Punjab Provincial Muslim League and his Headquarters are at Delhi. With Maulana Zaffar Ali Khan we only come to three as against seven of Sir Sikandar's party. K. B. Malik Zaman Mehdi Khan, Deputy President of the Punjab Provincial Muslim League and myself secretary of the Muslim League do not figure in this list. This has considerably upset feelings here and I am to say that these names should appear in this list members of the Central Muslim League Parliamentary Boad without delay. It is being stated here that you agreed with Sir Sikandar to give a majority to his party in the Punjab Provincial Muslim league Parliamentary Board and in proof there of the 7 appointments of their party on the Central All India Muslim League Parliamentary Board are being cited. The agreement merely states that the Punjab Provincial Muslim League Parliamentary Board shall be reconstituted. There is not a word in the agreement to the effect that Sir Sikandar's Unionist party shall have a majority in the Punjab Provincial Muslim League Parliamentary Board. The word "reconstituted" was used merely to provide representation for Sir Sikandar's party on the Provincial Parliamentary Board. I may inform you that a Provincial Muslim League Parliamentary Board already exists. Kindly let us know whether you agreed with Sir Sikandar that his party shall have majority in the Punjab Provincial Muslim League Parliamentary Board. We were not consulted in regard to this alleged promise of yours, but I may be

permitted to say that such a promise, if made, will considerably alienate public support from the cause of the All India Muslim League.

6. Now as to the matters on which you have sought suggestions from Dr. Sir Mohammad Iqbal: -

   a) In regard to the invitation extended by Sir Sikandar to the All India Muslim League to hold its special sessions at Lahore in February, 1983, we welcome the invitation but we are not in a position to make any suggestions, until a clear and unambiguous settlement is reached to the effect that the Muslim members of Sir Sikandar's party will with out any further delay sign the league pledge and form and declare themselves as the league pledge and form and declare themselves as the Muslim League party within the Provincial Assembly. If we judge the situation aright, there is an effort being made to resile from this position.

   b) As regard the Organising Committee, already the Provincial Lague exists and we are forming District, Tehsil and village branches. There is no need here for any organising Committee. But if under the resolution of the All India Muslim League passed at Lucknow, an Organizing Committee has to be appointed and announced by you, the followings names are suggested.

1. Dr. Sir Mohammad Iqbal **(M. A, Ph. D, Bar-at-Law)**
2. K. B. Maik Zaman Mehdi Khan **(Retd. Dy. Commissioner)**
3. Malik Barkat Ali, **(M.A, Advocate, M.L.A)**
4. Mr. Ghulam Ra\sul, **(Bar-at-Law, Sec. P.P.M. League)**
5. Dr. Khalifa Shuja-ud-Din, **(Bar-at-Law, Lahore)**
6. Mr. M.A. Mjaid, **(Bar-at-Law, Lahore)**
7. Mian Bahsir Ahmed, **(Bar-at-Law, Lahore)**
8. Mian Nurullah, **(Bar-at-law, M.L.A, Lyallpur)**
9. Nawab Shah Nawaz Khan of Mamdt, **(M.L.A. Lahore)**
10. Maulana Zaffar Ali Khan **(M.L.A.)**
11. Naulvi Mohammad Ishaq Mansehrvi, **(Rawalpindi)**
12. Malik Nur Elahi **(Proprietor the Daily Ehsan, Lahore)**
13. Pir Taj-ud-Din **(Bar-at-Law, Lahore)**
14. Sh. Sadiq Hassan, (Bar-at-Law, President Muslim League,

Amritsar)

15. Qazi Zahur-ul-Haq, (B.A, President **(Muslim League, Rewari)**
16. Sh. Sultan Mohd. Rais-I-Azam (President Muslim League, Hoshiparpur)
17. Agha Ghulam Haider Khan, Rais **(President Muslim League, Sialkot)**
18. Khan Rab Nawaz khan (Pleader, President Muslim League, Fazilka.)
19. Sh, Mohd. Sharif, (Advocate, **President Muslim League, Jullunder**
20. Kh. Ghulam –us-Sabtian, (B.A. , **President Muslim league, Panipat,)**
21. K.S. Mushtaq Ali Khan, **(President Muslim League , Rohtak.)**
22. Mr. Mohd. Abduallah khan **(President Muslim League, Karnal.)**
23. Mian Mohd. Abduallah, **(Advocate, President Muslim League, Ludhiana)**
24. Mr. Jalalud-Din Qureshi, Bar-at-Law, **President Muslim League, Hissar.)**
25. Pirzada Mohd. Zakaullah, **(President Muslim League, Simla.)**

C. As regards the working committee I would suggest five seats for the Punjab. Dr. Sir Mohammad Iqbal requests that he is not in a position on account of his ill health to attend the meetings of the Working Committee, the name of K.B. Mali Zaman Mehdi Khan Deputy President of the League may be substituted for him. Malik Barkat Ali should be kept on but the name of Mr. Ghulam Rasul, Bar-at-Law, should be added. As regards Sir Sikandar and Mr. Ahmedyar Khan Daultana much will depend on their decision to sign the League ticket and constitute and declare without further delay the Muslim league party with in the Legislature. In the event of their agreement to this course care should be taken that their representation shall in no case exceed the representation given to Muslim League party.

It is requested that the enclosures to this letter may after perusal be returned as they are the only record in the office of the Punjab Provincial Muslim League.

Yours sincerely,

(Ghulam Rasul)
Honorary Secretary
Punjab Provincial Muslim League
12 Temple Road, Lahore.

خطوط اقبال بنام قائد اعظم

قائداعظم کے نام علامہ کے کل ۱۹ خطوط میں ایک خط وہ ہے جو علامہ کی ہدایت پر غلام رسول خان نے ۴ نومبر ۱۹۳۷ء کو لکھا۔ چونکہ علامہ کو موتیا کا مرض لاحق تھا لہذا اُس زمانے میں ان کی بیشتر خط کتابت غلام رسول خان، م۔ش یا ڈورس احمد کے ذریعے ہوتی تھی۔ اقبال کا یہ خط تمام کتابوں میں اب تک نامکمل شائع ہوتا رہا ہے۔ قائداعظم کے ذاتی کاغذات کی مدد سے پہلی بار اس خط کا مکمل متن مع ترجمہ شائع کیا جارہا ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لیے یہ خط یقیناً ایک عمدہ اضافہ تصور کیا جائے گا۔ خط کی اہمیت کی پیش نظر اس کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا جارہا ہے۔

نیا اضافہ

خط کا اردو ترجمہ

ڈیر مسٹر جناح!

آپ نے یکم نومبر ۱۹۳۷ء کو علامہ سر محمدؒ اقبال کو جو خط بھیجا تھا اس کے پیشِ نظر انہوں نے مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ آپ کو اطلاع دیدوں کہ

1۔ لکھنو میں آپ اور سکندر کے درمیان جو معاہدہ ہوا وہ صوبہ بھر میں شدید اختلافات کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ سر سکندر نے پنجاب واپس آتے ہی ایک بیان شائع کر دیا تھا کہ

"جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے سابقہ صورت حالات ہنوز قائم و بحال ہے۔ البتہ اس میں صرف یہ ترمیم کر دی گئی ہے۔ کہ اتحاد پارٹی کے ان مسلم ارکان کو جو مسلم لیگ کے ممبر ہیں مشورہ دیا جائے گا کہ اگر وہ پسند کریں تو لیگ میں شامل ہو جائیں۔ اسکے علاوہ یہ شرط بھی لگا دی گئی کہ آئندہ ضمنی انتخابات میں جو مسلم ارکان لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں انہیں یہ عہد کرنا ہوگا کہ کامیابی پر یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو جائیں گے۔ اِس کے عوض جنگ انتخابات میں انہیں یونینسٹ پارٹی کی امداد حاصل ہوگی"

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی کوئی آزادانہ حیثیت باقی نہ رہے گی اور وہ یونینسٹ پارٹی کا ایک ماتحت ادارہ بن کر رہ جائیگی۔

یونینسٹ پارٹی کے ارکان کی ان تصریحات سے مسلمانانِ پنجاب میں زبردست ہیجان و اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ سخت متحیر ہیں کہ ایسا معاہدہ کس طرح کیا گیا ہے جس کے ماتحت لیگ کی مستقل حیثیت کالعدم ہو گئی ہے اور وہ اتحاد پارٹی کی ایک ماتحت جماعت بنا دی گئی ہے۔ حالانکہ عوام کی نگاہوں میں اتحاد پارٹی بدترین رجعت پسندوں کا ایک گروہ ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر میں نے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے سیکرٹری کی حیثیت سے اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کے مشورہ سے ایک بیان شائع کیا جس کا مقصد پنجاب مسلم لیگ کے متعلق جدید غلط فہمیوں کو دور کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے محض جناح سکندر

معاہدہ کی اہم شقوں کونقل کر دیا اور یہ دہرایا کہ اس معاہدہ کی رو سے جو مسلم لیگ پارٹی معرض وجود میں آئیگی وہ آل انڈیا مسلم لیگ۔ مسلم لیگ سنٹرل پالیمنٹری بورڈ اور مسلم لیگ پراونشل پارلیمنٹری بورڈ کے قواعد وضوابط کے ماتحت ہوگی۔ اسی ضمن میں ملک برکت علی صاحب ایم۔ ایل۔ اے نے بھی ایک بیان شائع کیا ہے جس میں انہوں نے معاہدہ کی شرائط کو نقل کر کے واضح کر دیا ہے کہ مجلس آئین ساز کے اندر صرف مسلم لیگ پارٹی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بنیادی اصول اور لائحہ عمل کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی دوسرے گروہ سے کوئی معاہدہ یا اتحاد کرے یا کسی معاہدہ اتحاد کو قائم رکھے ۔ان ہر دو بیانات کی نقول ارسال خدمت ہیں۔ مسلم عوام پر ان بیانات کا خوشگوار اثر ہوا ہے۔ لیکن یونینسٹ پارٹی کے مقتدر ارکان اُن بیانات کی اشاعت سے برہم ہو گئے ہیں۔ ٹریبیون نے ان بیانات پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بھی ارسال خدمت ہے۔

2۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر سر محمد اقبال کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میں نے سر سکندر کی خدمت میں رکنیت کے ۹۰ فارم بھیجے اور یہ درخواست کی کہ اسمبلی کے مسلمان یونینسٹ ممبروں سے ان پر دستخط کرالیں کیونکہ ان ایام میں وائسرائے کی آمد کے سلسلہ میں تمام ارکان لاہور میں موجود تھے مگر اس وقت تک ایک بھی فارم پر دستخط نہیں ہوئے۔ اور نہ ہی کوئی فارم ہمیں واپس کیا گیا ہے سچ پوچھئے تو خود میں نے اسمبلی کے بعض مسلم ارکان سے ان درخواستوں پر دستخط کرنے کو کہا ان میں سے بعض نے بڑی مسرت سے میری درخواست کو شرفِ قبول بھی بخشا۔ لیکن سر سکندر نے اسمبلی کے ارکان کو پیغام بھیج دیا کہ ان درخواستوں پر دستخط نہ کریں۔ یہ ہے ہماری موجودہ پوزیشن!

سر سکندر اور ان کے بعض دوست یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مسلم لیگ موجودہ اتحاد پارٹی کے قبضۂ اقتدار میں آگئی ہے۔ اور جناح سکندر پیکٹ کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ پنجاب اسمبلی میں لیگ کا واحد نمائندہ مسلم لیگ بلاک کے وجود میں آنے کے بغیر ہی وزراتی پارٹی میں شامل ہو جائے گا۔

لہذا یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جناح سکندر معاہدہ سے آل انڈیا مسلم لیگ کی شہرت کو سخت نقصان پہنچے گا۔ اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو لیگ سے مسلمانانِ صوبہ کی تمام ہمدردیاں جاتی رہیں گی۔ میں یہ بھی واضح کردوں کہ اگر ہم یہ بیانات شائع نہ کرتے تو آل انڈیا مسلم لیگ کے وقار کو سخت ٹھوکر لگتی۔

3۔ آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ پنجاب پراونشل لیگ کا ایک وفد (جس میں خان بہادر ملک زمان مہدی خان صاحب، ملک برکت علی صاحب، راقم الحروف اور بعض دیگر اراکین شامل ہیں) پنجاب کا دورہ کر کے مختلف مقامات پر بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کر رہا ہے۔ ان مقامات پر مسلم عوام نے آل انڈیا مسلم لیگ اور پنجاب پراونشل لیگ سے

جس خلوص اور عقیدت کا مظاہرہ کیا ہے وہ واقعی حیرت انگیز ہے۔ ہماری کوششوں سے اس وقت تک ۳۴ شاخیں قائم ہو چکی ہیں اور مزید قائم ہو رہی ہیں۔ مگر چونکہ رمضان المبارک قریب ہے اس لیے ہم اپنا دورہ ملتوی کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ واضح کر دینا بھی مناسب ہے کہ سر سکندر کی پارٹی کے ایک رکن نے بھی ہمارا ساتھ نہیں دیا۔

4۔ مسٹر مقبول محمود نے ملک برکت علی صاحب کو جناح سکندر پیکٹ کی نقل مہیا نہیں کی تھی اسلیے اس کے متعلق آپ کو تار دیا گیا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب نے بھی سر سکندر حیات کو پیغام بھیجا تھا کہ مذکورہ معاہدہ کی ایک نقل بھیج دیں۔ سر سکندر نے نقل بھیج دی ہے مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ نقل اصل کے مطابق ہے۔ کیونکہ مسٹر مقبول محمود نے مجھے بتایا ہے کہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو رات کے گیارہ بجے (جبکہ معاہدہ کی تمام شرائط آپ کے کمرے میں طے ہو چکی تھیں۔) سر سکندر نے بعض ترمیمات پیش کیں اور بالآخر وہ معاہدہ مرتب ہوا جس کی نقل سر محمد اقبال کو بہم پہنچائی گئی ہے۔ چونکہ ہمیں ان ترامیم کا کوئی علم نہیں اس لیے میری درخواست ہے کہ آپ اس معاہدہ کی ایک نقل جو آپ کے پاس ہو بھیج دیں۔ کیونکہ جب ملک برکت علی صاحب نے میر مقبول محمود صاحب سے یہ نقل مانگی تھی تو انہوں نے یہ کہا تھا کہ مطلوبہ نقل آپ کو بھیج دی گئی ہے۔

5۔ میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف بھی دلانا چاہتا ہوں کہ مرکزی پارلیمانی بورڈ میں ۱۱ سیٹوں میں سے سات نشستیں آپ نے سر سکندر کی جماعت کے ممبروں کے لیے مخصوص کی ہیں۔ ان میں ملک برکت علی، پیر تاج الدین اور حسین ملک مسلم لیگ پنجاب کے ممبر نہیں ہیں اور ان کا ہیڈ کوارٹر دہلی ہے۔ سر سکندر حیات کی جماعت کی سات نشستوں کے مقابلے ہمارے پاس مولانا ظفر علی خان سمیت صرف تین سیٹیں رہ جاتی ہیں۔ خان بہادر ملک زمان مہدی ڈپٹی پریذیڈنٹ پنجاب مسلم لیگ اور میں بحیثیت سیکرٹری مسلم لیگ۔ اس لسٹ میں شامل نہیں ہیں۔ اس سے ہمارے جذبات مجروح ہونے کا اندیشہ ہے۔ یہ نام مرکزی پارلیمانی بورڈ کے ممبروں کی فہرست میں بھی کسی تاخیر کے بغیر شامل ہونے چاہیں۔

یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ آپ نے سر سکندر حیات کو مسلم لیگ پنجاب کے پارلیمانی بورڈ میں اکثریت دلانے پر اتفاق کیا ہے اور اس غرض کے لیے اُن کی پارٹی کے سات ممبر مرکزی بورڈ میں شامل کیئے ہیں۔ معاہدے میں صرف یہ لکھا ہے کہ مسلم لیگ پنجاب کے بورڈ کی تشکیل نو کی جائے گی اس میں یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ سر سکندر حیات کی یونینسٹ پارٹی کو اس میں اکثریت حاصل ہوگی" تشکیل نو" کا لفظ بھی محض سر سکندر کی پارٹی کا پنجاب مسلم لیگ میں نمائندگی دلانے کے لیے شامل کیا گیا ہے۔ میں آپ کو یہ مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ پنجاب کا پارلیمانی بورڈ پہلے سے موجود ہے۔ ازراہِ کرم ہمیں یہ بتائیے کہ کیا آپ نے واقعی سر سکندر حیات کے ساتھ اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ ان کو صوبائی پارلیمانی بورڈ میں اکثریت

دلائی جائے گی۔ اس نام نہاد معاہدے کے بارے میں ہم سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اس طرح کا وعدہ پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ کی تائید اور مقبولیت میں کمی کا باعث ہوگا۔

6۔ اب میں ان امور کی طرف آتا ہوں جن کے متعلق آپ نے ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مشورہ طلب کیا ہے:۔

ا۔ فروری ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی لاہور میں منعقد کرنے کے متعلق جہاں تک سر سکندر کی دعوت کا تعلق ہے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن اس وقت تک کوئی تجویز پیش کرنے کے قابل نہیں ہیں جب تک کہ اس قسم کا واضح اور غیر مبہم سمجھوتہ نہ ہوجائے کہ سر سکندر کی پارٹی کے مسلم ارکان کسی مزید تاخیر کے بغیر مسلم لیگ کے حلف نامہ اور قرطاسِ رکنیت پر دستخط کردیں اور اعلان کردیں کہ اسمبلی کے اندر بھی ان کی پارٹی مسلم لیگ پارٹی کہلائیگی جہاں تک صورت حالات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ سر سکندر حیات خان صاحب کی طرف سے یہ کوشش کی جارہی ہے۔ کہ وہ اس پوزیشن کو قبول کرنے سے بچ جائیں۔

ب۔ جہاں تک آرگنائزنگ کمیٹی کی تشکیل کا سوال ہے ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ پراونشل مسلم لیگ موجود ہے۔ اور ہم ہر ضلع ہر تحصیل اور اکثر دیہات میں مقامی شاخیں قائم کررہے ہیں۔ اس لئے پنجاب میں کسی آرگنائزنگ کمیٹی کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر اس قرارداد کی رو سے جو آل انڈیا مسلم لیگ نے لکھنو میں منظور کی تھی ایک آرگنائزنگ کمیٹی کا قیام اور آپ کی طرف سے اس کا اعلان ضروری ہو تو ہم ذیل کے حضرات کے نام تجویز کرتے ہیں۔

ا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب

۲۔ خان بہادر ملک زمان مہدی خان صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر

۳۔ ملک برکت علی صاحب ایم۔ایل۔اے

۴۔ مسٹر غلام رسول خان بیرسٹرایٹ لا۔ سیکرٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ

۵۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ لاہور

۶۔ مسٹر ایم۔اے۔ مجید بیرسٹرایٹ لا

۷۔ میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹرایٹ لاء

۸۔ میاں نوراللہ صاحب ایم۔ایل۔اے (لائیلپور)

۹۔ نواب شاہنواز صاحب آف ممدوٹ ایم۔ایل۔اے (مرکزی)

۱۰۔ مولانا ظفر علی خان صاحب ایم۔ایل۔اے (مرکزی)

۱۱۔ مولانا محمد اسحاق صاحب مانسہروی۔ راولپنڈی

۱۲۔ ملک نور الٰہی صاحب۔ مالک اخبار احسان۔ لاہور

۱۳۔ پیر تاج الدین صاحب بیرسٹرایٹ لاء

۱۴۔ شیخ صادق حسن صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ امرتسر

۱۵۔ قاضی ظہور الحق صاحب بی۔ اے (ریواڑی)

۱۶۔ شیخ سلطان محمد صاحب رئیس اعظم۔ ہوشیار پور

۱۷۔ آغا م غلام حیدر خان صاحب رئیس (سیالکوٹ)

۱۸۔ خان رب نواز خان صاحب پلیڈر۔ فاضلکا

۱۹۔ شیخ محمد شریف صاحب ایڈووکیٹ۔ جالندھر

۲۰۔ خواجہ غلام السطین صاحب بی۔ اے۔ پانی پت

۲۱۔ خاں صاحب مشتاق علی خان صاحب۔ رہتک

۲۲۔ مسٹر محمد عبداللہ خان صاحب۔ کرنال

۲۳۔ میاں محمد عبداللہ خان صاحب ایڈووکیٹ۔ لدھیانہ

۲۴۔ مسٹر جلال الدین قریشی۔ بیرسٹرایٹ لا۔ حصار

۲۵۔ پیرزادہ محمد ذکا اللہ صاحب۔ شملہ

ج۔ جہاں تک کہ مجلس عاملہ کا تعلق ہے میری یہ تجویز ہے کہ پنجاب کو پانچ نشستیں دی جائیں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کی درخواست ہے۔ کہ میں خرابیِ صحت کی بنا پر اس قابل نہیں ہوں کہ مجلسِ عاملہ کے جلسوں میں شریک ہوسکوں۔ میری جگہ خان بہادر ملک زمان مہدی خان صاحب ڈپٹی پریذیڈنٹ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو لے لیا جائے۔ ملک برکت علی صاحب ورکنگ کمیٹی میں بدستور شامل رہیں۔ اور مسٹر غلام رسول بیرسٹرایٹ لا کا نام بھی شامل کر دیا جائے۔ جہاں تک سر سکندر اور مسٹر احمد یار خان کا تعلق ہے۔ اس مسئلہ کے حل کا انحصار بیشتر ان کے اس فیصلہ پر ہے کہ وہ لیگ ٹکٹ پر دستخط کر دیں اور کسی مزید تاخیر کے بغیر اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیں۔

اگر وہ اس معاہدہ پر عمل کریں تو یہ خیال رکھا جائے کہ ان کی نیابت کسی صورت میں بھی موجودہ مسلم لیگ پارٹی کی نیابت سے تجاوز نہ کرنے پائے۔

والسلام

آپ کا مخلص

غلام رسول

آنریری سیکرٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ

۱۲ ٹمپل روڈ۔ لاہور

اقبال انٹرنیشنل کانفرنس دہلی (منعقدہ ۱۰ تا ۱۲ جون ۱۹۹۷ء) میں ڈاکٹر خلیق انجم اور ایک دو اور صاحبان نے اس امر پر شکوک وشبہات کا اظہار کیا کہ قائداعظم کے نام شائع ہونے والے علامہ اقبال کے خطوط جعلی ہیں۔ علامہ کے یہ ۱۳ خطوط قائداعظم کے دیباچے کے ساتھ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئے تھے۔ تاہم طویل عرصہ کی کوشش کے باوجود ان کے عکس دستیاب نہ ہوسکے اور یوں مخالفین کو شکوک وشبہات پھیلانے کا موقع ملا۔ ان خطوط میں ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کو تین اور ڈاکٹر جہانگیر عالم کو دو نئے خطوط کے اضافے کا موقع ملا۔ ایک خط راقم الحروف نے دریافت کیا۔ یوں قائداعظم کے نام اقبال کے خطوط کی تعداد ۱۹ ہوجاتی ہے۔ عاشق حسین بٹالوی نے جن خطوط کا اضافہ کیا ہے وہ علامہ کی ہدایت پر ان کے سیکریٹری غلام رسول خان نے لکھے تھے۔ جو خط میں نے دریافت کیا تھا اس پر اقبال کا نام تو موجود تھا لیکن یہ علامہ کے سوادِ خط میں تحریر نہ تھا۔ حال ہی میں ہمارے دوست ڈاکٹر ندیم شفیق ملک نے خطوط اقبال بنام قائد کے تیرہ خطوط میں سے ایک خط کا عکس تلاش کرلیا۔ اسی طرح نیشنل آرکائیوز اسلام آباد سے جہانگیر عالم صاحب نے جو دو خطوط تلاش کئے تھے ان میں سے ایک خط کا عکس شائع کیا جاتا ہے۔

ان خطوط کے عکس کی اشاعت سے یقیناً ان لوگوں کی زبانیں بند ہوسکیں گی جو تحریک پاکستان اور اس کے قائدین کو بدنام کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔

(ص۔ک)

Phone No. 2934.

Punjab Provincial Muslim League

PARLIAMENTARY BOARD.

Delhi House Building,
EDWARDS ROAD,

Lahore 8.12. 1936

Dear Mr. M.A.Jinnah,

Mr. Ghulam Rasul tells me that he has written a detailed letter to you about the Board's affairs. I certainly agree with him when he says that your presence in this province is absolutely essential atleast a fortnight before the polling days. You know the people of this province thoroughly well and also that they are the most undependable lot. They are generally carried away by the excitement of the moment and if you, Shaukat Ali and M.Kafaitullah address them just on the eve of the election day I am sure they will all support you and your candidates, otherwise they might do any thing. I, therefore, request you to visit us about the end of December, 1936 and beginning of January 1937 so that a last effort may be made to break the forces of reaction. In case you are unable to come I am afraid you will not have more than four of your followers in the coming Assembly. With kind regards

Yours sincerely
Muhammad Iqbal
Bar-at-Law
President, Punjab Provl. Muslim League
Parliamentary Board.

M.A.Jinnah, Esquire
Bar-at-Law,
Bombay.

Punjab Provincial Muslim League

PARLIAMENTARY BOARD.

206

Mayo Road.
~~Delhi House Building,~~
~~EDWARDS ROAD.~~

Ref. No.

Lahore 13th August 1937

My dear Jinnah,

As I wrote to you yesterday enthusiasm for the League is rapidly increasing in the Punjab. You will be glad to hear that without any initiative on the part of the Punjab Provincial Muslim League about 20 branches of the League have already been established in different towns of the Punjab. I am convinced that if some of the Office bearers of the Punjab Provincial Muslim League are able to make a tour of the Province they will be able not only to raise money but also to open the eyes of the general Muslim public in the Punjab to the situation which has fortunately developed itself on account of the Congress attitude towards the Muslims. Unfortunately, however, the Provincial League is very much handicapped by lack of funds for initial expenses of such a tour. Could you make us a contribution of atleast Rs 1500/- from the Central funds. I have every hope that our men will be able to raise sufficient money which will enable us to return the amount borrowed from you. We should be much obliged if you could do so at your earliest convenience.

Yours Sincerely

Muhammad Iqbal

(ب) غیر مدون غیر مطبوعہ کلام (اُردو و فارسی)

شمشیر برطانیہ

بتقریب فتح پارڈے برگ

غیر مطبوعہ

اے دم شمشیر انگلستان تجھے صد مرحبا — ہیں ترے خم میں نہاں صد حلقہ دامِ فنا
تیرا جوہر " اَنالنیّر " کی دیتا ہے صدا — زیب دیتا ہے اگر کہیے تجھے کشور کشا

اے تفِ قہر الٰہی ! موت کا ایماں ہے تو
جوشِ سودائے عدو کے واسطے درماں ہے تو

تیری تیزی کی ہے ملّا حانِ اندلس کو خبر — لے گئی دشتِ اجل میں جن کو تو بن کر خضر
جب پڑی بونا پہ تیری چشم جوسر کی نظر — چبھ گئی دل میں تڑپ کر مثلِ نوکِ نیشتر

تجھ کو گر ماننے سے پہلے کچھ کرو گر پوچھتا
سبزۂ میدان واٹر لو سے جا کر پوچھتا

صورتِ خورشید خاور آتشِ سوزاں ہے تو — برق صورت اوجِ استقلال پر خنداں ہے تو
یوں نکلتی ہے کہ گویا موت کا ارماں ہے تو — قطرۂ خونِ عداوت سے بہر افشاں ہے تو

دیدۂ ہمت میں تو مثلِ مۂ امید ہے
ہر چمک تیری دلیلِ آمد صد عید ہے

کہہ رہا ہے خاک افریقہ کا ہر ذرہ یہی — فتح اَیسی دیدۂ خورشید نے دیکھی نہ تھی
خرمنِ دشمن پہ تو بجلی کی صورت جا پڑی — مرغِ جاں کو مرغِ بسمل کی طرح تڑپا گئی

دیدۂ عالم پہ جوہر آشکارا ہے ترا
گرمئی شورِ قیامت اک شرارا ہے ترا

موجِ اعدا کی ہوا ہو کر پریشاں ہوگئی
صبر کی صورت یہ جمعیت گریزاں ہوگئی
فتح یہ تیری ہلال آسا درخشاں ہوگئی
شام بھی اپنی مثالِ صبح خنداں ہوگئی

خرمنِ آرام اعدا کو جلا کر چھوڑنا
اس مہٗ نو کو مہٗ کامل بنا کر چھوڑنا

شاہد مقصد کے جوبن پر ابھار آنے کو ہے
شیشہٗ جانِ رقیباں پر غبار آنے کو ہے
از پئے تسلیم ہر شہر و دیار آنے کو ہے
یہ ترشح ہے ابھی ابرِ بہار آنے کو ہے

خود بخود جنباں ہے لب اپنا مبارک باد پر
دل اچھلتا ہے خوشی سے غیر کی افتاد پر

فوجِ اعدا میں بپا ہنگامۂ محشر رہے
تیرا سر جو ہر شرابِ موت کا ساغر رہے
تیرا رتبہ تیغِ ماہ نو سے بالاتر رہے
بن کے زردی ڈرترا رخسارِ دشمن پر رہے

بن کے زردی ڈرترا رخسارِ دشمن پر رہے
بن کے زردی ڈرترا رخسارِ دشمن پر رہے

واسطے تیرے بنے ہر سنگِ راہ سنگِ فساں
خون ہر دشمن کا رشکِ موجۂ سیل رواں
روشناس آسماں ہو فتح و نصرت کے نشاں
دے ترنم کی صدا بلبلِ ہندوستاں

پہلوئے دشمن میں دل لذّت کشِ صد چاک ہو
نام انگلستاں کا بالا تراز افلاک ہو

اقبال کے غیر مطبوعہ فارسی اشعار

متروکاتِ رموزِ بے خودی

شیخ اکبر چوں فریبِ عقل خورد ۔۔۔ شرع را تدبیر اکوانی شمرد

گفت شانِ عالم از دیگر است ۔۔۔ از کمالاتِ نبوت برتراست

از تنزل داستانے ساختے ۔۔۔ نقدِ دیں را از گرہ انداختے

شکرِ او ایں عقدۂ مشکل کشاد ۔۔۔ ذاتِ حق از بام بے چونی فتاد

کوزہ گر گلِ شد کہ سازد کوزۂ ۔۔۔ بے نوائے گرمئ شش روزۂ

از تلاطم خیزی دریائے ذات ۔۔۔ ناخدا و کشتی و موجِ فرات

شیخ چوں ایں گونہ توحید آفرید ۔۔۔ تِلمسانی شرک در قرآن دید

ذات خوانی عالم ایجاد را ۔۔۔ عشق گوئی مذہبِ الحاد را

عاشقاں اندر نمازِ وحدت اند ۔۔۔ غافل از آوازۂ قدقامت اند

روزہ از خیر ہوا رُستن بُود ۔۔۔ لب ز حرفِ ماسوای بستن بود

حج طوافِ کعبہ دل کردن است ۔۔۔ خویش را از خویش غافل کردن است

جنگ با خود مقصد دین است وبس ۔۔۔ فی سبیل اللہ جہاد این است وبس

رقصِ مستی د زہ را صحرا کند ۔۔۔ وصلِ دریا قطرہ را دریا کند

است پا کوبی اگر تدبیر وصل ۔۔۔ می کند قوال اگر تقریرِ وصل

مرتضیٰ از حق تعالیٰ دور ماند | از خدا صدیقؓ ہم مہجور ماند
شیخ چوں این طور گفتار آزمود | از کلامش سُستی عنصر فزود
مقصدِ احکام از احکام رفت | عشق آزادی گرفت اسلام رفت
پنجہ اندر پنجۂ مولا ستے | از محمد عشق بے پرواستے
کافر عشق ازمسلمانی گریخت | رشتۂ مہرو وفا از او گیسخت
پیرِ ما سرمایہ ملت ربود | خواب را تعبیر او باطلِ نمود
آتش خود راخس و خاشاک کرد | این مہوّس کیمیا را خاک کرد

یہ اشعار کلیات اقبال فارسی کے صفحہ نمبر ۱۲۸ کے دوسرے بند سے پہلے تھے

ماخذ:۔۔۔۔۔۔بیاض رموزِ بے خودی صفحہ نمبر ۸۲ بعنوان۔ پیام سروش

۔۔۔متروکاتِ زبورِ عجم۔۔۔

ا...............غزل

غزلے تازہ تر اے مرغِ سحر خیز بگو | باگلاں باز حدیث طرف انگیز بگو
رمزد و ایما ہمہ خوب است ولیکن تاچند | بے محابانہ ازاں شوخِ کم آمیز بگو
تیشہ را بر جگرِ قیصروخاقاں زدہ ایم | خبرِ معرکہ باتربت پرویز بگو
چشمِ اقبال نشد خیرہ ز تہذیبِ فرنگ | عیبِ من جملہ بگفتی ہنرم نیز بگو
سخنے بود کہ مارا بہ ثریا انداخت | دگر آں حرفِ دل افروز و دلآ ویز بگو

۱

ماخذ:۔۔۔۔۔۔۔۔بیاض زبورعجم صفحہ نمبر ۵ زبورعجم کی غزل نمبر ۱۴ کے بعد یہ غزل تھی

ب....... متروکاتِ بندگی نامہ

خواجہ را از بندہ پیغامے بگو کا مگارے را زنا کامے بگو
آدمے کو صیدِ آدم می کند سنگِ خود بر شیشۂ خود می زند
مہلتش بخشد خدائے دیر گیر تابہ بندِ دیگر ے آید اسیر
تا جزاہا در عمل ہا مضمر است پیشِ من پایانِ کار کمتر است
پیکر او را زمیں گورے نداد جانِ خود را جز یم شورے نداد
اند کے اندیش اگر داری نظر انتقام خاکِ درویشے نگر
گندم از گندم بروید جو زجو
از مکاناتِ عمل غافل مشو

ماخذ:-------------------بیاض زبورِ عجم صفحہ نمبر ۲۵ یہ بندگی نامہ کا آخری بند تھا

ج------ متروکات گلشنِ رازِ جدید

اگر برچشم تو پیدا درون است سکوں سیراست و سیرِ ما سکون است
بچشمِ شور می بینی جہاں را زمانی می شماری ـ لازماں را
جبیں بر آستانِ حق بسودیم اسیر نزد و دور و دیرو زود یم
ابد اندر ضمیرِ زندگانی ست ضمیرِ زندگانی لازمانی ست
پنہائش کہ دارد ساز و ہم سوز ترا ود صورتِ شبنم شب و روز

ماخذ:-------------بیاض زبورعجم صفحہ نمبر ۳۱ ۔کے شعر ۹ سے پہلے یہ اشعار تھے

---جاوید نامہ کے متروکات---

مردِ آوارہ

عارف عہد کہن از خود برید او خدا را دید و عالم را ندید

چشم بر کشادن بندگی است
خویش را بے پردہ دیدن زندگی است

بندہ چوں از زندگی گیرد برات
ہم خدا آں بندہ را گوید صلوٰت

زندگی بے بندگی مارے بود
زندگی با بندگی یارے بود

بیاضِ جاویدنامہ صفحہ نمبر ۱۷---------------------------- فلک قمر

کارِ حکمت دیدن و نادیدن است
کارِ عرفاں
دیدن و وادیدن است

علم شمشیرے بدست ناکساں
نور عرفاں در نسازد با خسا ں

آں تلاشِ کائناتِ اصغر است
ایں سراپا کائناتِ اکبر است

عالماں را جلوہٗ یک عالم است
عارفاں را جلوہ ہائے پیہم است

نورِ حکمت جلوہٗ پا در رکاب
نورِ عرفاں جلوہ ہائے بے نقاب

چشم اگر پیہم بنبند کور بہ
عارفِ منزل گزیں بے نور بہ

بیاض جاویدنامہ----------------فلک مشتری

عالمے دشت و در او چاک چاک
ہر زماں در لرزہ ہائے ہولناک

حرف و صوت آنجا بجز فریاد نیست
آبش از خون است وموجِ باد نیست

مار ہا رُست از زمیں ہم چوسنگ
بے پرو پرندہ چوتیر و خدنگ

مارہا ہر لحظہ اندر پیچ و تاب
سنگ را پیہم گزید از اضطراب

مورِ او درمثلِ ماراں پافشرد
زرنکہ غیر از کلّہ ماراں نخورد

ساکنانش ننگِ دیں ننگِ وطن
صادقِ و جعفر دو طاغوت کہن

بیاض جاویدنامہ صفحہ نمبر ۵۲-------------فلک زحل

(ج) ''اقبال کی نایاب نثری تحریریں''

(۱)

کاسمو پالٹین فلم کمپنی کا دفتر ۲۳ مال روڈ لاہور پر قائم تھا جس کے اعزازی مشیروں میں عطیہ فیضی بھی شامل تھیں۔ علامہ نے اس کمپنی کی فلموں کے بارے میں مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا۔

''اگر ہندوستان میں اس قسم کی فلمیں تیار کی جاسکیں جو معصیت کاری اور فسق و فجور کی اشاعت کا کام نہ کریں بلکہ ان کا مقصد ملک کی صحیح خدمت کرنا، نوجوانوں میں حقیقی جذبات پیدا کرنے ہوں اور ان کا کوئی بلند معیار پیش کرنا ہو۔ حب الوطنی کے پاکیزہ خیالات کی نشر و اشاعت پیش نظر ہو تو یقیناً ایسی فلمیں ملک اور قوم کے لئے مفید ہو سکتی ہیں اگر اس قسم کی کوئی کمپنی اس بلند مقصد کو لے کر کام کے لئے اُٹھے تو بے شک وہ ملک کی خدمت کرے گی۔

(دستخط محمد اقبال)

(نیرنگِ خیال سالنامہ ۱۹۳۳ء)

(۲)

امتیاز علی تاج کے ڈرامہ ''انارکلی'' کے بارے میں اقبال کی رائے

انارکلی کی زبان میں روانی اور اندازِ بیاں میں دلفریبی ہے۔

(انارکلی: دوسرا ایڈیشن ص ۱۹۷)

(۳)

''وجدانی نشتر'' اور ڈاکٹر اقبال

مولوی محمد الدین فوق کی کتاب وجدانی نشتر پر علامہ نے درج ذیل رائے کا اظہار کیا۔

''مولوی محمد الدین فوق ایک صاحبِ ذوق آدمی ہیں۔ ان کی جدت پسند طبیعت ہمیشہ انوکھی باتوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ حال میں انہوں نے ایک کتاب موسوم بہ ''وجدانی نشتر'' لکھی ہے جس میں ایسے عربی، فارسی، اُردو اور پنجابی اشعار جمع کر دیے ہیں جو تاریخی اعتبار سے ایک خاص اثر اور سوز و گداز کا باعث ہوتے ہیں۔ اس کتاب کی تالیف میں ان کو بہت محنت کرنی پڑی ہوگی مگر مولوی محمد الدین محنت سے گھبرانے والے نہیں۔ کتاب نہایت اچھی ہے اور دلچسپ، فوق صاحب کی تلاش قابلِ داد ہے اور انسانی قلب کی گوناگوں کیفیات پر روشنی ڈالتی ہے۔

(محمد اقبال)

(مآخذ طریقت جنوری ۱۹۱۶ء)

(۴)

''حکیم ظفریاب علی کے بارے میں رائے''

''حکیم ظفریاب علی صاحب جو دہلی کے طیبہ کالج کے ممتاز طلباء میں سے ہیں کئی سال سے لاہور میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ حال میں انہوں نے ایک یونانی دواخانہ لاہور میں کھولا ہے جسکی نسبت مجھے یقین ہے کہ کامیاب ہوگا میں نے اپنے احباب سے سنا ہے کہ اس دواخانے میں نسخے نہایت احتیاط سے تیار کئے جاتے ہیں۔ یونانی طب کے ہر دل عزیز اچھے دواخانوں پر منحصر ہے مجھے امید ہے حکیم ظفریاب علی کی مساعی بارآور ہوں گی۔

(محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا: لاہور)

(احسان اقبال نمبر ۱۹۳۸ء)

(۵)

کلام فلک کے بارے میں رائے

''لال چند فلک نے غالباً ۱۹۱۳ء میں قومی اور تاریخی نظموں پر مشتمل اپنا مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا جس میں ۱۹۰۴ء سے لے کر مارچ ۱۹۱۲ء تک کا کلام درج ہے اس مجموعے پر ظفر علی خان، فوق، منشی غلام قادر فرخ امرتسری اور حسرت موہانی نے اپنی آراء دیں۔ اقبال نے اس مجموعے کے بارے میں لکھا۔

''کلام فلک نظر سے گزرا شاعرانہ پہلو سے فلک صاحب کے اشعار قابل داد ہیں۔ بلندی تو آخر فلک کا خاصہ ہے اور مضامین کے تارے توڑنے کے لئے اسے کہیں دور نہیں جانا پڑتا'' (کلام فلک طبع چہارم ۱۹۲۲ء) ۷ ص

(۶)

''مصباح القواعد'' از مولوی فتح محمد خان جالندھری

مولوی صاحب کی یہ کتاب ۲۸۸ صفحات پر مشتمل ہے یہ ۱۹۰۴ء میں طبع ہوئی اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ جس میں اقبال کی رائے کے علاوہ مولانا شبلی، مولوی عبدالغنی، سیّد ممتاز علی کی آراء موجود تھیں۔ اقبال کی رائے یہاں درج کی جاتی ہے۔

''میں نے مولوی فتح محمد صاحب کی کتاب ''مصباح القواعد'' اوّل سے آخر تک پڑھی۔ مصنف نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اس اثر کو جو ان کی تصنیف نے میرے دل پر کیا ہے معرضِ تحریر میں لاؤں۔ اس لئے میں بڑی خوشی سے لکھتا ہوں کہ مولوی فتح محمد خاں صاحب نے اُس ضرورت کو جو مدتِ مدید سے محسوس ہو رہی تھی پورا کر دیا ہے اور اُردو داں پبلک پر بڑا احسان کیا ہے۔''

مصنف کی استدلات کی صحت کی نسبت رائے زنی تو اعلیٰ درجہ کے اہلِ زبان کا کام ہے مگر میں نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ یہ صرف انہیں لوگوں کے لئے مفید نہیں جو اپنی زبان کو غور و توجہ سے مطالعہ کرنا چاہتے ہیں بلکہ آئندہ اس میدان میں کام کرنے والوں کے لئے بھی یہ ایک بنیاد کا کام دے گی۔ قواعد کے پڑھنے کی تکان ان پاکیزہ اشعار سے بہت کچھ دور ہو جاتی ہے جو مثالوں میں لکھے گئے ہیں۔ تمام طرزِ ادا برجستہ ہے۔ میری رائے میں یہ کتاب اُس کتاب سے کہیں بہتر ہے جو مولوی محمد احسن الہ آبادی نے غدر سے دو سال بعد شائع کی تھی۔ جسکی طبع و اشاعت اب بند ہے۔

میں مولوی فتح محمد خان صاحب سے شاید چند نہایت خفیف امور میں اختلاف کرتا مگر میں نے اس کتاب میں ذرا سا بھی نقص نہیں دیکھا۔ بناءً علی ہذا میں بڑے زور سے ان لوگوں کے لئے سفارش کرتا ہوں جو اُردو زبان کو صحیح طور پر بولنا چاہتے ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ ٹکسٹ بک کمیٹی اس عمدہ کتاب کی خوبیوں کی داد دے گی اور اس کو داخلِ درس کر دے گی۔''

(۷)

جانوروں کے مکمل اور مفصل حالات

سید اکبر علی کی یہ کتاب ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے جس میں چھے سو (۶۰۰) کے لگ بھگ تصاویر ہیں۔ یہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ علامہ نے اس کتاب کے مطالعے کے بعد درج ذیل رائے ظاہر کی

''یہ نہایت عجیب وغریب اور دلچسپ کتاب، جس میں پرندوں کے عادات وخصائل اور ان کے تمام حالات ایسے دلکش پیرائیہ میں قلیم بند کئے ہیں کہ پڑھنے والا محو حیرت ہو جاتا ہے ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ ایسی کتاب آج تک اُردو میں نہیں لکھی گئی۔ بلکہ کسی اور زبان میں بھی اس قسم کی کتاب شاید ہی ہو۔ علم الحیوانات سے دلچسپی لینے والے ناظرین پڑھیں اور دیکھیں کہ خدا تعالیٰ کی وسیع مخلوقات میں یہ پرواز اُمّت کیا حیرت انگیز طریق زندگی رکھتی ہے۔

(زمیندار ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء)

(۸)

''حجتہ الاسلام'' از اکبر شاہ نجیب آبادی پر تبصرہ

''حجتہ الاسلام کا میں نے ابھی مطالعہ کیا ہے عام پڑھنے والوں کے لئے اس سے بہتر کتاب شاید ہی لکھی گئی ہو۔ طرزِ بیان نہایت دلکش اور سادہ ہے۔ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اس زمانہ میں بہت ضروری ہے کہ مسلمانانِ ہند حقائق اسلام کو عام فہم پیرائیہ میں اقوامِ ہند کے سامنے پیش کردیں بحث و تحقیق کا جو انداز آپ نے اختیار کیا ہے نہایت عمدہ نتائج پیدا کرے گا۔ تبلیغ و تحقیق کا گُر یہی ہے کہ عام انسانوں کے فہم اور ان کے حسیات قلبی کو ملحوظ رکھا جائے۔ باقی جلدوں کی تکمیل میں جہاں تک ممکن ہو جلدی کیجئے۔ ہندی بھاشا میں بھی اس کی اشاعت ہو تو خوب ہے۔

(مدینہ بجنور ۲۵ اپریل ۱۹۲۷ء)

کانپور سے چھپنے والے بچوں کے اخبار ''سعید'' کے مطالعے کے بعد اقبال نے یہ رائے دی

''اخبار سعید'' بچوں کے لئے نہایت مفید ہے۔ زبان سلیس اور سادہ ہے۔

یکم جنوری ۱۹۱۹ء

(د) اقبال کے بیانات اور تقریریں

انجمن کے سالانہ جلسہ ۱۹۱۲ء کی کاروائی

انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں کی کاروائی بالعموم انجمن کی رودادوں میں شائع ہوتی تھی لیکن اس جلسے کی کاروائی اخبار زمیندار نے بھی شائع کی۔ انجمن کا یہ دوسرا جلسہ دو بجے سے پانچ بجے شام مشیر ریاست بہاول پور خان بہادر مرزا سلطان احمد کی زیر صدارت منعقد ہوا اس اجلاس میں منشی میراں بخش جلوہ نے اپنی نظم پڑھی جو یتیموں کی ہمدردی میں تھی۔ شیخ عبدالقادر نے بھی اس موقع پر تقریر کی اس کاروائی کے بعد ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب تالیوں کی مسلسل اور متواتر گونج میں اسٹیج پر نمودار ہوئے اور فرمایا

''گزشتہ سال میں نے اس جلسے میں جو نظم پڑھی تھی وہ خدا کا شکوہ تھا۔ بعض لوگوں نے خیال کیا تھا کہ یہ بڑی جسارت ہے اور میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ لیکن اس کا مضمون ایسا پسند کیا گیا کہ مجھے اس کی اشاعت کے متعلق آج تک کئی ہزار خطوط میرے پاس آ چکے ہیں اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو بات لوگوں کے دل میں تھی میں نے وہی ظاہر کر دی تھی۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ میرا شکوہ خدا کو بھی پسند آیا خیر اگر وہ نہ بھی بخشے تو بھی میں یہی کہوں گا۔

تیری رحمت ہے کہ دوزخ بھی مجھے تو نے دیا
کہ مکافات کی میرے تو جگہ یہ بھی نہ تھی

میں نے اپنے لئے خود ہی ایک سزا تجویز کر لی وہ یہ کہ اپنی شکایت آپ کروں میں اپنی نظم پر انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو خاص توجہ دلاتا ہوں۔ میری شعر گوئی خاص احساسات کا نمونہ ہے آج میری نظر ایسی جامع ہے کہ اس میں مشکلات کی تصویر کھینچ کر ان کے حل کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے یہ زمانہ اسلام کی تاریخ میں سیاسی اعتبار سے ایک سخت نازک وقت ہے خدا کے واسطے تم لوگ توجہ کرو اور اسلام کی عزت برقرار رکھو۔''

(زمیندار ۱۳ اپریل ۱۹۱۲ء) میوزیم لائبریری لاہور

اقبال اور آزاد

بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اپنی زندگی میں اقبال اور ابوالکلام آزاد بہت کم ایک دوسرے کے قریب آ سکے۔

دونوں اپنے اپنے وقتوں کی نابغہ روزگار شخصیتیں تھیں۔ درج ذیل تراشہ اقبال اور آزاد کے باہمی تعلقات اور رابطوں کے حوالوں سے نئی معلومات کا حامل ہے۔ جو پیش کیا جاتا ہے۔

لندن میں فرقہ وارانہ تصفیہ کی شرط

سرمحمد اقبال کے بیان کی خامیاں

مولانا ابوالکلام کا اظہار خیال

الہ آباد ۸ دسمبر: حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے حال ہی میں فرقہ وارانہ تنازعہ کے متعلق موجودہ صورتِ حالات پر گاندھی جی کے ساتھ گفتگو کے دوران ملاقات میں سرمحمد اقبال کے اس بیان کی تردید کی کہ انہوں نے گول میز کانفرنس پر فرقہ وارانہ تصفیہ کے لئے گفت وشنید کے دوران میں مسلم نمائندوں سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اچھوتوں کے لئے جداگانہ طریقِ انتخاب کے مطالبہ کی (جو ڈاکٹر امبید کر نے پیش کیا تھا) مخالفت کریں۔

مولانا موصوف نے مزید فرمایا کہ ''حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی ہز ہائنس آغا خاں سے جنھوں نے گول میز کانفرنس میں چند شرائط کے ساتھ ہندوؤں کے ساتھ سیاسی جدوجہد میں شریک ہونے کی پیشکش کی تھی صرف یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ اچھوتوں کے حق میں جداگانہ انتخاب حاصل کرنے کے لئے ڈاکٹر امبید کر کے مطالبہ کی حمایت نہ کریں کیونکہ گاندھی جی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اچھوتوں کی نمائندگی کے سوال کا صرف ہندوؤں سے تعلق ہے کیونکہ اچھوت اقوام ہندو قوم کے دائرہ میں شامل ہیں اور اس معاملہ میں مسلمانوں کو مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ مدعو کرنے کی فی الحال ضرورت نہیں لیکن اگر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ مدعو کی گئی تو کانگرس لیڈر اس میں ضرور شریک ہوں گے حکومت کا رویہ خواہ کچھ بھی ہو۔

مولانا آزاد نے مزید فرمایا کہ جو لوگ کانگریس کے پروگرام میں تبدیلی کرنا چاہتے ہیں انہوں نے ابھی تک کانگریس کے موجودہ پروگرام کا کونسلوں میں داخلہ کے سوائے کوئی نعم البدل پیش نہیں کیا اور اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ مولانا کیا پیغام دینا چاہتے ہیں انہوں نے فرمایا میرا دل جل کر ٹھنڈا ہو گیا ہے میں کیا پیغام دے سکتا ہوں کانگریس کے موجودہ پروگرام میں اس وقت تک جب تک گاندھی جی سیاست سے الگ رہیں تبدیلی کرنے کے سوال پر مولانا نے اپنی رائے ظاہر نہیں کی۔

(الجمیعۃ ۱۳ دسمبر ۱۹۳۳)

افغانستان میں خوشحالی کے آثار

سر محمد اقبال کا بیان

لاہور ۶ نومبر: سر راس مسعود، سر محمد اقبال اور سید سلیمان ندوی نے افغانستان سے واپس آنے کے بعد جہاں وہ افغان یونیورسٹی کے متعلق حکومتِ افغانستان کو مشورہ دینے گئے تھے مندرجہ ذیل مشترکہ بیان شائع کیا۔

''آج افغانستان ایک متحدہ ملک کا نظارہ پیش کرتا ہے جہاں ہر جانب بیداری کے آثار نمایاں ہیں اور جہاں اصلاحات کا کام نہایت، احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ سرانجام دیا جا رہا ہے ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر موجودہ حکومت کو دس سال کی مہلت دی جائے تو افغانستان کی خوش حالی ایک یقینی امر ہے آج کل افغانستان میں ہر شخص کی جان محفوظ ہے اور وزرا نہایت مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

(الجمیعۃ ۱۳ دسمبر ۱۹۳۳ء)

علامہ اقبال کے ارشادات گرامی

علام ممدوح نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء کے ایک جلسہ میں حکیمانہ و عالمانہ انداز میں بیان فرمایا

''میں انگریزی، اُردو، فارسی میں برنگِ نثر بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا لیکن یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ طبائع نثر کی نسبت شعر سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں لہذا میں نے مسلمانوں کو زندگی کے صحیح مفہوم سے آشنا کرنے، اسلاف کے نقشِ قدم پر چلانے اور نا اُمیدی بزدلی اور کم ہمتی سے باز رکھنے کے لئے نظم کا ذریعہ استعمال کیا۔ میں نے ۲۵ سال تک اپنے بھائیوں کی مقدور بھر ذہنی خدمت کی اب میں ان کی بطرز خاص عملی خدمت کے لئے اپنے آپ کو پیش کر رہا ہوں۔ اسلامیانِ ہند پر عجیب دور آ رہا ہے ۱۹۲۹ء میں ایک شاہی مجلسِ تحقیقات و اصلاحات جسے رائل کمیشن کہتے ہیں یہ تحقیق کرے گا کہ آیا ہندوستان مزید رعایات و اصلاحات کا مستحق ہے یا نہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان بھی اس باب میں توجہ سے کام لیں اور اپنے حقوق کا تحفظ کریں۔

ممبر کا سب سے بڑا وصف یہ ہونا چاہیے کہ ذاتی اور قومی منفعت کی ٹکر کے وقت اپنے شخصی مفاد کو مقاصدِ قوم پر قربان کر دے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کبھی بھی اپنے مفاد کو قوم کے مصالح کے مقابلہ میں ترجیح نہیں دوں گا اور ربّ العزت سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس امر کی توفیق بخشے کہ میں آپ کی خدمت کروں۔ میں اغراضِ ملی کے مقابلہ میں

ذاتی خواہشوں پر مر مٹنے کو موت سے بدتر خیال کرتا ہوں۔

(اخبار کشمیری لاہور ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۶)

آنحضرت ﷺ کی مقدس اور بے لوث ذات کے متعلق

ڈاکٹر محمد اقبال ایم اے کی تازہ تقریر

کراچی کی ایک انگریزی بائسکوپ کمپنی نے آنحضرت ﷺ کی ذاتِ پاک کے متعلق ایک تصویر دکھا کر مسلمانوں کی دلازاری کی ہے جس کا مقدمہ عدالت میں پیش ہے۔ اس نے تمام ہندوستان میں ناراضگی کا ایک تلاطم پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ لاہور میں بھی ۲۴ جون کو ایک جلسہ ہوا۔ جس میں نواب ذوالفقار علی خان سی آئی ای، ڈاکٹر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ اسٹنٹ سرجن، چوہدری شہاب الدین بی اے۔ ایل ایل بی پلیڈر، مولوی غلام محی الدین پلیڈر، سید محسن شاہ بی اے ایل ایل بی پلیڈر، حاجی شمس الدین صاحب سیکرٹری وغیرہ حضرات نے تقریریں کیں۔ جن میں سے ڈاکٹر اقبال کی تقریر ذیل میں درج ہے اور جس پر شمس العلماء مولوی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی نے کہا ہے کہ میں خوش ہوں کہ اب مولوی صاحبان کے کام گریجوایٹ لوگ انجام دینے لگے ہیں۔

''ایک عظیم الشان اسلامی مجمع کے سامنے آنحضرت ﷺ کی زندگی کے واقعات بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں کیونکہ تقریباً تمام مسلمانوں کو اس بے لوث اور عظیم الشان ہستی کی زندگی کے اہم واقعات بخوبی یاد ہیں اور وہ مسلمان ہی کیا جس کو آنحضرت ﷺ کی زندگی کے حالات واقعات سے آگاہی نہ ہو۔ اس لئے میں یہاں صرف چند واقعات بیان کرنے کی کوشش کروں گا اور آپ کو بتاؤں گا کہ اس انسان کی زندگی کس قدر بے لوث اور مقدس تھی اور اس کے خلاف کوئی شخص وہم میں بھی افترا نہیں باندھ سکتا۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ آج اس پاک زندگی پر جھوٹے بہتان باندھے جاتے ہیں۔ دوستو! تاریخ دنیا اس بات کی شاید ہے کہ دنیا میں جس قدر ولی، نبی، اور پیشوا آئے ہیں ان کی زندگی گواہی دیتی ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے دل میں اس وقت اپنی محبت پیدا نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کی زندگی بے لوث اور مقدس نہ ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے عظیم الشان کارناموں سے اور تحکمانہ کاروائیوں سے رعب کے تاثرات آپ کے دل میں پیدا کر دے۔ مگر کسی شخص کے دل میں اپنی محبت پیدا کرنی بہت مشکل ہے۔ میں کہتا ہوں تاریخ دنیا میں نہ کوئی ایسا شخص ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا۔ اللہ اکبر جب آنحضرت ﷺ ایک جنگ میں جاتے ہیں اور وہاں آپ ﷺ کا دانت مبارک شہید ہو جاتا

ہے تو ان کی محبت کا ایک شیدائی یہ خبر سنتے ہی یکے بعد دیگرے اپنے سب دانت پتھر سے توڑ ڈالتا ہے۔ اللہ اکبر آپ کے پیارے آپ کے ہر فعل کی تقلید میں خاص لطف محسوس کرتے تھے۔ حضرات! میں آپ کو کیا کیا باتیں عرض کروں۔ یہ مبارک ذکر تورات بھر میں بھی کبھی ختم نہ ہوگا۔

آنحضرت ﷺ کی عظیم الشان ذات نے دنیا میں نئے تمدن کی بنیاد رکھی اور تمام دنیا کا درد اپنی ذاتِ مبارک میں محسوس کیا۔ اس وقت جب کہ راہبوں، برہمنوں اور پروٹسٹنوں نے اپنی خود مختارانہ حکومتوں سے بنی نوع انسان کو مذہب کی آڑ میں مقید کر رکھا تھا آنحضرت ﷺ نے انہیں اس غلامی سے رہا کیا۔ اور ان کو بتایا کہ خدا کے ملنے کا میں تمہیں رستہ دکھاتا ہوں۔ اس طرح اُنہوں نے اور پروٹسٹنوں کی حکومتوں کا دنیا میں خاتمہ کیا۔

صاحبان! اگر دنیا کو ایک تاش سے نسبت دی جائے تو اسلام ''یکہ'' کا پتہ ہے۔ جس کے نظریہ توحید کے آگے بڑے بڑے تاش کے نہلے، دہلے اور غلام کٹ گئے۔ عرب کا وہ خطہ جس پر تہذیب کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی تھی خدا نے انہی لوگوں کو تہذیب کا استاد بنا دیا اور اسلام نے ہی یورپ کو تہذیب یافتہ بنایا۔ آج یورپ اس بات کو خواہ مانے یہ نہ مانے لیکن وہ زمانہ جلد آنے والا ہے کہ یورپ اس بارے میں اسلام کی فوقیت خود بخود تسلیم کرے گا۔ اللہ اکبر آنحضرت ﷺ جب بتوں کے خلاف مکہ میں اظہار خیالات کرتے ہیں تو مکہ کے عرب لیڈر آنحضرت ﷺ کے پاس آتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ اے محمد ﷺ ہم تجھے عرب کی حسین عورتیں اور مال و دولت پیش کرنے کو تیار ہیں مگر تو بتوں کی مذمت کرنی چھوڑ دے اس وقت آپ جواب دیتے ہیں کہ تم لوگ میرے دائیں ہاتھ پر چاند، اور بائیں ہاتھ پر سورج بھی رکھ دو تو بھی بتوں کے خلاف اظہار خیالات کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر کراچی کی کمپنی کی بائسکوپ کے مطابق حضرت ﷺ کو عورتوں کی خواہش تھی تو انہوں نے کیوں نہ اس موقع پر عرب کی حسین عورتیں قبول کیں (شیم شیم)۔ گو آنحضرت ﷺ کی زندگی کے خلاف ایسا بہتان باندھا گیا ہے۔ تاہم مانی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر زمانہ میں دنیا کے باشندوں کا ایک کثیر طبقہ اِن کی تعریف میں رطب اللسان رہے گا۔

(اخبار کشمیری لاہور ۲۸ جون ۱۹۱۴ء)

کے وہ مسلمان ارکان جو مسلم لیگ کا ٹکٹ قبول کر لیں گے اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی متصور ہوں گے اور مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہوگی کہ لیگ کی حکمتِ عملی اور لائحہ عمل کے بنیادی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی اور پارٹی سے اتحاد کرے یا موجودہ اتحاد کو برقرار رکھے۔ نام نہاد جناح سکندر معاہدہ کا اہم حصہ صرف یہی ہے اور معاہدہ کی باقی شقوں سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں۔

جب مذکورہ صدر اعلان اخبارات میں شائع ہوا تو مجھے حقیقتاً بڑی مسرت ہوئی۔ کیونکہ میں محسوس کرتا تھا کہ اتحاد پارٹی کے قیام سے مسلمانوں میں جو انتشار پیدا ہو گیا تھا وہ اب دور ہو جائے گا۔ اور مسلمان ایک متحدہ قوم بن جائیں گے۔ لہذا میں نے مسٹر غلام رسول سکریٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو ہدایت کی کہ وہ سر سکندر کے پاس لیگ کی ۹۰ درخوستہائے رکنیت بھیج دیں تا کہ وہ ان پر اتحاد پارٹی کے مسلمان ارکان سے دستخط کرالیں۔ چنانچہ یہ درخواستیں اکتوبر ۱۹۳۷ء کے تیسرے ہفتہ میں سر سکندر حیات خاں صاحب کے پاس بھیج دی گئیں لیکن ہمیں ان کے متعلق کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ اس لئے یاد دہانی کرائی گئی مگر پھر بھی مہر سکوت نہ ٹوٹی اور تا حال سر سکندر نے ایک درخواست بھی دستخط کروا کر واپس نہیں بھیجی۔ مجھے ملک برکت علی صاحب نے اطلاع دی ہے کہ ۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو لیگ کونسل کے اجلاس دہلی میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا تھا اور وہاں اتحاد پارٹی کے ایک ذمہ دار مسلم رکن نے یہ بیان کیا کہ رکنیت کی درخواست کرنے والوں نے یہ عہد کیا ہے کہ ہم جناح سکندر معاہدہ کے مطابق لیگ کے رکن بننے پر آمادہ ہیں۔

اس مقام پر یہ امر اشد ضروری معلوم ہوتا کہ اصلی صورت حالات کو واضح کر دیا جائے۔ سر سکندر کا دعویٰ ہے کہ تحریری معاہدہ کے علاوہ جس کا اہم ترین حصہ اوپر نقل کیا جا چکا ہے میرے اور مسٹر جناح کے درمیان زبانی افہام و تفہیم بھی ہوئی ہے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس معاہدہ کی مختلف تشریحیں کی گئی ہیں اور اسی وجہ سے عوام میں اتحاد پارٹی کے رویہ کے خلاف سخت ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ پورے چار مہینے گزر چکے ہیں مگر یہ ہیجان و اضطراب کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اور وقت آ گیا ہے کہ مسلم عوام کو صحیح صورت حالات سے آگاہ کر دیا جائے میں اعلان کرتا ہوں کہ معاہدہ لکھنؤ کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ابھی تک کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اس لئے میں یہ بیان شائع کر رہا ہوں تا کہ مسلمانان پنجاب کو معلوم ہو جائے کہ اتحاد پارٹی اور مسلم لیگ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور اب یہ توقع رکھنا کہ جناح سکندر معاہدہ کے بعد اتحاد پارٹی کے مسلمان ارکان اپنے آپ کو مسلم لیگ میں مدغم کر دیں گے

کے وہ مسلمان ارکان جو مسلم لیگ کا ٹکٹ قبول کرلیں گے اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی متصور ہوں گے اور مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہوگی کہ لیگ کی حکمتِ عملی اور لائحہ عمل کے بنیادی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی اور پارٹی سے اتحاد کرے یا موجودہ اتحاد کو برقرار رکھے۔ نام نہاد جناح سکندر معاہدہ کا اہم حصہ صرف یہی ہے اور معاہدہ کی باقی شقوں سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں۔

جب مذکورہ صدر اعلان اخبارات میں شائع ہوا تو مجھے حقیقتاً بڑی مسرت ہوئی۔ کیونکہ میں محسوس کرتا تھا کہ اتحاد پارٹی کے قیام سے مسلمانوں میں جو انتشار پیدا ہو گیا تھا وہ اب دور ہو جائے گا۔ اور مسلمان ایک متحدہ قوم بن جائیں گے۔ لہذا میں نے مسٹر غلام رسول سکریٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو ہدایت کی کہ وہ سر سکندر کے پاس لیگ کی ۹۰ درخوستہائے رکنیت بھیج دیں تاکہ وہ ان پر اتحاد پارٹی کے مسلمان ارکان سے دستخط کرالیں۔ چنانچہ یہ درخواستیں اکتوبر ۱۹۳۷ء کے تیسرے ہفتہ میں سر سکندر حیات خاں صاحب کے پاس بھیج دی گئیں لیکن ہمیں ان کے متعلق کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ اس لئے یاددہانی کرائی گئی مگر پھر بھی مہر سکوت نہ ٹوٹی اور تاحال سر سکندر نے ایک درخواست بھی دستخط کروا کر واپس نہیں بھیجی۔ مجھے ملک برکت علی صاحب نے اطلاع دی ہے کہ ۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو لیگ کونسل کے اجلاس دہلی میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا تھا اور وہاں اتحاد پارٹی کے ایک ذمہ دار مسلم رکن نے یہ بیان کیا کہ رکنیت کی درخواست کرنے والوں نے یہ عہد کیا ہے کہ ہم جناح سکندر معاہدہ کے مطابق لیگ کے رکن بننے پر آمادہ ہیں۔

اس مقام پر یہ امر اشد ضروری معلوم ہوتا کہ اصلی صورت حالات کو واضح کر دیا جائے۔ سر سکندر کا دعویٰ ہے کہ تحریری معاہدہ کے علاوہ جس کا اہم ترین حصہ اوپر نقل کیا جا چکا ہے میرے اور مسٹر جناح کے درمیان زبانی افہام و تفہیم بھی ہوئی ہے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس معاہدہ کی مختلف تشریحیں کی گئی ہیں اور اسی وجہ سے عوام میں اتحاد پارٹی کے رویہ کے خلاف سخت ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ پورے چار مہینے گزر چکے ہیں مگر یہ ہیجان و اضطراب کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتا چلا جارہا ہے۔ اور وقت آگیا ہے کہ مسلم عوام کو صحیح صورت حالات سے آگاہ کر دیا جائے میں اعلان کرتا ہوں کہ معاہدہ لکھنؤ کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ابھی تک کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اس لئے میں یہ بیان شائع کررہا ہوں تاکہ مسلمانان پنجاب کو معلوم ہو جائے کہ اتحاد پارٹی اور مسلم لیگ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور اب یہ توقع رکھنا کہ جناح سکندر معاہدہ کے بعد اتحاد پارٹی کے مسلمان ارکان اپنے آپ کو مسلم لیگ میں مدغم کر دیں گے

ایک امید موہوم ثابت ہو رہی ہے۔ یہاں پر مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مسلم لیگ کا دروازہ ہر اس مسلمان کے لئے کھلا ہے جو لیگ کے دستور پر دستخط کرنے کو تیار ہو اور میں نہایت خوشی کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ اس وقت تک اسمبلی کے متعدد مسلم ارکان نے لیگ کے دستور پر دستخط کر دیئے ہیں۔"

حاشیہ از غلام رسول خان

نوٹ: یہ بیان آخیر مئی ۱۹۳۸ء میں تیار کر لیا گیا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ اسے شائع کر دیا جائے لیکن لیگ کے عہدہ داروں کی اکثریت نے یہ مناسب خیال کیا کہ مسٹر جناح کی مقرر کردہ آرگنائزنگ کمیٹی کو پنجاب میں لیگوں کی تشکیل و تنظیم کے لئے ایک اور موقعہ دیا جائے اور ان کی راہ میں کوئی مشکل پیدا نہ کی جائے۔ صفحہ ۲۳/۲۲ کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ اس وقت اس کمیٹی کے ۳۴ ارکان میں سے قریباً ۳۰ حضرات اتحاد پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ملک برکت علی صاحب بھی انہی میں شامل ہیں۔ ملک صاحب موصوف دسمبر ۱۹۳۸ء تک پنجاب کے مسلمانوں میں یہ تبلیغ کرتے رہے ہیں کہ 'یونین ازم' اور 'لیگ ازم' دو متضاد و مختلف مسلک ہیں اور دونوں میں مصالحت ناممکن ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یکم جنوری ۱۹۳۹ء سے وہ اس امر کے قائل ہو گئے ہیں کہ 'یونین ازم' اور 'لیگ ازم' ایک ہی چیز ہیں۔ اور اب اُن کی رائے یہ ہے کہ پنجاب مسلم لیگ کو اتحاد پارٹی کے ایک شعبہ کی حیثیت سے کام کرنا چاہیے کیونکہ اب وہ اتحاد پارٹی میں وہ تمام مخفی خوبیاں دیکھ رہے ہیں جو علامہ مرحوم اور ان کے باقی ماندہ عقیدت مندوں کو نظر نہ آسکیں۔ بہر حال یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ آرگنائزنگ کمیٹی نے جس کے صدر سر سکندر حیات خاں صاحب ہیں لیگ کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کے سلسلے میں ابھی تک کوئی حرکت نہیں کی۔ بلکہ واقع یہ ہے کہ سر سکندر حیات نے شہر قصور۔ منٹمگری اور دیگر مقامی لیگوں کے سپاس ناموں اور استفسارات کے جواب میں جو تقریریں کی ہیں۔ ان میں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ لیگ ایک فرقہ وارانہ جماعت ہے اور اس کا وجود چنداں ضروری نہیں ہے یہ واقع ہے کہ آرگنائزنگ کمیٹی کے صرف تین اجلاس ہوئے ہیں جن میں صاحب صدر نے پر تکلف چائے سے بھی حاضرین کی تواضع کی تھی اور پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا ایک نام نہاد ترمیم شدہ آئین بھی منظور کر لیا تھا مگر اس آئین میں مسلم آبادی کی شہری اور دیہاتی تقسیم و تفریق کے متعلق بھی بعض دفعات شامل ہیں۔ یعنی اتحادیوں کی یہ حکمت عملی کہ عوام کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کر کے ان میں انتشار پیدا کیا جائے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے دستور میں داخل کر دی گئی ہے۔ نیز اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ سر سکندر حیات خان نے مجھے اس

آرگنائزنگ کمیٹی کا سکریٹری نامزد کیا تھا مگر مجھے پنجاب میں لیگ کا کوئی کام کرنے کی اجازت نہ دی گئی مجھے یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ پنجاب میں جو مختلف لیگیں اس وقت موجود ہیں ان کے عہدہ داروں کی ایک نئی فہرست تیار کرو اور اُن اشخاص کو جو اتحادیوں سے اتفاق رائے نہیں رکھتے عہدہ داری سے ہٹادو لیکن میں نے اس پر یہ عذر کیا کہ یہ عہدہ دار مقامی ڈسٹرکٹ لیگیوں کی طرف سے منتخب ہوکر آئے ہیں۔ اس لئے مجھے لاہور میں بیٹھ کر نئے عہدہ دار نامزد کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے لیگ کے چند مخلص کارکنوں کے نام اس غرض سے تجویز کئے کہ انہیں مختلف اضلاع میں پروپگنڈہ کرنے کے لئے بھیجا جائے تا کہ وہ مسلم عوام میں سیاسی بیداری پیدا کریں لیکن میری اس درخواست کی بھی پذیرائی نہ ہوئی۔ اور مجھے اب یہ اطلاع ملی ہے کہ اتحاد پارٹی کے دفتر مین فرضی لیگیوں کی ایک نئی فہرست مرتب کی گئی ہیں اور آرگنائزنگ کمیٹی کی طرف سے یہ فہرست آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر میں بھیجی جارہی ہے تا کہ آل انڈیا مسلم لیگ سے ایک فرضی پروانشل مسلم لیگ کا الحاق منظور کرایا جاسکے۔ میں یہ اعلان کردینا چاہتا ہوں کہ باوجود یہ کہ اتحادی اخبارات میں مجھے آرگنائزنگ کمیٹی کا سکریٹری ظاہر کیا جاتا رہا ہے۔ مجھے ایسے کاروائی کا کوئی علم نہیں جو اتحادی لیگ کے متعلق کرتے رہے ہیں۔ اس لئے میں مسلم عوام کو ایک فرضی مسلم لیگ سے برپا ہونے والے خطرہ سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں اور ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ جلد از جلد ایک ایسی حقیقی اور باعمل پراونشل لیگ کا ساتھ دیں۔ جس کی ابتدائی اور اضلاعی شاخیں ہر قسم کے سرکاری اثر و رسوخ سے پاک ہوں اور جس کا پروگرام صوبہ اور ملک کے مفاد کے لئے تمام آزاد خیال اور ترقی پسند اداروں سے تعاون اور اشتراک عمل پر مبنی ہو۔

غلام رسول

آنریری سکریٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ لاہور یکم مارچ ۱۹۳۹ء

حضرت مولانا گرامی مرحوم و مغفور

ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہ العالی کا غیر مدون مضمون

(حضرت مولانا گرامی مرحوم و مغفور کے انتقال کی وحشت انگیز خبر سُنتے ہی پنڈت ہری چند اختر بی۔اے نمائندہ ''مخزن'' نے ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہٗ العالی کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے چند سوالات کئے۔جن کے جواب میں ڈاکٹر صاحب ممدوح نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔)

آج سے تقریباً بیس پچیس سال پیشتر میرے اور مولانا گرامی کے تعلقات کا آغاز ہوا۔آپ اُس وقت مستقل طور پر حیدر آباد میں رہتے تھے۔اور کبھی کبھی پنجاب میں آیا کرتے تھے۔اس زمانے میں آپ زیادہ تر غزل ہی لکھا کرتے تھے۔لیکن میرا یہ خیال ہے کہ اُنہیں غزل اور مثنوی دونوں پر قدرت حاصل تھی۔رباعی زیادہ تر انہوں نے آخر عمر میں لکھی۔ایک مثنوی مولانا رومؒ کی طرز پر لکھنی شروع کی تھی۔جس کا کچھ حصہ شائع ہو چکا ہے۔دوسری مثنوی ملا غنیمت کنجاہی کی مثنوی کے انداز پر تھی۔لیکن دونوں غالباً ختم نہیں ہوئیں۔آپ کا پیشتر کلام غزل پر مشتمل ہے۔کئی سال ہوئے مولانا گرامی اپنے کلام کا ایک مجموعہ جو انہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔دکھایا تھا۔اس مجموعے کا حجم قریباً تین سو صفحے کے ہوگا۔یہ مجموعہ بیاض کی صورت میں تھا۔اور اس میں قریباً سب کی سب غزلیں موجود تھیں۔مجھ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ مجموعہ اب کہاں ہے۔غالباً محفوظ ہو گا۔میرے نزدیک اصناف سخن میں ان کو غزل کے ساتھ خاص شغف تھا۔فارسی لٹریچر میں جو ''تازہ گوئی'' کا دور اکبر کے عہد سے شروع ہوا تھا۔مولانا گرامی کو اس دور کا آخری شاعر سمجھنا چاہیے۔

ان کا کلام بحیثیت مجموعی بالخصوص غزل میں نظیری کے کلام سے ایک خاص نسبت رکھتا ہے۔شعر سے ان کی طبعیت کو فطری مناسبت تھی۔اس فطری مناسبت کے ساتھ زندگی کے عام حالات نے ان کو فنافی الشعر کر دیا تھا۔گفتگو اور عام روش میں وہ نہایت سیدھے سادے آدمی تھے۔لیکن حقیقت میں نہایت ذہین آدمی تھے۔اور شعر کے

علاوہ زندگی کے دیگر امور کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ گو ان امور میں عام طور پر دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ جدید فارسی زبان کا اثر ان کے کلام پر مطلق نہ تھا۔ وہ کلاسیکل فارسی ہی میں لکھتے تھے۔ فارسی زبان کے ساتھ ان کو ایک طبعی مناسبت تھی۔ اور تراکیب وضع کرنے میں ان کا انداز مجتہدانہ تھا۔ جدید فارسی تراکیب اور الفاظ سے اجتناب بھی ان کے صحیح ذوق شعر کی ایک دلیل ہے۔ ان کے جذبات گہرے اور افکار بلند ہوتے تھے۔ وہ تقریباً ہر وقت فکر سخن میں مصروف رہتے تھے، بالخصوص رات کے وقت بہت کم کھاتے اور بہت کم سوتے تھے۔ ان کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ تھی۔ کہ حافظہ نہایت قوی تھا۔ فارسی کے ہزاروں اشعار ان کو ازبر تھے۔ اور اپنا کلام بھی سارا کا سارا یاد تھا، میرا یہ عقیدہ تھا کہ وہ ہر پہلو سے اپنے زمانے کے ایک بے نظیر آدمی تھے۔ سادگی بے پروائی اور بلند پروازی کے ایسے مجموعے کی مثال اس زمانے میں مشکل سے ملے گی، منجملہ دیگر خصوصیات کے ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اپنے کلام کو خود نہایت گہری ناقدانہ نظر سے دیکھتے تھے۔ آخر عمر میں ان کی طبیعت طول نویسی کا بار برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اپنی عمر کے آخری دو تین سالوں میں انہوں نے سوائے رُباعی کے غالباً اور کچھ نہیں لکھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے فارسی نثر میں انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ لیکن عام حالات سے اندازہ کر کے میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ اگر وہ فارسی نثر لکھتے تو نہایت شگفتہ لکھتے۔ ان کے اُردو کے خطوط بھی جدتِ بیان سے خالی نہ ہوتے۔ وہ نہایت صلح کُل تھے۔ ان کے اخلاق وسیع تھے۔ اور ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ کہ وہ کسی کے کلام پر اُس کے سامنے نکتہ چینی کریں۔ اعلےٰ درجے کا شاعر ہونے کے علاوہ وہ اعلےٰ پایہ کے نقادِ شعر بھی تھے۔ جب انہیں کوئی اچھا شعر سُنایا جاتا تو ان کو معاً یاد ہو جاتا اور پھر کئی کئی دن تک اُسے پڑھتے رہتے۔ گرامیؔ کو خانخاناں کے زمانے میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی نے انہیں اس زمانے میں پیدا کر دیا۔ مگر یہ بات باعث اطمینان ہے کہ میر محبوب علی خاں عرش آشیانی نے ایک ایسے زمانے میں ان کی قدر افزائی کی جبکہ فارسی شعر کا چراغ ہندوستان میں گُل ہو چکا تھا۔ پنجاب کی ادبی روایات جن کا سلسلہ مسعود سعد سلمانؔ سے شروع ہوتا ہے اصل میں فارسی ہی سے وابستہ تھیں۔ مولانا گرامی ان روایات کے بہترین حامل تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

گرامی کی بہترین یادگار ان کا کلام ہے۔ ان کے احباب اور مداحین کو چاہیے کہ وہ اس کلام کو ان کے ورثاء سے حاصل کر کے شائع کریں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اپنے کلام کا ایک حصہ وہ ضرور اپنے ساتھ ہی لے گئے ہیں۔

(مخزن جون ۱۹۲۷ء)

(و) شذراتِ فکرِ اقبال

(۱)

۱۹۱۰ء میں اقبال نے Stray Reflection کے نام سے جو شذرات لکھے اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ذیل میں اقبال کے کچھ اقوال درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ دماغ واقعہ پر اثر انداز ہوتا ہے نہ کہ واقعہ دماغ پر۔

۲۔ جمہوریت ایک پردہ ہے جس کے پیچھے بڑے بڑے لوگ پناہ لیتے ہیں۔

۳۔ دنیا انسان کے لئے ہے نہ کہ انسان دنیا کے لئے۔

۴۔ علم اشیاء کی جھلک دیکھتا ہے اور عشق ان کی تلاش کر کے ان تک پہنچ جاتا ہے۔

۵۔ سائنس، فلسفہ، آرٹ اور مذہبی تجربات سے انسان اپنی ہستی کو پہچانتا ہے۔

(رسالہ جہانگیر سالنامہ ۱۹۳۲ء ص ۷۰)

(۲)

لوگ ماضی کی تعریف کرتے ہیں اور حال کو بُرا کہتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ تمام ماضی جمع ہو کر ایک نقطہ پر آ گیا ہے۔ وہ حال ہے کمزور اپنے وجود کو خدا کی ذات میں فنا کر دیتے ہیں طاقتور اسے اپنے اندر تلاش کرتے ہیں۔

صدیوں سے مشرقی دل و دماغ اس خیال میں متفرق رہے ہیں کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں۔ میں ایک نیا سوال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی ایسا سوال جو مشرق کے لئے نیا ہے کہ انسان کا بھی وجود ہے یا نہیں۔

صرف وہ شخص جو اپنے وجود کی اہمیت جانتا ہو ایثار کر سکتا ہے۔

(ڈاکٹر محمد اقبال)

(بحوالہ پیمانہ دہلی نومبر ۱۹۲۵ء مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)

اقبال کے دو غیر مدوّن شذرات

اقبال نے ۱۹۱۰ء میں (Stray Reflection) کے نام سے ایک ڈائری لکھنا شروع کی جو بعد میں ''شذراتِ فکرِ اقبال'' کے عنوان سے شائع ہوئی: اقبال کے یہ دو شذرات ادبی دنیا کے دو شماروں نومبر، دسمبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئے: غالباً یہ خیالات کسی فرانسیسی ماخذ سے اخذ کئے گئے: کیونکہ اس پر ''فرانسیسی'' کا عنوان دیا گیا تھا: (ص۔ک)

(۱) قسمت

ابتدائے ازل سے عام لوگ یہ کہتے آئے ہیں کہ قسمت بھی ایک پوشیدہ طاقت ہے، انسانی خیالات، انسانی جذبات، انسانی دماغ، انسانی عقل وفہم کو انسانی حوادثات میں کوئی دخل نہیں، کشتی حیات حوادث میں قسمت ہی کے بے پناہ تھپیڑوں کے بس میں ہے، مصائب کی بھیانک راتوں میں قسمت ہی انسان کی مددگار ہوتی ہے۔ انسانی ادراک کی پرواز صرف معمولی واقعات کی سطح تک ہوتی ہے اور اس کے آگے ان کی رسائی امرِ محال ہے۔ دنیا کے تمام واقعات صرف قسمت ہی کے ممنوں ہیں عدل وانصاف کا انسانی دنیا میں کوئی دخل نہیں۔ جو ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اور جو ہونے والا ہے وہی ہوگا۔

مگر عقلمندوں کے نزدیک قسمت کوئی چیز نہیں یہ صرف انسانی توہمات کی تصویر کا ایک رُخ ہے یہ صرف لفظوں کا مجموعہ اور انداز بیان کا ہیر پھیر ہے۔ ہم بزرگوں کے مقولوں داناؤں کی تدبیروں اور اگلوں کے خیالات کی پیروی اُسی حد تک کرتے ہیں جہاں تک اُن سے ہم کو فائدہ پہنچ رہا ہو۔ اُنکی اُسی وقت تک قدر کی جاتی ہے جب تک وہ خوشی راحت اور آرام وآسائش کا باعث بن سکیں اور اگر وہی باتیں تکالیف ومصائب کا ذریعہ بن جائیں تو یہ ہماری قسمت کا قصور ہم اپنے مقاصد کی تکمیل میں کامیاب ہو جائیں، تو اس کامیابی کو اپنے شب و روز کی محنت کا ثمر بتاتے ہیں ناکام رہیں تو اس کو قسمت کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

(ادبی دنیا نومبر ۱۹۲۹ء)

(۲) دوستی

عام طور پر جس چیز کو دوستی کا لقب دیا جاتا ہے۔ وہ شراکت سے زیادہ نہیں

ہے۔ایک ایسی شراکت جس میں شرکاء ایک دوسرے کے مفاد کا خیال رکھتے ہیں۔مختصراً دوستی ایک تجارت ہے جس میں خودغرضی اپنا بھلا چاہتی ہے۔دنیا کی اکثر دوستیاں اس جلیل القدر لقب کی مستحق نہیں ہوتیں۔لیکن ہم مجبوراً بعض رابطوں کے لئے یہ نام اختیار کرتے ہیں۔ایک کاروبار ہے۔

جس کا انجام غیر متعین ہے۔جس میں منافعے کی امید کم ہے۔جس میں اکثر فریب سے کام لیا جاتا ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم اپنے عزیز ترین دوستوں کی تکالیف میں بھی اکثر ایسے عناصر پاتے ہیں۔جو ہمارے لئے کرب کا باعث نہیں ہوتے۔

دوستی کے دیرپا نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جسطرح دماغ کے خصائص امتیازی جلدی ہی پہنچانے جاسکتے ہیں۔ اس طرح دل کی مخصوص کیفیات کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

ہم اپنے معتقدات اور جذبات کی رہبری میں زندگی کا راستہ طے کرتے ہیں۔کسی دوست کے فریب میں مبتلا ہو جانا بہت بُری بات ہے۔مگر دوست پر بدگمانی کرنا اس سے بھی بُری بات ہے۔ہم اکثر خیال کرتے ہیں کہ ہم مشاہیر کی عزت کرتے ہیں۔لیکن دراصل ہمارے احساس عزت کی تہہ میں خودغرضی پوشیدہ ہوتی ہے۔ہم ان کی مدد کرتے ہیں۔ان کا تتبع کرتے ہیں۔اس لئے نہیں کہ ہم ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس لئے کہ ہم ان کی مدد کے متمنی ہوتے ہیں۔

ہم اکثر لوگوں کے سامنے اس محبت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔جو ہمارے دوستوں کے دل میں ہماری طرف سے موجود ہے۔مگر اس بات سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ ہم اپنے دوستوں کی وفاداری کی تعریف کریں۔بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ لوگوں کے دل میں ہماری طرف سے عزت اور محبت کا جذبہ پیدا ہو۔

ہم ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہماری تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔مگر ان لوگوں سے نہیں جن کی ہم تعریف کرتے ہیں محبت بہت کمیاب ہے۔مگر دوستی سے زیادہ نادر نہیں۔

عورتیں بہت کم کسی کو دوست رکھتی ہیں۔اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان میں دوستی کا لطیف جذبہ موجود نہیں ہوتا۔بلکہ اس کا باعث یہ ہے کہ جو ایک بار محبت کی رنگینیوں اور شادابیوں کا مزہ چکھ لے اس کے لئے دوستی کے پھیکے جذبات میں کوئی لطف نہیں رہتا۔محبت کی طرح دوستی میں جہل سب سے بڑی نعمت ہے۔دوستی کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ہم اپنے دوست پر اس کے معائب آشکار کردیں۔جدت کی دلکشی۔اور قدیمی رابطوں کی دل آویزی۔دونوں چیزیں دوست کے معائب کو چھپانے کا موجب ہوجاتی ہیں۔

اقبال

(ادبی دنیا دسمبر ۱۹۲۹ء)

(ز) اقبال کا ایک غیر مدون انٹرویو

ڈاکٹر اقبال اور ایک مصری ادیب کا مکالمہ

انگلستان سے واپس آتے ہوئے ڈاکٹر اقبال قاہرہ پہنچے تو مصر کے ایک نوجوان ادیب سیّد فتحی رضوان نے آپ سے ملاقات کی اور مختلف موضوعات پر ڈاکٹر صاحب کے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر اقبال اور سیّد رضوان کا یہ مکالمہ قاہرہ کے جریدے ''البلاغ'' میں شائع ہوا۔ ہم اس کے اہم اقتباسات درج ذیل کرتے ہیں۔ سیّد فتحی رضوان کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر اقبال نے کہا۔

''جسم کی آزادی حقیر و بے وقعت ہے اور معمولی کوشش سے حاصل ہو سکتی ہے برخلاف اس کے روح کی آزادی کے لئے بڑی ہی سخت جدو جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے عقیدہ میں وہ تمام لوگ جو تقلید کرتے ہیں غلام ہیں۔ اگر چہ پوری زمین پر حکومت کرتے ہوں۔ اگر چہ تمام دنیا کے مالک ہوں۔ لیکن وہ شخص جو اپنے عمل میں کسی غیر کی تقلید نہیں کرتا اپنے خیالات میں غیر کے خیالات کا پابند نہیں ہوتا۔ جو اپنی روح کے تابع ہے وہی درحقیقت سچی اور جلیل القدر آزادی کا مالک ہے۔ ہم مشرقی لوگ آزادی سے بہت دور ہیں کیونکہ ہم مغرب کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔

سیّد فتحی: کیا اس دنیا میں کوئی نئی چیز بھی موجود ہے۔ یقیناً دنیا میں کوئی نئی چیز نہیں۔ یہاں جو کچھ ہے محض تکرار اور اعادہ ہے۔ جس دن فرانسیسی انقلابیوں نے مساوات، عدالت، اخوت کے اصول کا اعلان کیا وہ سمجھے کہ انہوں نے انسانوں کو ایک ایسا پیغام پہنچایا ہے جو بالکل نیا کبھی کسی کو ان کی خبر نہیں ہوئی۔ لیکن تاریخ انسانیت نے بار بار یہی اصول دہرائے نہیں ہیں۔ اور کیا صحراِ عرب میں ایک آواز یہ کہتی سنی نہیں گئی تھی

ان اکرمکم عنداللہِ اتقاکُم

ڈاکٹر اقبال: تمہارے جیسے لوگوں کے لئے زندگی ختم ہو چکی ہے۔ تم مستقبل کو نہیں جانتے تم ماضی کے عاشق ہو، تمہارے خیال میں زندگی ایک بند دائرہ ہے۔ جس کا اول و آخر کہیں نہیں معلوم ہوتا حالانکہ زندگی حتیٰ کہ اپنے پست ترین مظاہر میں بھی ایجاد و تخلیق ہے۔ یہی سبب ہے کہ تم مصری لوگ اپنے اجداد فراعنہ کے آثار فخر و مباہات سے دیکھتے اور چلا اٹھتے ہو دیکھو ہم کیا تھے اور کیسے تھے؟ حالانکہ تمہیں اس طرح کی کوئی بات نہیں کہنا چاہیے تھی کیونکہ یہ تمام آثار اور یادگاریں موت کے کفن میں لپٹ چکی ہیں۔ ان پر پوری

چار سو صدیاں گزر چکی ہیں اور ان کے بعد ان جیسی کوئی چیز تم کھڑی نہیں کر سکتے۔ نہیں میرے مہربان مستقبل کا آنگن بہت کشادہ ہے اور ہم تم بھی نئی چیزیں پیدا کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔

ملاقات کے وقت میں نے مسولینی سے ایک بات کہی تھی۔ اس سے تم میرا مطلب اچھی طرح سمجھ لو گے۔ میں نے اُس سے کہا آپ میرے خیال میں وہ عمل انجام دے رہے ہیں جو محمد ﷺ کے عمل سے بہت مشابہ ہے۔ آپ بھی انہی کی طرح نئے اصول اور نئی روح پر ایک مملکت بنا رہے ہیں (معاذ اللہ) لیکن آپ محمد ﷺ سے جتنے قریب ہیں مصطفےٰ کمال پیغمبر عرب ﷺ سے اتنا ہی دور ہو گیا ہے اور یہ میں نے اس بنا پر کہا کہ مسولینی خود اپنے ہاتھ سے راستے بناتا اور اس پر چلتا ہے لیکن مصطفےٰ کمال ایک ایسے راستہ پر چل رہا ہے جو کسی اور نے بنایا ہے۔

سیّد فتحی : میں آپ سے بحث کرنے نہیں آیا بلکہ آپ کے خیالات سننے آیا ہوں البتہ اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ مصری نوجوان اپنے اسلاف پر اس لئے فخر نہیں کرتے کہ اتنا ہی فخر کافی ہے بلکہ انہیں اپنی ذات اپنی قوت، اپنے مستقبل پر بھی فخر ہے۔ کیا آپ نے ہمارے خاموش ابوالہول کو نہیں دیکھا؟

ڈاکٹر اقبال: (زور سے ہنس کر) تمہارا ابوالہول۔

سیّد فتحی : ہاں ہمارا ابوالہول۔ کیا آپ اس پر قبضہ کر لینا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال: نہیں ہرگز نہیں تمہارے ابوالہول پر ہم نہیں زمین کی مٹی قبضہ کرے گی۔

سیّد فتحی : ہرگز نہیں ہمارا ابوالہول ہمیشہ قائم رہے گا۔

ڈاکٹر اقبال: (مسکرا کر) اچھا میرے ایک فارسی قصیدہ کا ترجمہ سنو جو ہماری گفتگو سے ملتا جلتا ہے۔

''ایک کسان اپنے زمیندار کے پاس گیا اور کہنے لگا یہ زمین جس پر میں کھیتی باڑی کرتا ہوں میری ہے وہ میرے سوا کسی کو نہیں جانتی۔ میں ہی اسے جوتتا، بوتا، پانی دیتا ہوں، اس کی پیداوار بچاتا اور کاٹتا ہوں۔ میری پیشانی سے پسینہ ٹپک کر اس میں گرتا اور اسے زندہ کرتا دیتا ہے۔ لیکن تم اپنے گھر میں بیٹھے رہتے ہو نہ اس زمین پر جاتے ہو اور نہ اس میں ہل چلاتے ہو نہ اس پر پاؤں رکھتے ہو۔ پھر وہ زمین تمہاری کیسے ہو سکتی ہے؟ زمیندار یہ سُن کر مسکرایا اور کہنے لگا بے وقوف وہ زمین میری ہے۔ میرے پاس اس کی دستاویز موجود ہے۔ تمام دنیا اور حکومت کے سامنے میری ملکیت کو ثابت کر سکتی ہے لہذا زمین

میری ہے صرف میری ہے، کسان نے تعجب سے کہا مگر اس کاغذ کو زمین سے کیا تعلق؟ قلم سے کاغذ پر کچھ لکھ دینے سے کیا ہوتا ہے؟ میں تو خود اس زمین کے صفحے پر روز صبح و شام اپنے ہاتھ اور اپنے ہل سے اپنا حق لکھتا رہتا ہوں۔

آخر زمیندار اور کسان میں یہ طے پایا کہ خود زمین کے پاس چل کر فیصلہ کرا لیں زمین دیر تک چُپ رہی پھر کہنے لگی میں نہیں جانتی میرا مالک کون ہے؟ لیکن یہ ضرور جانتی ہوں کہ تم دونوں میری ملکیت ہو آج نہیں تو کل تم دونوں میری غذا بن جانے والے ہو۔

سیّد فتحی : آپ کا کلام انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ عربی میں اس کا ترجمہ کب ہوگا؟

ڈاکٹر اقبال: میں اتنی عربی نہیں جانتا کہ اپنے اشعار کا ترجمہ کر سکوں۔ پھر شعر کا ترجمہ بہت مشکل ہے۔

سیّد فتحی : نثر میں بھی ہو سکتا ہے کیونکہ شعر کچھ موسیقی تو نہیں ہے۔

ڈاکٹر اقبال: بے شک شعر موسیقی نہیں ہے لیکن اگر شعر اپنی موسیقیت سے محروم کر دیا جائے تو پھر اس میں جان باقی نہیں رہے گی۔

اس کے بعد گفتگو کا پیرائیہ بدل گیا اور سید فتحی رضوان نے کہا سچا ایمان وہ ہے جو دل میں مخفی رہے اور چہرے سے ظاہر نہ ہو۔

ڈاکٹر اقبال: یہ تم کیا کہہ رہے ہو صاحبزادے: بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سچا ایمان اگر دل میں موجود ہوگا تو وہ پورے جسم کو ایک ایسے رنگ میں رنگ دے گا جسے وہ جسم ہرگز نہیں جانتے جو نعمتِ ایمان سے محروم ہیں۔ پھر میں پوچھتا ہوں مومن اپنا ایمان کیوں چھپائے۔ اگر تم مومن ہو تو اپنے ایمان کو آزادی دو کہ تمہارے عمل سے ظاہر ہو۔ تمہاری حرکات و سکنات سے ظاہر ہو۔ تمہاری نگاہوں سے ظاہر ہو، اگر تم اپنے ایمان کو یہ آزادی بخشو گے تو یقین کرو یہ ایمان دوسروں کو بھی اپنا حلقہ بگوش بنا لے گا۔

(زمیندار ۱۰ جنوری ۱۹۳۲ء)

(ح) اخبارِ اقبال

اقبال کے زمانے میں اقبال کی سرگرمیوں اوران کے اسفار کے بارے میں دلچسپ خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان خبروں سے اقبال کے سوانح پر مفید روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں معاصر اخبارات سے چند ایسی ہی دلچسپ خبروں کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

(۱)

حادثۂ جانکاہ ، علامہ اقبال کی بیگم صاحبہ کا انتقال

انتہائی رنج وافسوس اور دلِ اندوہ قلق کے ساتھ یہ الم انگیز اطلاع درجِ اخبار کی جاتی ہے کہ علامہ سر اقبال کی لدھیانہ والی بیگم صاحبہ کا انتقال ۲۱ اکتوبر کو ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحومہ علیل تھیں اور لاہور سے اپنے والدین کے ہاں لدھیانہ تشریف لے گئی تھیں۔ ہفتے کے روز ان کی سخت علالت کا تار لاہور پہنچا اسی روز علامہ اقبال لدھیانہ تشریف لے گئے۔ دوشنبہ کو چار بجے کے قریب علامہ ممدوح کی طرف سے الم انگیز حادثہ کی اطلاع لاہور پہنچی۔

زمیندار کا عملہ ادارت اس جانکاہ حادثہ سے علامہ اقبال کے ساتھ گہری ہمدری کا اظہار کرتا ہے اورتہِ دل سے دست بدعا ہے کہ اللہ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور علامہ ممدوح نیز مرحومہ کے دوسرے خویش واقارب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے (آمین) (زمیندار ۲۴ اکتوبر ۱۹۲۴ء)

(۲)

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اورئینٹل کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ نام کی مماثلت کی وجہ سے اصحاب کو اکثر غلط فہمی لاحق ہو جاتی تھی اور موصوف کی تحریریں علامہ سے منسوب ہو جاتی تھیں۔ اسی طرح کی خبر اس شیخ صاحب کے بارے میں شائع ہوئی جسے لوگوں نے اقبال سے منسوب کر دیا۔ چنانچہ اخبار کو اس امر کی وضاحت کرنا پڑی۔ خبر یہ تھی

"بے سر اقبال"

کل ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ سر ڈاکٹر اقبال پانصد روپیہ پر ملازم ہوئے ہیں جو صاحب اورنٹل کالج لاہور میں ملازم ہوئے ہیں وہ سر نہیں بلکہ صرف محمد اقبال ہیں۔ (اخبار سیاست ۲۵ جون ۱۹۲۵)

(۳)

صوبہ سرحد کا پہلا گورنر

حضرت علامہ اقبال کے تقرر کا امکان

ڈیرہ اسماعیل خان: ۲۴ جنوری صوبہ سرحد کے لئے پہلے گورنر کے تقرر کا مسئلہ حکومتِ ہند کے زیرِ غور ہے۔ سنا جاتا ہے کہ اس منصبِ جلیل کے لئے متعدد امیدوار ہیں۔ یہ بھی افواہ ہے کہ سر ڈیینز برے اور حضرت علامہ اقبال میں کسی ایک کا تقرر اس عہدہ پر عمل میں آنے والا ہے۔

(سیاست لاہور ۲۷ جنوری ۱۹۳۲ء)

(۴)

سر اقبال کو وزیرِ تعلیم مقرر کیا جائے گا

دہلی ۲۸ نومبر: معلوم ہوا کہ سر محمد اقبال کو سر فضلِ حسین کی جگہ حکومتِ ہند میں وزیرِ تعلیم مقرر کیا جائے گا۔ سر فضلِ حسین جنوبی افریقہ جا رہے ہیں۔ گول میز کانفرنس سے سر اقبال کے استعفیٰ کی وجہ یہی بیان کی جاتی ہے۔

(الجمیعۃ یکم دسمبر ۱۹۳۱)

(۵)

علامہ اقبال سکندر آباد میں

سکندر آباد: ۱۴ جنوری آج صبح سر محمد اقبال مدراس میل پر یہاں وارد ہوئے۔ اسٹیشن پر سر اکبر حیدری اور کثیر التعداد اہلکاروں نے آپ کا استقبال کیا آپ ٹاؤن ہال میں عثمانیہ یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام لیکچر دیں گے اور کل علم اور مذہبی تجربات پر تقریر فرمائیں گے۔

(سیاست ۲۸ جون ۱۹۲۹ء)

(٦)

اسپین میں سر محمد اقبال کا لیکچر

قرطبہ کی مسجدِ اعظم اور قصر الحمرا کی زیارت

میڈرڈ: ۲۴ جنوری: میڈرڈ دارالحکومت اسپین کی نیو یونیورسٹی میں ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ایک تاریخی لیکچر دیا۔ قرطبہ کے قصر الحمرا کی طرف اشارہ کر کے آپ نے ہندوستان میں مغلوں اور اسپین میں مورش مسلمانوں کے فنِ تعمیر پر ایک ناقدانہ تبصرہ فرمایا۔ سر محمد اقبال آج کل قرطبہ کی مسجد اعظم اور قصر الحمرا کی زیارت کر رہے ہیں۔ آپ ۱۰ فروری کو وینس سے بمبئی کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔

(الجمعیۃ دہلی ۲۸ جنوری ۱۹۳۳ء)

(۷)

علامہ اقبال کو مہاراجہ میسور کی دعوت

مہاراجہ صاحب میسور کے والیان ریاست میں بہت روشن خیال اور علم دوست حکمران سمجھے جاتے ہیں آپ کے وزیر اعظم دیوان مرزا محمد اسماعیل صاحب کے تدبر اور مہاراجہ کی روشن خیالی کے باعث ریاست میسور بہت تیز رفتاری سے ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ مہاراجہ صاحب کی علم دوستی کا تازہ ترین ثبوت یہ ہے کہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ علامہ اقبال مدراس میں لیکچر دینے کے لئے تشریف لا رہے ہیں اور میسور و بنگلہ بھی آئیں گے تو آپ نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کی وساطت سے علامہ ممدوح کو دعوت دی کہ جب آپ میسور تشریف لائیں تو میرے ہاں قیام فرمائیں حضرت علامہ ۱۰ جنوری کو میسور پہنچیں گے۔

(سیاست ۲۳ دسمبر ۱۹۲۸)

(۷)

ڈاکٹر اقبال کی نظم کابل میں

ماہِ شعبان کے عشرِ آخر میں چند محفلیں اور جشن کی مجلسیں کابل میں منعقد ہوئیں۔ امیر امان اللہ خان نے تمام وزرا، سفراء اور عمائدین شہر و دیگر معززین کو مدعو کیا۔ جلسے کی کاروائی تلاوتِ قرآن کے بعد شروع ہوئی۔ وزیر صاحب نے انعامات ہونہار

طالب علموں میں تقسیم کیے ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کا مشہور قومی ترانہ ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' بچوں نے اپنے پیارے لہجے میں سنایا۔ اس کے بعد فوجی باجے نے اسے دہرایا۔ جس سے حاضرین پر رقت طاری ہوگئی۔

(اخبار کشمیری لاہور ۲۱۔۲۸ مئی ۱۹۳۳)

(۸)

علامہ اقبال کی یورپ سے مراجعتِ وطن

حضرت علامہ اقبال ۲۵ فروری ۱۹۳۳ء کو فرنٹیر میل سے لاہور پہنچے سٹیشن پر عقیدت مندوں کی اس قدر کثرت تھی کہ مصافحہ بھی بہ صد دقت ہوتا تھا۔ خواجہ فیروز الدین صاحب بیرسٹر نے پلیٹ فارم ہی پر جمیعتہ الاسلام کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیا جس میں گول میز کانفرنس میں مسلمانان ہند کے حقوق کی ترجمانی کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ ممدوح سے خطاب کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کا سیاسی نظام ابھی تک اس بات کا متقاضی ہے کہ آپ اس کی تکمیل کے لئے قائدانہ امداد فرماتے رہیں۔ سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے حضرت علامہ نے مسلمانوں کی عزت افزائی و عقیدت مندی کا اعتراف کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اسلام یورپ میں قبولیتِ عام حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور یورپ کا بچہ بچہ مذہب اسلام سے آگاہ ہونے کے لیے بے تاب ہے اور وہ روحانی تشنگی کا ازالہ چاہتا ہے۔ ازاں بعد آپ نے اتحادِ اسلامی کے فقدان کو محسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ خدا کے لئے آپ اپنے تمام اختلافات کو خواہ وہ سیاسی ہوں یا مذہبی بالکل مٹا دیں اور ایک ہو جائیں۔ اس وقت تمام اسلامی سلطنتوں نے بڑی حد تک ان نقائص کو دور کر دیا ہے۔ آپ کو بھی ان کی تقلید کی کوشش کرنی چاہیے۔

(اخبار کشمیری لاہور ۲۸ فروری ۱۹۳۳ء)

(۹)

علامہ اقبال اور چینی ترکستان

چینی ترکستان میں اسلامی آزاد حکومت قائم ہو چکی ہے اس علاقے کے ساتھ روسی ترکستان کی سرحد واصل ہے اور اس کے ساتھ برطانوی ہند کی سرحدیں بھی متصل ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ چینی ترکستان میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے شورائیہ روس سیاسی اصلاحات نافذ کر کے ڈپلومیٹک اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس خطرے کو روکنے کے لئے برطانیہ ہند

کا محکمہ خارجہ اس امر پر غور کر رہا ہے کہ چینی ترکستان میں بالشویک اثرات کا سدِ باب کرنے کے لئے کسی مسلمان کو برطانوی قونصل مقرر کیا جائے اس مقصد کے لئے ڈاکٹر محمد اقبال اور ایک نومسلم انگریز مسٹر آرچی بالڈ کا نام لیا جا رہا ہے اور دونوں نے وسطِ ایشیا کی سیاسیات کا کافی مطالعہ کیا ہے۔

(اخبار کشمیری لاہور ۷ جون ۱۹۳۳ء)

(۱۰)

"ڈاکٹر اقبال کی ایک نظم کا اثر"

جس دل میں نورِ الہیٰ پرتو فگن ہے، جس میں خوفِ خدا جاگزیں ہے ناممکن ہے کہ وہ کوئی درد انگیز واقعہ دیکھ لے یا کوئی سحر آفریں شعر سُن لے اور بے قرار ہو کر تڑپ نہ اٹھے۔ ایسے اشعار اور ایسے واقعات وجدانی نشتر میں حال ہی میں دفتر طریقیت لاہور سے شائع ہوئی ہے بکثرت مل سکتے ہیں۔ مگر آج ہم ایک واقعہ اس اثر اور تڑپ اور دل کے درد کا ناظرین کو سناتے ہیں۔ بیگم صاحبہ بہاول پور (موجودہ خورد سال نواب صاحب کی والدہ معظمہ) نے ایک لوکل زنانہ اخبار کی ایڈیٹر صاحبہ سے اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ جب میں نے علامہ کی نظم "آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ" پڑھی تو میں نے تلیئر، بٹیر، اور چڑیوں کا کھانا چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ جب میں کسی بلبل یا چڑیا کو اسیر دیکھتی ہوں تو میرے دل پر بہت چوٹ لگتی ہے اور فوراً مجھے یاد آجاتا ہے۔

آزاد کر دے مجھ کو او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

فرمایا کہ ایک دن میرے دستر خوان کے لئے بہت تلاش سے خاص فرمائش کے ساتھ بے موسم کے تلیئر منگوائے گئے اور میرے ملاحظہ کے لئے پیش ہوئے وہ بے چارے بندھے ہوئے بہت جدو جہد کر رہے تھے اور پھڑ پھڑا رہے تھے کہ کسی نے مندرجہ بالا شعر پڑھ دیا۔ میں نے ساری نظم پڑھوا کر سُنی تو دل پر بہت اثر ہوا اور اسی وقت تمام تلیئروں کو آزاد کر دیا۔ کیا خوش نصیب ہے وہ شاعر جس کے ایک شعر میں وہ جوش وہ اثر اور وہ درد ہے کہ شکاری اپنے شکار کو قاتل، اپنے بسمل کو اور آزاد ایک قیدی کو بغیر نمائش تحریک کے چھوڑ دیتا ہے۔ اور مبارک ہے وہ دل جس میں اثر پذیر جذبات اور رحم دل اور نیکی کے احساسات ہوں۔

(اخبار کشمیری لاہور ۲۱ دسمبر ۱۹۱۵ء)

(۱۱)

مرنے سے پیشتر قرطبہ ضرور دیکھو

علامہ سر اقبال آج کل ہسپانیہ (اندلس) کی سیاحت کر رہے ہیں۔ آپ ہسپانوی وزیر تعلیم اور پروفیسر آسن جیسے مصنفین کی ساتھ ملاقاتیں کر چکے ہیں۔ جنہوں نے اسلام کے متعلق کتابیں تصنیف کی ہیں۔ صدر جمہوریہ کے ساتھ ملاقات کرنے کے بعد سر اقبال قرطبہ اور غرناطہ تشریف لے جائیں گے۔ آپ کا قول ہے کہ "مرنے سے پیشتر قرطبہ ضرور دیکھو"۔

(پیسہ اخبار ۹ فروری ۱۹۳۳)

(۱۲)

دائرہ ادبیہ پشاور کا اجلاس

نو بجے شب دائرہ ادبیہ پشاور کا ایک جلسہ عام اپنے سرپرست خصوصی شاعر مشرق حضرت علامہ سر محمد اقبال کی تعزیت میں زیرِ صدارت آنریبل ملک خدا بخش خان اسپیکر لیجسلیٹو اسمبلی، میونسپل پارک میں منعقد ہوا حاضرین کی تعداد پانچ ہزار کے قریب تھی سب سے پہلے حافظ نور احمد نے قرأت کے ساتھ تلاوتِ قرآن مجید فرمائی۔ اس کے بعد سید عاجز صاحب نے علامہ مرحوم کی مشہور نظم "یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے" اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ پڑھ کر سنائی۔ اس وقت سامعین پر ایک وجد سا طاری تھا کئی ایک اہل درد پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ ناظم ادارہ جناب عبدالودود قمر بی اے نے اپنے عہدِ طالب علمی میں علامہ مرحوم سے ملاقاتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ آپ باوجود ایک سرتاج اور مختار ہستی ہونے کے کس قدر منکسر المزاج واقع ہوئے تھے۔

شعراء حضرت نے اپنے اپنے مراثی نہایت درد انگیز لہجہ میں پڑھ کر سنائے۔ جن میں سے ضیا جعفری، جناب نذیر مرزا برلاس، جناب غلام صمدانی، قمر ضیائی، جناب سید شاکر صاحب بغدادی، جناب سیّد عاجز صاحب، جناب تاثیر قریشی ضیائی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

جلسہ میں بزم سخن پشاور نے بھی شرکت کی۔ جناب مبارک عشرت نائب ناظم بزم سخن نے اپنی پرسوز نظم سے سامعین کو مسحور کیا۔ مقررین میں سے خان صاحب اورنگ زیب خان اور خان صاحب پیر بخش خان ایم اے، ایل ایل بی نے علامہ مرحوم کی زندگی کے مختلف شعبوں پر مبسوط تقریر کی۔ ان کے بعد خان عبدالرب نشتر بی اے، ایل ایل بی نے علامہ

مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔۲-1/2 11 بجے شب جبکہ شرکاء نہایت جوش و خروش سے تقریریں کر رہے تھے اور حاضرین ہمہ تن گوش بیٹھے تھے کہ اچانک بارش شروع ہوگئی اور مجبوراً جلسہ برخاست کرنا پڑا اور حاضرین افسوس کے ساتھ بادل نخواستہ رخصت ہوئے ابھی ڈیڑھ گھنٹہ کا مزید پروگرام باقی تھا۔ شعرا حضرات میں سے کئی ایک کا کلام نہ پڑھا جاسکا اور خاص کر صدر آنریبل ملک خدا بخش صاحب کے خطبہ صدارت سننے کی سب کو حسرت ہی رہی۔ صوبہ سرحد میں آج تک ایسا بے نظیر اجتماع دیکھنے میں نہیں آیا۔

سید فارغ بخاری

جائنٹ سیکریٹری دائرہ ادبیہ پشاور

(مدینہ بجنور ۹ مئی ۱۹۳۸ء)

(۱۴)

ڈاکٹر اقبال کے مجموعہ کلام کی اشاعت کا اہتمام

اکثر احباب ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم اے، پی۔ ایچ ڈی، بیرسٹرایٹ لا لاہور کا کلام منگوانے کے خواہش مند رہتے ہیں ان کی اطلاع کے لئے اب لکھا جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے مجموعہ کلام کو جس میں ان کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ نظمیں شامل ہیں نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کے بعد اپنے ہی اہتمام میں چھپوانے کا انتظام فرما رہے ہیں۔ چنانچہ کتابت شروع ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ دو ماہ تک مجموعہ مذکورہ کا نفیس و نادر ایڈیشن پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔ ڈاکٹر اقبال کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب ان کے نام ہی میں ایک کشش ہے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے وہ انسان کے پاک ترین قومی و مذہبی جذبات کے چمنستان کی سیر میں مصروف رہ کر وہ نقش و نگار پیش کرتے ہیں کہ عقل دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے کبھی وہ نالۂ یتیم بن کر رُلاتے ہیں کبھی پیغام سروش کی صورت میں جوش و ولولہ پیدا کرتے ہیں کبھی شکوہ اور جواب شکوہ کے پردہ میں وہ راز و نیاز ظاہر کرتے ہیں کہ کراماً کاتبین راہم خبر نیست کا مقولہ صادق آتا ہے☆

(اخبار کشمیری لاہور ۱۴ مارچ ۱۹۱۵ء)

☆ بعد کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اپنا اُردو مجموعہ ۱۹۱۵ء میں نہ لا سکے اور اس کے لئے قارئین کو مزید نو برس انتظار کرنا پڑا۔ (ادارہ)

اقبال .... فیض احمد فیض

(یہ نظم فیض صاحب کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے) یہ ان کے زمانہ طالب علمی کی ایک نظم ہے فیض صاحب اُس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے طالب علم تھے۔

زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظارِ موت کرتا تھا
بساطِ دھر پر گویا سکوتِ مرگ طاری تھا
رگِ مشرق میں خون زندگی تھم تھم کے چلتا تھا
فضا کی گود میں چپ تھے ستیز انگیز ہنگامے
سنی واماندۂ منزل نے آواز درا آخر
مئے غفلت کے ماتے خوابِ دیرینہ سے جاگ اٹھے
''عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا''
زمیں سے نوربانِ آسمان پرواز کہتے تھے
نبود و بود کے سب راز تونے پھر سے بتلائے
ہر ایک قطرے کو وسعت دے کے دریا کر دیا تونے
فروغ آرزو کی بستیاں آباد کر ڈالیں
طلسم کن سے تیرا نغمۂ جاں سوز کیا کم ہے

عمل کی آرزو باقی نہ تھی بازوئے انسان میں
صدائے نوحہ خواں تک بھی نہ تھی اس بزم ویراں میں
خزاں کا رنگ تھا گلزارِ ملت کی بہاروں میں
شہیدوں کی صدائیں سو رہی تھیں کارزاروں میں
ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحر خاموشی
خودآگاہی سے بدلی قلب و جاں کی خود فراموشی
فسردہ مشت خاکستر سے پھر لاکھوں شرف نکلے
یہ خالی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے
ہراک فطرت کو تو نے اسکے امکانات جتلانے
ہر ایک ذرے کو ہمدوش ثریا کر دیا تونے
زجاج زندگی کو آتش دوشیں سے بھر ڈالا
کہ تونے صد ہزار افیونیوں کو مرد کر ڈالا

راوی۔ فروری ۱۹۳۳ء

آج بھی کیوں زیست کا چہرہ نہیں نکھرا ہوا — کیوں سکونِ دل کا شیرازہ ہے یوں بکھرا ہوا
بندہ وصاحب کے افسانے ہیں کیوں ابتک وہی — آدمیت آج بھی ہے کیوں شکارِ گمرہی
کیا نظامِ نو کی بنیادیں بھی ڈھانی ہیں ہمیں — کیا بغاوت کی نئی اقدار پانی ہیں ہمیں؟

پھر لبِ ماحول پر ہے نام آج اقبالؒ کا
انقلاب تازہ ترعنواں ہے استقبال کا

چٹان ۲۵ اپریل ۱۹۴۹ء

اقبال کا پہلا اُردو مرثیہ

اکبرلاہوری علامہ اقبال کی رحلت کے بعد ان کے جنازے میں شریک تھے۔ یہ اشعار جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے لکھے گئے۔ یہ مرثیہ عین اُس وقت مکمل ہو گیا جب تدفین مکمل ہوئی۔ اس لحاظ سے اس مرثیہ کو اُردو یا کسی بھی زبان میں اقبال کا پہلا مرثیہ کہنا چاہیے۔

آج وہ مردِ خوش بیاں چپ ہے — جس کی چپ سے بس اک جہاں چُپ ہے۔
فلسفے کا دماغ مختل ہے — شاعر مہر بر زباں چپ ہے۔
ہے فصاحت جو سر بہ زانوئے غم — تو بلاغت بھی نیم جاں چپ ہے۔
لالہ و گل کا ترجماں نہ رہا — سخت صدمہ ہے گلستاں چپ ہے۔
آج چپ لگ گئی ستاروں کو — جن کی گردش کا رازداں چپ ہے۔
بزمِ الفت میں ہو کا عالم ہے — ایک شوریدہ داستاں چپ ہے۔
ہو گیا سرد عشق کا بازار — کہ وہ سوداگرِ زباں چپ ہے۔
محفل نعت ہو گئی سُونی — کہ محمد ﷺ کا مدح خواں چپ ہے۔
کیوں نہ غم سے نڈھال ہو وہ قوم — جس کی عزت کا پاسباں چپ ہے۔
مل گیا خاک میں غرورِ حیات — جس کی عظمت کا ترجماں چپ ہے۔

روشنی کو زوال ہے اکبر
کہ وہ شیدائے داستاں چپ ہے

(اکبرلاہوری) بحوالہ حمایت علی شاعر

اقبال

فارغ بخاری

اے شہنشاہِ سخن اے تاجدارِ شاعری
حضرتِ اقبال اے پروردگارِ شاعری

سالکِ راہِ ہدیٰ خضرِ صراط المستقیم
تجھ کو بخشا تھا خدا نے جوہرِ عقلِ سلیم

سرمدی نغموں سے تھا معمور تیرا سازِ عشق
آشکارا کر دیا عالم پہ تو نے رازِ عشق

اے مسیحائے سخن اے ناخدائے زندگی
تیری ہر لے میں تھی پوشیدہ نوائے زندگی

خضر کی تعلیم اس پیرائے میں دیتا تھا تو
دل امیروں اور شہنشاہوں کے موہ لیتا تھا تو

چھیڑتا تھا تو رگِ جاں نشترِ کلمات سے
ہم سخن بندوں کو کرتا تھا خدا کی ذات سے

اپنی اس خواری پہ شکوہ سنج تھا یزداں سے کبھی
خود فراموشی پہ نالاں تھا مسلماں سے کبھی

تیری لے بانگِ درا تھی کارواں کے واسطے
تیرے نغمے روح پرور تھے جہاں کے واسطے

کر دیا افسوس تجھ کو موت نے ہم سے جدا
بجھ گیا افسوس اپنی بزمِ عشرت کا دیا

کون دے گا آ کے اب وہ درسِ قرآنی ہمیں
کون سکھلائے گا آئینِ جہانبانی ہمیں

کون آ کر اب بتائے گا ہمیں رازِ خودی
کون اب چھیڑے گا آ کر بربطِ سازِ خودی

کون دے گا آ کے اب پیغامِ آزادی ہمیں
کون دے گا بادۂ گلفامِ آزادی ہمیں

کون اب روشن کرے گا علم و حکمت کے چراغ
اب کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں گے مشرق کے چراغ

غیر کے مدِ مقابل کس کو لے جائیں گے ہم
کس جگہ اقبال تجھ کو ڈھونڈنے جائیں گے ہم

موت تیری اصل میں اسلام کے اعضا کی موت
موت تیری فی الحقیقت ملتِ بیضا کی موت

موت تیری ایشیا میں روحِ آزادی کی موت
ہندیوں کے واسطے ہے نوحِ آزادی کی موت

موت تیری ارتقا کی موت بیداری کی موت
موت تیری جذبۂ ایثار و غم خواری کی موت

موت تیری ہے جہاں میں رہبرِ کامل کی موت
موت تیری ایک خضرِ جادۂ منزل کی موت

موت تیری میکدے کی جام کی مینا کی موت
اے کلیمِ عصر تیری موت ہے سینا کی موت

موت تیری قبلۂ اہلِ ہنر کی موت ہے
موت تیری ہند کے قلب و نظر کی موت ہے

جونفشاں ہے تیرے غم میں دیدۂ غمناک دیکھ
مسلمِ ہندی کا آکر سینۂ صد چاک دیکھ

دیکھ آکر قوم کی یہ آہ وزاری اضطرب
کھول کر آنکھیں خدارا دیکھ دورِ انقلاب

آ کہ تیری جانفشانی یاد آتی ہے ہمیں
یاد تیری خون کے آنسو رُلاتی ہے ہمیں

اب تجھے سمجھا ہے ہم نے قوم کے غم خوار آ
قدر تیری ہم نے جانی سیّد الاحرار آ

ملتِ اسلام کے اے قافلہ سالار آ
پھر غلام آباد میں بہرِ خدا اکبار آ

اب تجھے دیکھیں گے ہم اپنا سہارا جان کر
اب تجھے دیکھیں گے ہم آنکھوں کا تارا جان کر

(رسالہ نغمۂ حیات پشاور جولائی ۱۹۳۸ء)

اقبال کی وفات پر فارغ بخاری کے تاثرات

اقبال کی موت

۱۹۳۸ء کا منحوس سال دنیائے ادب کے لئے ایک دل گداز اور روح فرسا واقعہ کو لے کر وارد ہوا اردو علم وادب کے ایوان میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ جس وقت یہ خبر سُنی گئی کہ بنی نوع انسان کی آنکھون کا تارا اقبال اس دنیا کو چھوڑ کر چلا گیا اقبال کی موت نہ صرف ایک شاعر کی موت ہے بلکہ ایک شاعرِ عظیم کی موت، ایک بے مثال مفکر کی موت، منتشر اور آوارہ ذہنیت ہندوستانیوں کو جادۂ مستقیم پر چلانے والے کی موت، حکیمِ مشرق کی موت، مسلمانوں اور اسلام کے آخری نوحہ خوان کی موت ۔ذرے ذرے کو زندگانی کے فلسفے سے روشناس کرانے والے کی موت ہے۔ ہندوستان میں بالعموم اور مسلمانانِ ہند میں بالخصوص پہلے ہی کیا کم قحط الرجال تھا کہ موت نے ''اقبال'' جیسے مردِ خدا اور روحِ ہندوستان کو ہم سے چھین لیا۔ ہندوستان قیامت تک دوسرا اقبال پیدا نہ کر سکے گا۔

جی تو یہی چاہتا تھا کہ نغمۂ حیات کا پہلا زمزمہ اقبال کی ہوش ربا موت کی وجہ سے سازِ درد کی صورت اور اقبال نمبر کی حیثیت میں پیش ہوتا لیکن ابتدائی مشکلات اور واقعات اس کے متحمل نہ ہو سکے۔ اگر حوادثاتِ زمانہ سے بچ کر ہمارا یہ ننھا پودا پھلا پھولا تو انشاء اللہ العزیز مستقبل قریب میں اس کا پہلا نمبر علامہ مغفور کی یادگار کے طور پر پیش کیا جائے گا۔

(نغمۂ حیات جولائی ۱۹۳۸ء)

ملفوظاتِ اقبال

(اقبال کے ہم جلیس، ملاقاتیں، یادداشتیں)

اقبال کی وفات پر پہلا فارسی مرثیہ

آہ علامہ سر محمد اقبال نور اللہ مرقدہٗ

مولانا مدرار اللہ مدرار منشی فاضل مصنف بینات مردان

بر بہارستانِ ہند آمد خزاں — بلبل و گل گشت مصروفِ فغاں
منظرِ گلشن کہ دل آفروز بُود — شد ہنوز از برگ ریز آشوب جاں
ہر طرف قمری نوائے غم زند — عندلیب از ہجرِ گل نوحہ کناں
آہ آں سلطانِ اقلیم سخن — حضرت اقبال میرِ کارواں
آہ آں خورشید گردونِ جلال — در شبستانِ بقا شد جاوداں
داد مشرق را پیامِ زندگی — آشکارا کرد اسرارِ نہاں
شمعِ دین افروخت بر دنیاۓ نو — داد بر تصدیق ملت صد نشاں
شعر را جزوِ نبویت بنگر یست — بحرِ حکمت بود شعرش بیگماں
در چنیں الحاد پرور دورِ ہند — بود دینِ مصطفٰے را پاسباں
آہ ایں نایاب انساں رفت رفت — حسرت و غم میکند ہندوستاں

با خدا مدرار گوید ایں دعا
رحمتے فرما بذاتش بیکراں

ہفتہ وار المشرقی پشاور ۲۳ مئی ۱۹۳۸ء

ڈاکٹر محمد اقبال کی ترجیعات و تنقیدات

مولانا حکیم فضل الرحمان
صاحب مرحوم
متوطن آمبور۔ مدارس

موصوف سلمان علی لیکچرار شعبہ اُردو
اسلامیہ کالج پشاور کے نانا تھے اور تھانہ
(مالاکنڈ) سے تعلق رکھتے تھے۔

ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر محمد اقبال علیہ الرّحمۃ بڑے جوشیلے اور جذباتی آدمی تھے، جب کبھی اپنے نظریئے کے خلاف کسی میں کوئی بات دیکھ لیتے تو فوراً جوش میں آکر اُس پر تنقید فرماتے، چونکہ وہ صرف جوشیلے اور جذباتی تھے ضدی نہ تھے، اس لیے پھر اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ میں غلطی پر ہوں یا یہ معلوم ہو جاتا کہ لوگ ان کی تنقید کو پسند نہیں کرتے تو فوراً اس سے رجوع فرماتے اور آئندہ اشاعت سے اس تنقید کو خارج کر دیتے، اس موقع پر میں چند تنقیدات و ترجیعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

1۔ ڈاکٹر محمد اقبال کہ پہلی تصنیف مثنوی اسرارِ خودی ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی تھی، میں نے جب اخبارات میں اس کا ذکر دیکھا تو فوراً اُسے منگوالیا اور غور سے دیکھا، اُس میں دو تنقیدیں تھیں، ایک تو خواجہ حافظ شیراز پر اور دوسری صوفیائے کرام پر، حافظ شیراز پر بہت سخت تنقید تھی، پینتیس عدد اشعار اس بارے میں درج تھے، یہ تنقید مجھے سخت ناگوار گذری، فوراً ایک خط جناب ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں لکھا کہ کتاب اچھی ہے، لیکن خواجہ حافظ پر جو تنقید ہے وہ ٹھیک نہیں ہے، صوفیائے کرام پر جو تنقید تھی اس کا جواب خواجہ حسن نظامی نے اپنے ماہانہ رسالہ نظام المشائخ میں بہت بسط اور شرح کے ساتھ دیا پھر اس کا جواب ڈاکٹر صاحب نے اخبار وکیل امرتسر میں دیا، اسی طرح تین بار جواب خواجہ حسن نظامیؒ نے دیا اور تین بار ڈاکٹر صاحب نے جواب لکھا، یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ مجھے اپنے وطن سوات جانے کی ضرورت پڑی چنانچہ ماہِ اگست ۱۹۱۷ء میں لاہور پہنچا اور جناب ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے جو خط در بارۂ تنقیدی اشعار بابت خواجہ حافظ شیراز لکھا تھا اس کا جواب نہیں آیا، آپ نے فرمایا کہ اس قسم کے متعدد خطوط ہند اور بیرونِ ہند سے آئے ہیں ایک خط جو لندن سے مشیر حسین قدوائی نے انہیں لکھا تھا اور اُسی دن انہیں ملا تھا نکال کر سنایا انہوں نے لکھا تھا کہ مثنوی اسرارِ خودی کو میں نے پڑھا کتاب بہت بہتر ہے، لیکن خواجہ حافظ شیراز پر جو تنقید ہے وہ

درست نہیں ہے، پھر جناب ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جب لوگ پسند نہیں کرتے تو آئندہ اڈیشن سے اُن اشعار کو خارج کردوں گا، لوگوں کی خاطر مجھے ایسا کرنا پڑے گا۔ ورنہ حافظ شیراز کے متعلق میرا نظریہ وہی ہے جس کا اظہار میں نے تنقیدی اشعار میں کیا ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ حافظ نے اپنی ہستی کا ستیاناس کر دیا۔ معشوق کے سامنے اپنے آپ کو کُتّا ثابت کر دیا ہے، چنانچہ انہوں نے یہ شعر سنا دیا

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی

چرا بگر دنِ حافظ نمی نہی رسنے

میں نے کہا کہ یہ شعر مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اے خدا میں نے سنا ہے کہ تم فُساق و فجار کو اپنی آغوشِ رحمت میں لیتے ہو۔ حافظ جو فاسق و فاجر ہے اُسے کیوں اپنی آغوشِ رحمت میں نہیں لیتے، یہ سن کر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ آپ تو خاص آدمی ہیں مگر معاملہ تو عوام سے ہے، میں نے کہا کہ دیوانِ حافظ بھی تو عوام کی چیز نہیں، بلکہ خواص کی ہے، آپ نے فرمایا کہ اطمینان رکھیئے میں ضرور اِن تنقیدی اشعار کو حذف کردوں گا، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے متذکرہ بالا تنقیدی اشعار کو مثنوی "اسرارِ خودی" سے خارج تو کر دیا مگر حافظ کے متعلق ان کا جو نظریہ ہے اس میں کوئی فرق نہیں آیا، اگرچہ حافظ کو انہوں نے تنقیدی اشعار میں جادو بیان کہا ہے لیکن دونوں کے نظریہ کے اختلاف کی وجہ سے ان کا دل حافظ کے متعلق صاف نہیں ہوا، کئی بار انہوں نے حافظ کے اشعار پر تضمینیں کی ہیں مگر حافظ کا نام نہیں لیا" کلیات" میں "نصیحت" کے عنوان سے جو نظم ہے اُس میں اخیر کا شعر حافظ کا ہے

عاقبت منزلِ ما وادیِ خاموشا نست

حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

خطاب بہ نوجوانانِ اسلام میں یہ مصرعہ حافظ کا ہے۔

"باب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبارا"

قرب سلطان کی نظر میں یہ مصرع حافظ کا ہے۔

"گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش"

اور یہ شعر بھی حافظ کا ہے:

محل نورِ تجلّی است رائے انور شاہ

چو قرب روطلبی درصفا ئے نیت کوش

ارتقاء کے عنوان سے جو نظم ہے اُس کا دوسرا مصرعہ بادنیٰ تصرف حافظ کا ہے۔ ع

''چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی''

ایک خط کے جواب میں جو نظم ہے اس میں اخیر کا شعر حافظ کا ہے۔

گرت ہوا ست کہ با خضر ہم نشین باشی

نہاں چشم سکندر چوں آبِ حیواں باش

اسیری کے عنوان سے جو نظم ہے اس کا آخری شعر حافظ کا ہے۔

شہپرزاغ وزغن زیبائے قیدو صید نیست

کیں سعادت قسمت شہباز وشاہیں کردہ ند

طلوعِ اسلام کے عنوان سے جو نظم ہے اس کا اخیر شعر حاؔفظ کا ہے۔

بیا تا گل بفیشانیم و مے در ساغر اندازیم

فلک راسقف بشگافیم وطرح دیگر اندازیم

ظریفانہ نظم کے عنوان سے جو نظم ہے اس کا آخری شعر حاؔفظ کا ہے۔

دلق حاؔفظ بچہ ازرو بہ میش رنگیں کُن

وانگہش مست و خراب از رہ بازار بیار

میرے حافظہ میں جو نظمیں تھیں اور جن میں حافظ کے اشعار پر تضمینیں تھیں انہیں میں نے لکھا ممکن ہے کہ اور تضمین بھی ہو لیکن مجھے اُن کا علم نہیں ہے اور شعر کے اشعار پر بھی ڈاکٹر اقبال نے تضمینیں لکھی ہیں، اُن شعراء کا نام صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے مثلاً فرماتے ہیں:۔ تضمین بر شعر انیسؔی شاملو

وفا آموختی ازمابکارِ دیگراں کر دی

ربودی گوہرے ازنثار دیگراں کردی

تضمین بر شعر صائب ؎

ہماں بہتر کہ لیلیٰ دربیاباں جلوہ گر باشد
ندار د تنگنائے شہر تاب حسن صحرائی

تضمین برشعر مرزا بیدلؔ۔

باہر کمال اند کے آشفتگی خوش ست
ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنون مباش

تضمین برشعر ملک قمیؔ ۔

رفتم کہ خار از پاکشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم وصد سالہ راہم دور شد

فردوس میں مکالمہ کے عنوان سے جو نظم ہے اس کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں شیخ سعدی شیرازی کا نام ہے اور دوسرا شعر تو سعدیؔ کا ہے

اے آنکہ ز نورِ گہر نظم فلک تاب
درمن بچراغِ مہ داختر زدۂ باز

اخیر کا شعر بھی سعدیؔ شیرازی کا ہے

خرمانتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبانتواں یافت ازاں پشم کہ رشتیم

اب دوسری تنقید اور ترجیع ملاحظہ فرمایئے:۔

نمبر۲۔ دسمبر ۱۹۲۰ء کے اخیر ہفتہ میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں زیرِ صدرات دجے رکھواچاریہ منعقد ہوا تھا جس میں مہاتما گاندھی کا نان کوآپریشن والا ریزدلیوشن پاس ہوگیا تھا جس کی مخالفت قائداعظم محمد علی جناح نے کی لوگوں نے ان پر شیم شیم کی آوازیں کسی تھیں، میں نے بھی زور زور سے شرم شرم کی آوازیں بلند کی تھیں، جناح صاحب اُسی وقت کانگریس سے نکل گئے، ہندوستان میں اب کوئی ادارہ اُن کے لیے نہیں رہا، مسلم لیگ تو مرچکی تھی، اس کی جگہ خلافت کانگریس کام کررہی تھی۔ مجبور ہوکر آپ لندن تشریف لے گئے، سات آٹھ مہینہ کے بعد لندن سے واپس آکر اکتوبر ۱۹۲۱ء میں بمبئی میں اعلان کردیا کہ لیگ کو پھر زندہ کردینا چاہیے، اس اعلان سے ڈاکٹر اقبال بہت برہم ہوئے اور فوراً تنقیدی

قطعہ ارشاد فرمایا، جو صدائے لیگ کے عنوان سے روزنامہ زمیندار مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ اُس وقت کے تمام اردو اخبارات نے نہایت شاندار طریقے سے شائع کیا اور بہت سے لوگوں کی وردِ زباں رہا، وہ قطعہ یہ ہے جو اس وقت میری نوکِ زبان ہے، صدائے لیگ (از ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر محمد اقبالؒ)

لندن کے چرخِ نادرہ فن سے پہاڑ پر	اُترے سیرح کے محمد علی جناح
نکلے گی تن سے تو کہ رہے گی بتا ہمیں	اے جان کہ برلب آمدہ اب تیری کیا صلاح
دل سے خیال دشت و بیاباں نکال دے	مجنوں کے واسطے ہے یہی جادۂ فلاح
آغا امام اور محمد علی ہے باب	اس دین میں ہے ترکِ سوادِ حرم مباح
بشریٰ لکم کہ منتظر مارسیدہ ہست	یعنی حجابِ غیرتِ کبریٰ دریدہ ہست

روزنامہ ''زمیندار'' مورخہ 9 نومبر ۱۹۲۱ء

میں نے علامہ کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ قطعہ تو بہت اچھا ہے لیکن جناح صاحب پر سخت تنقید غیر مناسب ہے، تمام لوگ قطعہ کو بہت پسند کر رہے ہیں مگر میں اس کے بارے میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں میں بھی آپ کی طرح جناح صاحب کا مخالف ہوں، ناگپور میں کانگریس کے اجلاس میں جب ان پر شیم شیم کی آوازیں کسی گئیں تو میں نے بھی زور زور سے شرم شرم کی صدا بلند کی، میں پکا خلافتی اور کانگریسی ہوں اور وہ ان دونوں کے سخت خلاف ہیں، لیکن انہوں نے ۱۹۱۸ء میں جو بہت اہم کام انجام دیا ہے اس کا اثر میرے دل و دماغ پر بہت زیادہ ہے ۱۹۱۰ء میں وزیر ہند لارڈ مانٹیگو جب ہندوستان آئے تھے، اور پورے ملک کا انہوں نے دورہ کیا تو ایک رپورٹ لارڈ چمسپو اور مانٹیگو کے نام سے مرتب کی گئی جس میں سفارش کی گئی تھی کہ ہندوستان میں کافی صلاحیت ہے اس لیے اسے اصلاحات ملنی چاہئیں اس رپورٹ کی تائید تمام صوبجات کے گورنروں اور لفٹنٹ گورنروں نے کی۔ لیکن بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگٹن نے اس کی مخالفت کی کہ ہندوستان میں اصلاحات کی قابلیت نہیں ہے۔ ولنگٹن کے اس رویہ کی کسی نے مخالفت نہیں کی صرف مسٹر محمد علی جناح (۲) ہی تھے جنہوں نے مشرح اور غیر مبہم الفاظ میں مخالفت کی۔ اور لارڈ ولنگٹن کو دشمنِ ہند کہا کہ ایسے دشمنِ ہند گورنری کے لائق نہیں ہیں، حکومت برطانیہ کو چاہئے کہ وہ انہیں واپس بلائے، جب لارڈ ولنگٹن کی میعاد گورنری ختم ہوئی اور وہ لندن جانے لگے تو بمبئی کے کارپوریشن کی جانب سے لارڈ موصوف کے اعزاز میں جلسہ منعقد ہوا، اس موقعہ پر مسٹر محمد علی جناح اور ان کی بیوی نے کالی جھنڈیوں سے لارڈ ولنگٹن کا استقبال کیا، غیر قوم میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہو سکی، لہٰذا میں آپ کی خدمت میں باادب

التماس کرتا ہوں کہ ازراہِ کرم اس قطعہ کو اپنے مجموعہ اشعار سے خارج کر دیجئے گا۔

خط لکھے دو ہفتے کے بعد جناب ڈاکٹر اقبال کا نوازش نامہ موصول ہوا جس میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ واقعی جوش میں آ کر میں نے چند تنقیدی اشعار لکھ دیئے ہیں لیکن آپ کے خط نے میرے جوش کو فرو کر دیا، میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے بروقت مجھے متنبہ کر دیا، آپ کے سوا اور کسی نے مجھے نہ لکھا ہے اور نہ کسی نے زبانی ہی کچھ کہا ہے، اس بارے میں لکھنے والے آپ فردِ واحد ہیں، اطمینان رکھیئے کہ میں نے اُن اشعار کو آپ ہی کے کہنے سے اپنے مجموعہ اشعار سے خارج کر دیا ہے۔

۱۹۲۸ء میں جناب ڈاکٹر اقبال صاحب مدراس تشریف لائے تھے تو میں اُن سے ملنے کی غرض سے مدراس گیا اور جناب یعقوب حسن سیٹھ صاحب کی معیت میں اُن سے مِلا، سیٹھ صاحب نے میرا تعارف اُن سے کرانا چاہا آپ نے فرمایا "میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں، یہ اہل ایمان میں سے ہیں"

جہاں میں اہلِ ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر نکلے ادھر ڈوبے ، ادھر ڈوبے ادھر نکلے

اور پھر فرمانے لگے، ۱۹۱۷ء میں آپ لاہور آ کر مجھ سے ملے ہیں، میں نے اسرارِ خودی میں جو تنقید خواجہ حافظ پر کی تھی اُس بارے میں آپ نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اُن تنقیدی اشعار کو مثنوی اسرارِ خودی سے خارج کر دوں چنانچہ اُن کے کہنے سے میں نے اُن اشعار کو خارج کر دیا پھر ۱۹۲۱ء میں مسٹر محمد علی جناح صاحب پر چند اشعار بطورِ تنقید کہے تھے جن کو تمام اخبارات نے شائع کیا تھا، اُس بارے میں آپ کا ایک خط آیا تھا کہ ان اشعار کو اپنے مجموعہ سے خارج کرو، میں نے ان کے لکھنے سے اُن اشعار کو اپنے کلیات سے خارج کر دیا، میں جانتا ہوں یہ افغان ہیں، جب کسی بات کے پیچھے لگ جاتے ہیں جب تک اسے حاصل نہیں کر لیتے چین سے نہیں بیٹھتے

اب ایک تیسری تنقیدی ملاحظہ فرمایئے۔

نمبر 3۔ ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ نے پُل بنگش کے پاس رات کے وقت ایک جلسہ میں تقریر کی تھی جس میں فرمایا تھا کہ آج کل اقوام وطن سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں بنتیں، جلسہ میں اخبار "الامان" کا نامہ نگار بھی تھا اس نے پوری رپورٹ مولوی مظہر الدین شبیر کوٹی کو سنائی، چونکہ مولوی مظہر الدین مولانا مدنی کے سخت مخالف تھے اس لئے انہوں نے جناب ڈاکٹر اقبال سے جو اسی دن لاہور سے دہلی آئے تھے کہا کہ رات کے جلسہ میں مولانا مدنی نے کہا ہے کہ ملّتیں وطن سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں بنتیں۔ چونکہ یہ بات ڈاکٹر اقبال کے نظریّے کے سخت خلاف تھی

اس لئے جوش میں آکر مولانا مدنی پر سخت تنقید کی جس کا اظہار اس قطعے میں کیا گیا ہے۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
زدیو بند حسین احمد، ایں چہ بو العجبی است
سرود بر سر ممبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد ﷺ عربی است
بہ مصطفیٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

جب حضرت مولانا مدنی کی نظر سے یہ قطعہ گذرا تو آپ نے اخبارات میں بیان شائع کروادیا کہ میں نے ملّت کا لفظ نہیں استعمال کیا ہے بلکہ قوم کا لفظ استعمال کیا ہے کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں نہ کہ مذہب سے، مولانا مدنی کا بیان جب اخبارات میں شائع ہوا تو جناب اقبال احمد صاحب سہیل نے جناب ڈاکٹر اقبال کے جواب میں ایک سخت نظم تحریر فرمائی اور ڈاکٹر صاحب پر تنقید کی۔ نظم سولہ اشعار پر مشتمل تھی، ان میں دس (۱۰) شعر جو میری نوک زباں ہیں ملاحظہ ہوں۔

کسے کہ خردہ گر نشست بر حسین احمد
زبانِ اُو عجمی و کلام در عربی ست
کہ گفت بر سر ممبر کہ ملّت از وطن ست
دروغ گوئی و ایراد، ایں چہ بوالعجبی ست
درست گفت محدث کہ قوم از وطن ست
کہ مستفاد نہ فرمودۂ خدا د نبی ست
زبانِ طعنہ کشادی مگر ندانستی
کہ فرقِ ملّت وقوم از لطائف ادبی ست
تفاوتے است، فراواں میانِ ملّت وقوم
یکے زکیش دگر کشوری ست یا نسبی ست
خدائے گفت بہ قرآں لِکُلِّ قَوْمٍ عَاد
مگر بہ نکتہ کجا پے برد کسے کہ غبی ست
بقوم خویش خطاب پیمبراں بنگر
پُراز حکایتِ یا قومصحفِ عربی ست
رموزِ حکمت و ایماں ز فلسفی جستن
تلاشِ لذتِ عرفاں زبادہ عنبی ست
بہ دیو بند گر اکر نجات می طلبی
کہ دیو نفسِ سلحشہ رودانش تو صبی ست
بگیر راہِ حسین احمد خداخواہی
کہ نائب ست نبیؐ راد ہم زآلِ نبیؐ ست

حضرت مولانا مدنی کا اخبارات میں بیان اور اقبال احمد صاحب سہیل کی متذکرہ بالا نظم جب ڈاکٹر اقبال صاحب کی

نظر سے گزری، تو فوراً اخبار "مدینہ" مورخہ ۵ مارچ ۱۹۳۸ء میں مضمون شائع کرا دیا کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی ہے، مجھے غلط خبر پہنچی تھی جس کی وجہ سے میں نے برافروختہ ہو کر اُن پر سخت تنقید کی، اب اصل حقیقت مجھ پر منکشف ہوگئی ہے اس لیے میں مولانا مدنی سے خواستگارِ معافی ہوں امید ہے کہ مولانا صاحب مجھے معاف فرمائیں گے ڈاکٹر اقبال صاحب نے تو معافی مانگ لی۔ لیکن لوگوں نے اُن کے کلیات سے قطعہ خارج نہیں کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا معافی نامہ ۵ مارچ ۱۹۳۸ء کو شائع ہوا تھا اور ان کا انتقال ۲۰ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا۔ اگر زیادہ دن تک زندہ رہتے تو یقین ہے کہ وہ خود قطعہ کو کلیات سے خارج کر دیتے [۲]

(ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی اقبال نمبر جنوری ۷۸)

حواشی

[۱] اس قطعہ کے بارے میں سالک صاحب نے ذکر اقبال صفحہ ۱۱۱ پر یہ لکھا ہے

"ترک موالات اور رسولِ نافرمانی کے جوش وخروش نے عامۃ المسلمین کو آتش زیر پا کر رکھا تھا مجاہد اور سرفروش قسم کے رہنما سیاست کے میدان پر قابض تھے۔ آئین پسند، تقاضا پرست اکابران حالات پر مضطرب ہو رہے تھے اور اوپر کے طبقوں میں کوشش کی جا رہی تھی کہ مسلم لیگ کو، جواب کانگرس کا دم چھلا بن کر اپنی ہستی کو گم کر چکی تھی از سر نو زندہ کر کے آئینی طور طریقے اختیار کئے جائیں۔ چنانچہ سر آغا خان اور مشیر حسین قدوائی ایک طرف خلافت کی حمایت میں بیان دے رہے تھے اور دوسری طرف مسٹر محمد علی جاح کی وساطت سے مسلم لیگ کے احیاء کا اہتمام بھی کر رہے تھے۔ اقبال کو اس فرسودہ وحکومانہ سیاست سے اختلاف تھا انہوں نے صدائے لیگ کے عنوان سے چند اشعار لکھے۔"

اس کے بعد یہی اشعار درج کئے ہیں۔ جس میں قائداعظم محمد علی جناح کو باب کہا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ علامہ ایک مومن قلب آدمی تھے جو محسوس کرتے تھے وہی کہتے تھے۔ اور ہمیشہ انہوں نے بڑی فراخدلی سے غلطی کا اعتراف کیا۔ چنانچہ تنقید ہمدرد کے جواب میں جن پر علامہ کے کلام پر اعتراضات کیئے گئے تھے۔ انھوں نے اعتراضات کے مسکت جواب بھی دیئے اور غلطی کو تسلیم بھی کر لیا (ذکر اقبال صفحہ نمبر (۳۸) چنانچہ ایک وقت وہ بھی آیا کہ ان کی نظر میں ہندی مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے قائداعظم سے بہتر کوئی آدمی نہیں تھا چنانچہ انہوں نے اپنے خطوط میں ان جذبات کا اظہار کیا۔ تفصیل کے لیے دیکھئے (لیٹرز ٹو جناح)

[۲] مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانان ہند کو جدید نظریہ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا لہذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ میں مولانا کے عقیدت مندوں کے جوش عقیدت کی قدر کرتا ہوں جنہوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے سلسلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تقریروں میں مجھے گالیاں دیں خدائے تعالیٰ ان کو مولانا کی صحت سے زیادہ مستفید کرے میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔ (روزنامہ احسان لاہور ۸ مارچ ۱۹۳۰ء ذکر اقبال، عبدالمجید سالک صفحہ نمبر ۲۱۷) تقریباً ایک سال قبل پروفیسر سلیم چشتی نے بھی ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس میں انہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے شرح بانگ درا میں مولانا مدنی کی شان میں گستاخی کی تھی۔

سر اقبال اپنے گھر میں ---

سلمیٰ صدیقی

میں نے اپنے بچپن میں پہلے تو کچھ اچھے لوگوں کو جانا پھر اُن لوگوں ہی سے یہ بھی جانا کہ ۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا ہے'' لیکن اُس عمر میں سارا جہاں اتنا اچھا نہیں لگتا تھا جتنا کہ کھیل کود اور گڑیا گھر کا ساز و سامان ۔۔۔ سعیدہ (ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی صاحبزادی) اور میں کھیل کود کی دلچسپیوں میں اتنے منہمک رہتے تھے ۔ کہ ہمارے بزرگ ہماری تعلیمی بد شوقی سے متفکر رہنے لگے تھے ۔ ہماری '' والدائیں'' تو ہمیں ہر دم ڈانٹتی پھٹکارتی رہتی تھیں کہ عام طور سے ماؤں کا یہی کردار اور مصرف ہوتا ہے ۔ لیکن ابّا میاں (میرے والد) اور ذاکر صاحب کھیل کود کو بھی زندگی کی نشو نما میں بڑی اور غیر معمولی اہمیت دیتے تھے ، اور ذاکر صاحب تو اتنے مہربان تھے کہ ان کی موجودگی میں تو کوئی بزرگ یا معلم بچوں کو زبردستی درس و تدریس میں مبتلا نہیں کر پاتا تھا ۔

لہذا ہر طرف " خیر و عافیت " تھی ۔ اور زندگی " جہالت " کے سہارے بڑے سُکھ چین سے گذر رہی تھی کہ اچانک کرنا خدا کا کیا ہوا کہ گڑیا کی شادی دیکھتے دیکھتے ہمیں ایک سچ مُچ کی شادی میں شرکت کا موقع مِل گیا اور ہم نے ایک اصلی دلہن دیکھ لی ۔ ابّا میاں کے ایک بہت قریبی دوست نے (ڈاکٹر اصغر علی حیدر) جو یونیورسٹی میں بوٹنی کے پروفیسر تھے ، ایک جرمن خاتون سے شادی کی ۔ شادی کی رسومات اور تقریب سب کچھ بہت ہی روایتی طور پر انجام پائیں ۔ یورپین دلہن کو یونیورسٹی کی بیگمات نے ایسے ہندوستانی ڈھنگ سے گھونگھٹ میں ڈھانپ لپیٹ کے بٹھایا اور ایسے بھاری بھر کم لباس اور زیورات میں مقید کر دیا کہ اس بچاری کو شاید پہلی بار مشرق و مغرب کا فرق معلوم ہوا ہوگا ۔ اسی دلہن کی چھوٹی بہن مِس ڈورالینڈ وے ایرَ ، چند سال پہلے ہندوستان آچکی تھیں ۔ اور میری والدہ کی بہترین سہیلی کی حیثیت سے ہمارے گھر میں سب کے ساتھ رہتی تھیں ۔ ان خاتون کو سب لوگ " آپا جان " کہتے تھے ۔ دراصل واقعہ یہ تھا کہ ذاکر

صاحب جرمنی سے ایک یہودی خاتون مس فلپس بورن کو چند سال پہلے جامعہ کے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اُن بچاری پہ شہری ہٹلر کے عہد میں بڑے ظلم وستم ڈھائے گئے تھے پورا خاندان تہہ تیغ ہو چکا تھا اور وہ تنہا اور غمزدہ تھیں۔ وہ جامعہ (دہلی) آگئیں تو انہوں نے اپنی زندگی کے تمام تر رنج والم کو خدمت وایثار کی بے غرض بھٹی میں جھونک دیا، اور ان کا غم واندوہ ننھے ننھے بچوں کی صحبت وسنگت میں کندن بن کے چمکنے لگا۔ مِس فِلپس بورن بچوں کی "آپا جان" سی بن گئیں۔ صرف بچے ہی نہیں، اُن سے بڑے اور چھوٹے، اپنے اور پرائے، معلم اور طالب علم، ملازمین اور عوام الناس سب ہی ان کو آپا جان کہنے لگے۔

مِس ڈورا علی گڑھ آنے سے پہلے جامعہ میں اُن سے ملی تھیں اور اُن کو ہندوستانی لفظ "آپا جان" بہت بھایا تھا۔ وہ ہمارے یہاں آئیں تو انہوں نے یہی فرمائش کی کہ اُن کو بھی "آپا جان" پکارا جائے۔ چنانچہ وہ خاتون علی گڑھ میں "آپا جان" مشہور ہوئیں۔

ہماری آپا جان کو جرمن بیویوں کی طرح "خالی" اور "بیکار" بیٹھنے سے بہت گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اس زمانے میں علی گڑھ کی بیویاں عام طور سے تخت پہ گاؤ اور مسند کے سہارے بیٹھی بیٹھی پاندان، خاصدان اور اگالدان کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی تھیں۔ آپا جان تو یہ تن آسانی دیکھ کے بوکھلا اُٹھیں اور انہوں نے خود کام کرنے کی باوقار پیش کش کی، اور صبح سے شام تک وہ یا تو خود کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتیں یا کسی نہ کسی کو کسی نہ کسی کام میں اُلجھائے رکھتی تھیں۔ لیکن اتنا کچھ کام کرنے کرانے پہ بھی وہ خوش اور مطمئن نہ تھیں۔ اور ہر دم اس کوشش میں رہتی تھیں کہ وہ کچھ کام کریں، وہ ایسا کام چاہتی تھیں جس میں کام کے ساتھ کچھ معاوضہ بھی ملے تا کہ وہ کسی پہ بوجھ نہ بنیں۔

ایک دن ابّا میاں دوپہر کو یونیورسٹی سے لوٹے تو کچھ متفکر نظر آئے کھانا شروع ہوا۔ ختم ہوا۔ انہوں نے معمولی گفتگو میں تو حصہ لیا لیکن کوئی ایسا چمکتا نِکھرتا فقرہ کسی سے نہ کہا جس کا ہم سب کو دوپہر کے کھانے پہ انتظار رہتا تھا۔ کھانے کے بعد جب کوفی کا دور شروع ہوا (کوفی کا آغاز اور اہتمام بھی ہمارے گھر میں آپا جان کی دین ہے) تو ابا میاں نے آپا جان سے پوچھا۔

"آپ نے کبھی ڈاکٹر اقبال کا نام سُنا ہے"

"ہاں ہاں ضرور سُنا ہے، جس نے کہا ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ابّا میاں نے حیران ہو کے پوچھا ۔ " آپ کو یہ کس نے بتایا؟"

آپا جان نے اپنی اُس ٹوٹی پھوٹی زبان میں جواب دیا جو وہ ہمارے صحبت میں سیکھ رہی تھیں " سلمٰی اور سعیدہ سے میں سیکھ لیا۔۔۔"

ابّا میاں نے مسکرا کے کہا" سلمٰی اور سعیدہ کی قابلیت تو مشکوک ہے لیکن خلوص میں بہر حال شبہ نہیں ہے "

ابّا میاں نے ڈاک میں سے ایک لفافہ اُٹھایا۔ اور بتایا کہ یہ خط لاہور سے سر اقبال نے ان کو لکھا ہے۔ وہ ان دنوں بیمار رہتے ہیں لیکن اپنی صحت سے زیادہ ان کو اپنے بچوں خصوصاً مُنیرہ بانو کی نگرانی اور تعلیم و تربیت کی طرف سے فکر رہتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کہ اگر یو۔ پی کے کسی شریف اور مہذب گھرانے کی شریف اور تعلیم یافتہ خاتون بطور گورنس، بچی کی دیکھ بھال کے لئے لاہور آ سکے تو ان کی تسکین کا باعث ہوگا۔ انہوں نے خاتون کے "مہذب" ہونے پر بہت زور دیا تھا۔ ابّا میاں نے آپا جان سے فرمائش کی کہ وہ لاہور جا کے ڈاکٹر اقبال سے ملیں۔ آپا جان نے کچھ وقت "غور " کرنے کے لیے مانگا۔

اگلی صبح آپا جان نے منظوری دیدی۔ ابّا میاں نے تفصیلی خط اُن خاتون کے بارے میں لِکھ دیا۔ چوتھے دن ڈاکٹر اقبال کا تار آیا"معزز جرمن خاتون کا انتظار ہے"

اور اس طرح آپا جان ۱۹۳۶ء کے اوائل میں علی گڑھ سے روانہ ہو کے " جاوید منزل "لاہور میں شاعرِ مشرق علامہ سر محمد اقبال کی بچّی مُنیرہ کی گورنس کی حیثیت سے رہنے لگیں۔ ایک ہفتے کے اندر اندر مس ڈورا کا خط ابا میاں کو مِلا۔ لکھا تھا

''میں تو بہت ڈرتے ڈرتے اس گھر میں داخل ہوئی تھی لیکن چوبیس گھنٹے کی مدت میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا کھویا ہوا وہ گھر جو میں برلن میں چھوڑ کر آئی تھی مجھے واپس مِل گیا ہے۔ سر اقبال کی عالمانہ بصیرت اور شہرۂ آفاق قابلیت سے تو میں ناواقف ہوں لیکن اُن کی شریفانہ دل نوازی اور مشفقانہ سرپرستی نے مجھے زندگی کی بہت سی ناانصافیاں اور محرومیاں بُھلا دی ہیں''۔

اگلی ڈاک سے ڈاکٹر اقبال کا خط ملا۔

"جرمن خاتون کی آمد نے میرے تاریک گھر کو روشنی عطا کی ہے میری بچی (بانو) کو مادرانہ شفقت کا بے بہا ذخیرہ خدائے کریم کی مہربانی سے عطا ہوا ہے۔ اللہ کریم آپ کو اس کا اجر دیگا۔" آپا جان کا دوسرا خط ملا۔

"ابتدا کے دو چار دن سر اقبال مجھ سے اس طرح پیش آتے تھے اور کھانے کے اوقات پہ لباس اور دوسرے لوازمات کا اتنا ہی لحاظ رکھتے تھے جیسا کہ عموماً یورپ کے شرفاء کا دستور ہے۔ لیکن کل رات انہوں نے مجھ سے کہا کہ "میڈیم اگر آپ

اجازت دیں تو میں اپنے "روزمرہ" کو واپس لوٹ جاؤں، موتیا بند اور گاؤٹ کی تکلیف کی بنا پر ضابطے کی پابندی مجھ پہ گراں گزرتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں اپنے دیرینہ اور آرام دہ لباس کو اپنالوں اور کھانا بھی اپنے کمرے میں کھایا کروں۔

"میں حیران رہ گئی کہ اتنی عظیم ہستی مجھ سے ایسے معذرت آمیز الفاظ میں مخاطب ہے۔ میں نے خود ان سے درخواست کی کہ وہ میری موجودگی کو تقویت کا باعث سمجھیں گرانی کا سبب نہیں۔ اب تک وہ مجھ سے جرمن میں گفتگو کرتے تھے لیکن علی بخش کا اصرار ہے کہ مجھے پنجابی جلد سے جلد سیکھ لینی چاہئے اور اس سلسلے میں موصوف نے اپنی خدمات بھی پیش کر دی ہیں۔ علی بخش اور میری پنجابی گفتگو سے سر اقبال بہت محظوظ ہوتے ہیں اور جاوید اور بانو کے لیے بھی یہ لطف کا باعث ہے۔"

کچھ عرصے کے بعد خواجہ غلام السیّدین صاحب، بھوپال ہو کے علی گڑھ آئے تو ابّا میاں کو انہوں نے بتایا کہ بھوپال میں ان کے قیام کے دوران سر اقبال کا خط اپنے عزیز ترین دوست اور سیّدین صاحب کے دوست اور میزبان سَر راس مسعود کے نام آیا جس میں انہوں نے آپا جان کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے وہ بہت مسرُور و مطمئن ہیں کہ ان کی ایک بڑی اور مسلسل پریشانی اس جرمن خاتون کی آمد سے دور ہوگئی ہے اس بات سے سَر راس مسعود اور لیڈی راس مسعود بہت خوش ہیں۔

تقریباً چھ سات ماہ کے بعد مِس ڈورا اپنی بہن سے ملنے علی گڑھ آئیں اور جتنے دن ان کا قیام رہا بیشتر اوقات وہ سَر اقبال اُن کے دوستوں، مداحوں، پرستاروں اور بچوں کا تفصیلی ذکر کرتی رہتی تھیں، وہ بتاتی تھیں کہ سَر اقبال نہایت سادہ مزاج اور سادگی پسند انسان ہیں۔ اچھا کھانا بہت پسند کرتے تھے لیکن بیماری اور پرہیز کی وجہ سے ہلکی غذا اور دواؤں کا پابندی سے استعمال کرتے ہیں۔ مطالعہ ان کا مرغوب ترین مشغلہ تھا لیکن آنکھ کی تکلیف کی وجہ سے وہ اس شوق کی خاطر خواہ تسکین نہ کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی فارسی کے اشعار گنگناتے تھے اور اس کے مطلب و معانی آپا جان (مِس ڈورا) کو جرمن میں بتاتے سمجھاتے تھے۔ جرمن ادیبوں سے بہت متاثر تھے۔ آپا جان کہتی تھیں کہ وہ خود چھوٹی عمر سے آفس میں کام کرتی تھیں اور لٹریچر سے ان کو دلچسپی بھی نسبتاً کم تھی لیکن سَر اقبال ایسے دلنشیں پیرائے میں اُن کو خود ان کے ادیبوں اور مفکروں کے بارے میں سمجھاتے تھے کہ گوئٹے، شلر وغیرہ کو انہوں نے ڈاکٹر اقبال کے کہنے ہی سے پڑھا اور سمجھا۔ گوئٹے کے آبائی وطن ویمر کے بارے میں تفصیل سے باتیں کرتے تھے اور وہاں کے پُرسکون ماحول سے متاثر تھے۔

سردی کے دنوں میں دھوپ میں بیٹھنا بہت پسند کرتے تھے اور کھلے صحن میں اپنے پلنگ پہ لیٹے لیٹے لوگوں سے ملتے تھے اور حُقہ پیتے رہتے تھے۔ حُقے کے شوقین تھے اور اس کا بہت اہتمام کرتے تھے اُن کا پُرانا اور وفادار ملازم علی بخش اس بات کا خاص لحاظ رکھتا تھا۔ علی بخش، ڈاکٹر اقبال کے جاں نثاروں میں تھا، اور آپا جان بتاتی تھیں کہ آدھی آدھی رات تک وہ اپنے آقا کے پاؤں دابتا رہتا تھا، ہر طرح کی خدمت کرتا تھا اور ایسا کرنے میں انتہائی خوشی اور سکون محسوس کرتا تھا۔ لگتا تھا جیسے علی بخش کی زندگی کی ایک ہی آرزو ہے اور وہ ہے اپنے مالک کی خدمت!!

سر اقبال بھی علی بخش کی خدمات کے معترف تھے اور ہمیشہ اُسے بہت اچھے الفاظ میں یاد کرتے تھے۔ کبھی کبھی جب علی بخش سے اپنے "خلوص" یا "ذہانت" کی بنا پر کوئی احمقانہ حرکت سرزد ہو جاتی یا علی بخش کسی بات پہ ناراضگی کا اظہار کرتا تو بہت خاموشی اور لطف سے اس سے مخاطب ہوتے اور صرف ایک فقرہ کہتے۔۔

" صبر۔۔۔۔۔علی بخش صبر!! "

اور محض یہ چند بے ضرر الفاظ سنتے ہی علی بخش "نارمل" ہو جاتا!!

آپا جان آقا اور ملازم کے اس رشتے اور طرزِ گفتگو سے بہت محظوظ ہوتی تھیں لیکن شروع کے چند دن علی بخش نے آپا جان کی آمد کو کچھ ایسے شک وشبہ اور تاسف ورنجوری کے ملے جُلے احساس کے ساتھ جانچا اور پرکھا، جیسے کوئی اپنے سیاسی حریف کو چیلنج کرتا ہو۔ سَر اقبال نے اس بارے میں آپا جان کو پہلے ہی وارننگ دیدی تھی اور اس کے رویّے کو نامناسب مگر فطری بھی قرار دیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ "علی بخش کا اس گھر پہ بہت حق ہے وہ ہمیشہ ہی خاندان کا وفادار ملازم رہا ہے لیکن والدہء جاوید کی وفات کے بعد تو اس نے سارے خاندان کی، گھر کی، بچوں کی اور خصوصاً میری نگرانی اور خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیا ہے۔ ایسے افراد، زندگی میں کم دستیاب ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیئے جیتے ہیں۔ علی بخش ایسے ہی چند انسانوں میں شامل ہے جو اپنی بہترین صلاحیتوں کا بہترین حصہ دوسروں کی خدمت کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ لہذا علی بخش کے "اقتدار واختیار " میں کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیئے۔

دوسری طرف انہوں نے علی بخش کو بھی سمجھایا کہ "میم صاحب " علی بخش کے " مقبوضہ علاقے " میں کسی غنیم کی طرح نہیں بلکہ ایک دوست، نگراں اور خود علی بخش کی بہی خواہ کی حیثیت سے داخل ہوئی ہیں"

علی بخش نے جب آپا جان اور بانو کے باہمی شوق وشغف کو دیکھا اور آپا جان کی شریفانہ، باوقار اور باصلاحیت کارگزاریوں کو پرکھا تو بہت جلد خود بھی ان کے معترف اور معتقد ہو گئے۔

کبھی کبھی ڈاکٹر اقبال، مس ڈورا کے بارے میں مختصر خطوط لکھا کرتے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ان کی موجودگی سے کس قدر مسرور و مطمئن ہیں۔ ان کی بچی بانو، آپا جان سے اس درجہ مانوس ہوگئی تھی کہ اُن کو موتا، کہنے لگی تھی (موتا جرمن زبان میں ماں کے لیے استعمال ہوتا ہے، ہماری "ماتا" سے کس قدر ملتا جلتا نظر آتا ہے)۔

اپریل ۱۹۳۸ء تک آپا جان سَر اقبال کے بچوں ہی کی نہیں خود ان کی تیمار دار بھی رہیں۔ ان کی علالت سے سفرِ آخرت تک ان کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ وفات کے وقت بھی وہ ان کے بسترِ مرگ کے قریں تھیں۔ اس سانحہ کا چشم دید حال جب وہ بتاتی تھیں تو ان کی آواز گلوگیر ہوجاتی تھی اور ان کے لیے خود پہ قابو پانا مشکل ہوجاتا تھا۔ ایک واقعہ انہوں نے بتایا جو بڑا ہی المناک ہے بتاتی تھیں کہ وفات سے چند گھنٹہ قبل سَر اقبال نے خواہش ظاہر کی کہ بانو کو ان کے قریب لایا جائے، بانو پاس آئی تو عادتاً بستر پہ اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھے بیٹھے اچانک ان کے گلے سے لگ گئی۔ ڈاکٹروں نے گھبرا کے بچی کو وہاں سے ہٹانے کو کہا باپ نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں اور اشارے سے کہا کہ

"اسے اسی طرح انکی آغوش میں رہنے دیا جائے۔"

وفات کے چوتھے پانچویں دن جب بانو اپنے گھر کے صحن میں آپا جان کی مسہری پہ ان کے پہلو میں لیٹی تھی تو بار بار بے چین ہوجاتی تھی اور بڑی اُداسی سے تاروں بھرے آسمان کو تکتی تھی۔ آپا جان نے پوچھا

"بانو کیا بات ہے؟" چار سال کی ننھی منی سی بچی نے بڑے غمگین لہجہ میں کہا۔ "پتہ نہیں کیا بات ہے ابا جی کے سامنے یہ ستارے بہت چمکتے تھے اب ان میں چمک کیوں نہیں ہے"

سر اقبال کی وفات کے بعد بھی اُن کی وصیّت اور جاوید اور بانو کی خواہش کے مطابق آپا جان جاوید منزل ہی میں بہت عرصہ تک رہیں۔ بانو نے ان کو ہمیشہ اپنی ماں کی طرح چاہا، اور جب اُس کی شادی ہوگئی تو وہ آپا جان کو اپنے ہمراہ یورپ کے سفر پہ لے گئی اور بالآخر برلن لے جا کے آپا جان کو ان کی جنگ کی ستائی ہوئی ماں اور لٹے اُجڑے گھر کے باقی ماندہ افراد سے مِلوایا۔ آپا جان اب ہائیڈل برگ میں رہنے لگی ہیں لیکن ہر دو تین سال کے بعد بانو اور جاوید کی فرمائش پہ لاہور آتی ہیں اور جاوید منزل میں قیام کرتی ہیں۔

۱۹۶۱ء میں آپا جان، بانو کو ساتھ لیکر ہندوستان آئی تھیں اور پہلی بار اس موقع پر مجھے اُس عظیم باپ کی شریف، باوقار اور خوبصورت بیٹی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔

جنوری ۱۹۷۰ء میں میرے والد کی وفات پر جاوید اقبال کا جو تعزیتی خط آیا تھا اس میں تحریر تھا کہ "ان دنوں آپا جان

۔۔۔۲۱ اپریل۔۔۔

الطاف پرواز

یاد کیا آیا کہ آنسو آنکھ سے بہنے لگے
اک فسانہ آج پھر ہم برملا کہنے لگے

آج پھر ہر آرزو، رد آفریں پاتے ہیں ہم
پھر غمِ گم گشتہ دل میں جاگزیں پاتے ہیں ہم

پھر وصال و ہجر کو موضوع بن جانا پڑا
پھر رُخِ تقدیر سے آنچل کو سرکانا پڑا

گرمئ افکار سے پھر تپ اُٹھے قلب و دماغ
جیسے گل ہونے سے پہلے چونک اٹھتے ہیں چراغ

آج پھر احساسِ غم سے آشنائی ہوگئی!
آج پھر دل سے مسرت کی جدائی ہوگئی

اک اداسی پھر گئے برسوں کی طرح چھا گئی
جاگتے ہی پھر عُروسِ صبح کا نیند آگئی

پردہ ٔ ذہن و نظر پر پھر وہی تصویر ہے
پھر وہی اقبالؒ کی یاد آج دامنگیر ہے

ہاں ، وہی اقبال رہبر قوم کے افکار کا
جس نے دیکھا ہے زمانِ نکبت وادبار کا

ہاں وہی درویشِ حق آگاہ و مرد بے خطرہ
پار ہو جاتی تھی ہفت افلاک سے جس کی نظر

دامنِ یزداں رہا ہے جس کے ہاتھوں میں مدام
قدسیوں پر جس نے کھولا آدمیت کا مقام

جس نے بخشا نو جوانوں کو جنوں کا اعتماد
پیکرِ ملت میں جس نے پھونک دی روحِ جہاد

ہاں وہی اقبالِ خود آگاہ و فطرت آشنا
جس نے مایوسی میں ہم کو دی نویدِ ارتقاء

جس نے دیکھے انتہائے غم میں بھی شادی کے خواب
جس نے ہر ذرے کو سمجھایا طریق انقلاب

جس نے احساسِ خودی بخشا دمِ مزدور کو
دعوت تعمیر نو دی عالمِ مجبور کو!

ہر نفس میں آگ کے شعلے ہیں رقصاں کس لیے
ہر نظر میں ایک مایوسی ہے غلطاں کس لیے

خواب کی تعبیر ابتک ہاتھ کیا آئی نہیں
زندگی پر کیا سحر کی روشنی چھائی نہیں ؟

تلخ ہیں اولاد ابراہیم کے لمحات کیوں
بارور ہے آج بھی نمرود بے اوقات کیوں

۲۱ اپریل

الطاف پرواز

یاد کیا آیا کہ آنسو آنکھ سے بہنے لگے
اک فسانہ آج پھر ہم برملا کہنے لگے

آج پھر ہر آرزو ، رد آفریں پاتے ہیں ہم
پھر غمِ گم گشتہ دل میں جاگزیں پاتے ہیں ہم

پھر وصال و ہجر کو موضوع بن جانا پڑا
پھر رُخِ تقدیر سے آنچل کو سر کانا پڑا

گرمیٔ افکار سے پھر تپ اُٹھے قلب و دماغ
جیسے گل ہونے سے پہلے چونک اٹھتے ہیں چراغ

آج پھر احساسِ غم سے آشنائی ہوگئی!
آج پھر دل سے مسرت کی جدائی ہوگئی

اک اداسی پھر گئے برسوں کی طرح چھا گئی
جاگتے ہی پھر عُروسِ صبح کا نیند آگئی

پردہ ٔ ذہن و نظر پر پھر وہی تصویر ہے
پھر وہی اقبالؒ کی یاد آج دامنگیر ہے

ہاں ، وہی اقبال رہبر قوم کے افکار کا
جس نے دیکھا ہے زمانِ نکبت وادبار کا

ہاں وہی درویشِ حق آگاہ و مرد بے خطرہ
پار ہوجاتی تھی ہفت افلاک سے جس کی نظر

دامنِ یزداں رہا ہے جس کے ہاتھوں میں مدام
قدسیوں پر جس نے کھولا آدمیت کا مقام

جس نے بخشا نو جوانوں کو جنوں کا اعتماد
پیکرِ ملت میں جس نے پھونک دی روحِ جہاد

ہاں وہی اقبالِ خود آگاہ و فطرت آشنا
جس نے مایوسی میں ہم کو دی نویدِ ارتقاء

جس نے دیکھے انتہائے غم میں بھی شادی کے خواب
جس نے ہر ذرے کو سمجھایا طریق انقلاب

جس نے احساسِ خودی بخشا دمِ مزدور کو
دعوت تعمیر نو دی عالمِ مجبور کو!

ہر نفس میں آگ کے شعلے ہیں رقصاں کس لیے
ہر نظر میں ایک مایوسی ہے غلطاں کس لیے

خواب کی تعبیر ابتک ہاتھ کیا آئی نہیں
زندگی پر کیا سحر کی روشنی چھائی نہیں ؟

تلخ ہیں اولاد ابراہیم کے لمحات کیوں
بارور ہے آج بھی نمرود بے اوقات کیوں

علامہ اقبال لندن کی ایک ادبی مجلس میں

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ

علاّمہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں جا بجا خودی یعنی انسانی شخصیت کی مضبوطی اور استواری پر زور دیا ہے اور اپنی ایک مستقل تصنیف یعنی "مثنوی اسرارِ خودی" اسی بات کی تفصیل وتوضیح کے لیے وقف کر دی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ خودی کی تعلیم کو اقبالؒ کے فلسفہ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور یہی تعلیم ان کے پیغامِ عمل کا اصل الاصول ہے۔ اِس زمانہ میں جب کہ اہلِ مغرب اہلِ مشرق کے مقابلہ میں بہت سے میدانوں مثلاً سیاست اور صنعت وحرفت میں گورے سبقت لے گئے ہیں۔ اقبالؒ نے خودی پر زور دے کر اہلِ مشرق کی وہ بیش بہا خدمت سرانجام دی ہے، جس کے لیے نہ صرف موجودہ نسل بلکہ ہماری آئندہ نسلیں بھی ابدالآباد تک ان کی احسان مند رہیں گی۔ فلسفۂ خودی کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر نکلسن نے مثنوی اسرارِ خودی کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ دیگر اہلِ قلم نے بھی علاّمہ مرحوم کے فلسفۂ خودی پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی صاحب قلم نے اس بات پر روشنی نہیں ڈالی کہ خود اقبالؒ پر اسرارِ خودی کیسے منکشف ہوئے اور ان کے دل ودماغ میں ابنائے زمانہ کو خود شناسی اور خود اعتمادی کی تعلیم دینے کا خیال کس طرح پیدا ہوا۔ مرحوم نے اس امر کو ایک دفعہ خود اپنی زبانِ فیض ترجمان سے واضح کیا تھا۔ اس مختصر مقالہ میں اس نکتہ کو انہی کے الفاظ میں بیان کرنا مقصود ہے۔ اسکی تفصیل یوں ہے

آج سے سترہ سال پہلے یعنی ۱۹۳۱ء میں اقبال مرحوم دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ اس موقع پر مسلم طلباء نے جو اس وقت لندن میں مقیم تھے، علامہ موصوف کے اعزاز میں ایک جلسہ استقبالیہ منعقد کیا تھا اور ڈاکٹر صاحب کے دوستوں اور مداحوں کو اس تقریب کے سلسلے میں والڈورف ہوٹل میں ہندوستانی اور انگریز مشاہیر اور عمائد کی ایک خاصی تعداد جمع ہوگئی تھی۔ اس موقع پر پروفیسر نکلسن اور دُوسرے فضلا نے تقریریں کیں اور اپنے اپنے انداز میں ڈاکٹر

صاحب کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ خوبی قسمت سے راقم الحروف بھی اس جلسہ میں موجود تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کے جواب میں جو تقریر فرمائی اس کے دوران میں اُنہوں نے چند امور کو بیان فرمایا۔ جن میں سے یہاں دو باتوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ اوّل یہ کہ علاّمہ موصوف نے اپنی بعض تصانیف میں فارسی زبان کس غرض سے استعمال کی اور دوسرے یہ کہ انہیں فلسفۂ خودی کی تعلیم دینے کا خیال کیسے پیدا ہوا۔

فارسی زبان کے استعمال کے متعلق آپ نے فرمایا:۔

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میں اپنی آواز ہندوستان سے باہر خصوصاً اہلِ ایران تک پہنچانا چاہتا تھا۔ مگر یہ خیال درست نہیں۔ اگر چہ میرا پیغام یعنی پیغامِ عمل تمام دنیا کے لیے ہے اور اہلِ ایران میرے دائرہ سامعین سے خارج نہیں مگر میرے کلام کے اوّل مخاطب ہندوستان ہی کے خواص تھے۔ کیونکہ میں اپنا پیغام اوّل مرحلہ میں صرف خواص تک محدود رکھنا چاہتا تھا اور اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ پہلے خواص کا طبقہ میرے پیغام کو سُنے اور اپنی ذہنی استعداد کی بنا پر اُسے صحیح طور پر سمجھے اور اس کو اچھی طرح اخذ کرنے کے بعد عوام تک پہنچائے۔ دُنیا کی تاریخ میں اکثر یوں بھی ہوا ہے کہ دقیق خیالات اور باریک نکات جب عوام پر بغیر کسی واسطہ کے ظاہر کیئے گئے تو کسی نے ان کو سمجھا کسی نے نہ سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ متکلم کی بات اور اس کا مفہوم و مطلب کچھ کا کچھ ہو گیا۔ مجھے اس بات سے مسرّت ہے کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے، میں اپنے ہم عصروں کی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوا اور میرے مخاطبین نے میرے کلام کی روح تک پہنچنے میں ایسی ٹھوکر نہیں کھائی جس سے گوہرِ مقصود گم ہو جائے"

علامہ صوف کے دل و دماغ میں فلسفۂ خودی کی نشو و نما کیسے ہوئی۔ اس امر کے متعلق آپ نے فرمایا۔

" جب میں نے دُنیا کے مختلف مذہبوں، فلسفہ کے مختلف سکولوں اور تاریخ کے مختلف ادوار کا بغور مطالعہ کیا تو میں نے دیکھا کہ مشرق میں افراد اور اقوام کا میلانِ طبع بالعموم سکون اور جمود یعنی بے حسی اور بے حرکتی کی طرف ہے، بلکہ بعض فرقوں نے نوعِ بشر کو اعلانیہ فنائے ذات یعنی اپنی ہستی کو مٹا دینے کی تعلیم دی ہ۔ یہ دیکھ کر میں نے فوراً بھانپ لیا کہ مشرقی اقوام کا موجودہ انحطاط بہت حد تک اسی قسم کی غلط تلقین کا بدیہی اور لازمی نتیجہ ہے۔ مثلاً نروان جس کا شمار بدھ مت کے مخصوص عقائد میں ہے۔ اس کا ماحصل بھی یہی بیان کیا جاتا ہے کہ انسان کی نجات (مکتی) اسی بات میں ہے کہ فردِ بشر اپنی ذات کو ذاتِ کل میں اس طرح جذب کر دے کہ اس کی علیحدہ ہستی گم ہو جائے اور اس کی انفرادی حیثیت بالکل مٹ جائے۔ اسی طرح ہندوستان کے بعض قدیم فلسفیوں کی تعلیم یہ ہے کہ اِس عالمِ رنگ و بو کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں مایا یعنی دھوکہ اور سراب ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اہلِ عالم کا دُنیا کی اصل کے بارے میں یہی عقیدہ ہو تو ایسی صورت میں انسان کی تمام سعی اور کوشش بے سود ہو گی، اس کی تمام جدو جہد رائیگاں جائیگی اور میدانِ زندگی میں عملِ پیہم کے لیے کوئی ترغیب و تحریک باقی نہ رہے گی۔

اسی طرح مسلمانوں کے ہاں اکثر صوفیوں نے ترکِ دنیا اور گوشہ گیری پر بہت زور دیا ہے اور مشاغلِ دُنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے ہی کو نیکی تصور کر رکھا ہے، وہ لوگ بھی جو اپنے آپ کو دائرہ شریعت کے اندر خیال کرتے ہیں، توکّل کا غلط مفہوم سمجھے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے توکّل کو، جمود اور بے عملی کا مترادف قرار دے رکھا ہے اور اس دُنیا میں جو دراصل عالمِ اسباب ہے، ذرائع اور وسائل کے استعمال کو توکّل کے منافی سمجھ لیا ہے۔ ہماری مشرقی شاعری بھی اسی قسم کے خیالات اور رجحانات کی آئینہ دار ہے اور یاس وقنوط اور حرماں نصیبی کا خیال اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق جن لوگوں کا یہ انداز اور رویہ ہو، وہ زندہ وتوانا رہنے کی بہت کم صلاحیت رکھتے ہیں۔"

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:۔

"جب میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ آیا اور یہاں کے حالات کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا تو میں نے دیکھا کہ مغرب میں بھی انسان بہت حد تک ورطۂ حیرت میں غوطے کھا رہا ہے اور اہلِ فکر اپنے تشکک کے سبب سے اندرونی طور پر افسردہ خاطر ہیں۔ اگرچہ فلسفیوں کی تگ و دو جاری ہے مگر عروسِ حقیقت کا چہرہ ہنوز زیر نقاب ہے اور انسان کا دل حقیقت کے نظارۂ جمال سے ابھی تک منوّر نہیں ہو سکا اس کے بعد سائنس کو لیجئے۔ اگر ایک طرف انسان نے نیچر کی بعض قوتوں کو تسخیر کر لیا ہے تو دوسرے طرف سائنس کی ترقی کے بعض ایسے پہلے بھی ہیں جن سے انسان کے دل میں اپنی بے مائگی کا احساس روز بروز بڑھ رہا ہے۔ مثلاً علم ہیت جوں جوں ترقی کر رہا ہے، انسان کا یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ وہ کائنات کے مقابلے میں ایک ذرّہ بے مقدار ہے اور اسی نسبت سے اس کی سعی و کوشش بھی حقیر اور بے معنی ہے۔ اس کے بعد انسان کی معیشت کو لیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ جب سے دیارِ مغرب میں اقتصادی انقلاب آیا ہے، کارخانہ داری کے نظام نے فردِ بشر کو انفرادی حیثیت سے بہت حقیر اور بے مایہ بنا دیا ہے۔ اور وہ محسوس کر رہا ہے کہ وہ گویا ایک پرِ کاہ ہے جس کو سوسائٹی کا بے پناہ سیلاب بہائے چلا جا رہا ہے۔ "

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:۔

"اِن حالات پر غور کرنے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس دور میں انسان کو ایک ایسے جام کی ضرورت ہے جو اس کی افسردگی اور اس کے احساسِ کمتری کو دُور کر کے اس کے جسم میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دے۔ جس سے اس کے قدم یقین اور خود اعتمادی کی چٹان پر محکوم ہو جائیں اور وہ اس راز سے آگاہ ہو جائے کہ اس کو وہ کچھ عطا ہوا ہے جو شمس وقمر کو بھی نہیں ملا یعنی شُعُور (Consciousness) اور شخصیت (Personality) اگرچہ وہ کائنات کے مقابلہ میں ایک ذرہ ہے مگر اس ذرہ کے اندر ایک علیحدہ دنیا موجود ہے ذی روح اور ذی شعور ہونے کی حیثیت سے انسان کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا کو اپنے فکر اور عمل سے آباد کرے۔"

(استقلال لاہور دسمبر ۱۹۴۸)

یادِ رفتگاں

جلال الدین بار ایٹ لاء

اقبالؒ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹا تھا مگر جب ہم اکٹھے بیٹھ کر اپنی عمروں کا مقابلہ کرتے تو اقبال ہمیشہ مجھے اپنا ہم عمر بتاتا اور کہتا کہ جوانی بہ دل است نہ بہ سال، اقبال کا دل ہمیشہ جوان تھا اور اس کی معیت میں، میں بھی اپنے آپ کو جوان سمجھتا۔ اقبال کی جوانی کا وقت زیادہ تر میرے ساتھ گذرا۔ اور ہم ایک دوسرے سے قریباً ۲۰ سال تک وابستہ رہے۔ اور نہایت قلیل عرصہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ جس طرح اقبال مجھ کو باوجود تفاوت عمر اپنا ہم عمر سمجھتا اس طرح کار پردازاں ریڈیو باوجود میری ضعیفی کے مجھے جوان سمجھ کر ہر سال اقبال مرحوم کی برسی پر اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کہنے کی فرمائش کر دیتے ہیں مجھے انکار کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حدیث دوست دل آویز داستاں است۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ اب قوت حافظہ کمزور ہو رہی ہے اور پورے واقعات مشکل سے یاد میں لا سکتا ہوں۔ آج پھر اسی موضوع پر سمع خراشی کے لیے آیا ہوں۔

اقبال مرحوم کی زندگی پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر لکھنے والے اقبال کی زندگی کے ایک ہی پہلو پیش کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ اقبال کے کسی دوسرے پہلو پر پڑ نہیں سکتی کہ بہت کم لوگ ان کی جوانی کے ظریفانہ زندگی سے آشنا ہیں میرا مقصد اس سے یہ نہیں کہ اقبال کی زندگی کا کوئی دوسرا پہلو کسی غیر مرغوب اسلوب کا حامل تھا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اقبال ہر رنگ میں اقبال تھا۔ ان کی خوش طبعی اور ظرافت کے لمحات میں ہی وہ فلسفیانہ اور عالمانہ انداز کی جھلک تھی۔ جوان کی بیّن اوقات میں اُن کی نظم ونثر میں دکھلائی دیتی ہے مگر جوانی کا وقت جیسا کہ ہر انسان پر آتا ہے۔ اقبال پر بھی آیا اور اس کو محض لوگوں نے اقبال کی ظریفانہ باتوں سے غلط نتائج اخذ کر کے مخالفانہ رنگ میں پیش کیا۔ مجھے یاد ہے کہ اقبال مرحوم کی زندگی میں اُن کے مخالفوں نے ان پر اکثر غلط بہتان باندھے اور حکام وقت کو اقبال کی طرف سے بدظن کرنے کی کوشش کی گئی۔ کسی نے ان کو پین

اسلامزم کا حامی قرار دیا کسی نے کثرت ازدواج کا فریفتہ بنایا اور کسی نے مے نوشی کا دلدادہ بتلایا اور اس طرح اقبال کی دنیاوی ترقی میں ہر قسم کے روڑے اٹکائے۔ یہ کام مسلم اور غیر مسلم دونوں نے کیا۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ اقبال پر اس طرح کے الزام اس کے مخالف اس وجہ سے لگاتے تھے۔ کہ وہ حکام کی نظروں میں امتیازی جگہ حاصل نہ کر سکے اقبال کی ظریفانہ باتوں سے رائی کا پہاڑ بنالیا جاتا اور عوام میں اس کی شہرت کردی جاتی اور یہ شہرت دُور دُور تک پھیلائی جاتی۔ مخالفوں کے اس پروپیگنڈے کا اثر یہ ہوا کہ اگرچہ اقبال کا درخشندہ دماغ اس امر کا مقتضی تھا کہ وہ اپنی جوانی میں ہائی کورٹ کا جج یا کابینہ کا ممبر ہوتا مگر نہ ہوسکا۔ اقبال اس امر کا ہمیشہ شاکی تھا کہ لوگوں نے اس کو صحیح طور پر نہ پہچانا اور نہ اس کو سمجھا۔

اقبال کو پین اسلامسٹ کہنا اس کے اسلامی نظریہ کے بنا ہر غلط نہ تھا۔ مگر جس طریق پر اس امر کو حکام تک پہنچایا جاتا تھا وہ اقبال کے لیے واقعی مضر تھا۔ مگر نواب ذوالفقار علی خان مرحوم نے جو اقبال کے خالص دوست تھے اپنے اثر ورسوخ سے حاکم وقت کے ذہن نشین کر دیا کہ اقبال کے مخالف حکام کی نظر میں گرانا چاہتے ہیں اقبال کے ایک سے زیادہ شادی کرنے کا عمل انگریز حکام کی نظر میں عموماً معیوب تھا اس لیے اقبال کے مخالفوں نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا حالانکہ اقبال کا ایک سے زیادہ شادی کرنا اسی مجبوری کی بنا پر تھا۔ جس میں اسلام نے تعداد ازدواج کو جائز کیا تھا۔ اقبال اپنی آخری شادی کے بعد بھی بالکل صحت منداور مکمل قوامی جسمانی کا مالک تھا اور خدا کے فضل سے آسودہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ مگر اپنی بقیہ عمر اپنی ایک بیوی کے ساتھ گذاردی اور کبھی مزید شادی کا خیال تک نہیں کیا حالانکہ کہ اکثر تعلیم یافتہ صنف نازک کے لکھے ہوئے خطوط آتے اور ان میں اقبال سے شادی کا خیال ظاہر ہوتا یہاں تک کہ ایک یورپین لیڈی کے بھی خطوط آئے اور اس نے اپنا فوٹو بھی روانہ کیا مگر اس قسم کے خطوط اقبال پر کبھی اثر انداز نہ ہوئے البتہ ہمارے لیے ایک ظریفانہ گفتگو کا مشغلہ بنے رہے۔ اس قسم کے واقعات نہایت دلچسپ شکل میں پیش آتے رہے جس کا ذکر اس مختصر صحبت میں مشکل ہے صرف ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہوں۔

کرنال میں ایک مولوی صاحب تھے (شاید اب بھی زندہ ہوں) انہوں نے اقبال کو کبھی نہ دیکھا تھا مگر اقبال کی شہرت کو سن چکے تھے۔ انہوں نے اقبال کو غائبانہ خطوط لکھنے شروع کر دئے۔ پہلے ایک دو خطوط تو معمولی انداز کے تھے۔ مگر بعد میں عاشقانہ انداز کا پہلو اختیار کر گئے اور مولوی صاحب نے ایک عورت کے حسن و جمال کا ایسا تذکرہ لکھنا شروع کر دیا کہ ان کے خطوط فسانہ عجائب بن گئے اقبال مجھ کو مولوی صاحب کے خطوط دکھاتا اور ہنستا اور کہتا کہ مولوی صاحب سے دریافت کیا جاوے کہ ان کا ایسے خطوط سے مقصد کیا ہے میں نے دریافت کیا۔ مگر مولوی صاحب اپنے انشاء پردازی میں

مگن رہے اور خط پر خط لکھتے رہے اور یہ خیال کرتے رہے کہ نہ تنہا عشق از دیدار خیزد۔ آخر اس عورت کی طرف سے شادی کا سوال پیش کر کے اقبال سے اپیل کی کہ وہ اس سے شادی کرے میں نے مولوی صاحب کو لکھا کہ وہ اس طرح کی خط وکتابت بند کریں۔ تب جا کر مولوی صاحب خاموش ہوئے اب آپ خیال فرمادیں کہ اس واقعہ سے اقبال کا دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ مگر اقبال کے مخالفوں نے جو شہرت پھیلا رکھی تھی۔ یہ ایک اس کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔ اسی طرح اقبال کی نسبت مے نوشی کا الزام بھی حقیقت الامر کے خلاف تھا۔ افسوس کہ جوانی کے وقت اقبال کی قدر بہت کم کی گئی اور اس کو ایک شاعر کی نظر سے دیکھا گیا۔ اور اس کے خیال کی گہرایوں کی قدر قیمت نہ کی گئی اور اکثر اس کی مخالفت کی گئی مگر جن لوگوں نے اقبال کو معمولی نظر سے دیکھا یا جنہوں نے اُس کی مخالفت کی ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ اقبال اپنی وفات کے بعد وہ شہرت حاصل کرے گا کہ فرماں رویان مملکت اس کے مزار پر عقیدت کے پھول برسانے کے لیے خود آئیں گے۔

ایں سعادت بزور بازو نسیت
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

احساس۔ لاہور اقبال نمبر یکم مئی ۱۹۵۱ء

آخری عمر میں آپ کی نگاہ کمزور ہوگئی تھی۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کے بعد رائے دی کہ موتیا اتر رہا ہے۔ پک جائے گا تو آپریشن سے آنکھ درست ہو جائے گی۔ فی الحال کالی عینک استعمال کی جائے۔

آپ نے ہنس کر فرمایا: کالا رنگ محبت اور سرمہ کی آمیزش سے دیا جاتا ہے۔ پہلے لوگ اس لئے سرمہ آنکھوں میں لگاتے تھے۔ اگر سرمہ لگا ہو تو ہر دفعہ آنکھ جھپکنے سے سرمہ کی ایک نہایت باریک تہہ آنکھ پر لگ جاتی ہے۔ اور یہ وہی کام دیتی ہے جو کالی عینک دے گی۔ یعنی کہ نظر پر زیادہ دباؤ نہ پڑے۔ (احسان: لاہور ۲۲ اپریل ۱۹۵۰ء)

علامہ اقبال کے حضور میں

حکیم عبدالمجید صاحب عثقی

بچپن کا زمانہ، سکول کی زندگی، غم دوش سے بے نیاز اور فکر فردا سے آزاد، نہ کسی کے سود و زیاں کا خیال اور نہ کسی کے رنج و راحت سے کام۔ صبح ہوئی کتابوں کا بستہ اٹھایا۔ مدرسے پہنچ گئے، چھٹی ہوئی تو گھر آئے، بھوک بھوک پکارنے لگے۔ جب ذرا سکون ہوا تو مطالعہ کرنے بیٹھ گئے، یہ کیفیت کسی خوش نصیب کی ہوگی۔ جذبات طبیعت کو بے چین اور دل کو مضطرب رکھنے میں اس دور میں بھی کم نہ تھے۔ جماعت ششم میں پڑھتا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد، مولانا حامد علی خان، پروفیسر حمید احمد خان، ڈاکٹر خلیفہ تقی الدین میرے رفیق تعلیم تھے۔

طلباء کی مشکلات کو اساتذہ تک پہنچانے اور ان میں باہمی روابط بڑھانے کے ذرائع پر سوچ بچار کرنے لگے۔ مولانا ناصر الدین جو دسویں جماعت کے طالبعلم تھے اور ہم سب سے بڑے تھے، اس غور و فکر میں شریک تھے۔ ایک دن ہم نے مذکورہ مقاصد کے حصول کے لیے محمڈن سٹوڈنٹس سوسائٹی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اور اسلامیہ ہائی سکول جو شیرانوالہ دروازہ لاہور میں واقع تھا کے طلبہ کو اس نئی تشکیل میں شامل ہونے کی دعوت دی۔

چنانچہ پہلا اجتماع سائنس روم میں منعقد ہوا اور اب ہماری اس نئی جماعت کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ برکت علی محمڈن ہال میں ماہانہ جلسے ہونے لگے۔ مولانا صلاح الدین احمد اور خلیفہ تقی الدین مقالے پڑھتے اور انہیں خوب داد ملتی، حوصلے بڑھتے اور کام کرنے کے لیے دل کی امنگیں بیدار ہوتیں کبھی جلسے میں سرذوالفقار علی صدارت کے لیے مدعو ہوتے ہیں اور کبھی ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر محمد دین صاحب۔

ایک بار سوسائٹی نے علامہ اقبالؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا، مقصد یہ تھا کہ انہیں جلسے کی صدارت کے لیے آمادہ کیا جائے۔ چنانچہ مجلس عاملہ کے گیارہ رکن ناصر الدین صاحب مصحف کی قیادت میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان

دنوں علامہ صاحب کا قیام انارکلی میں بمبئے ہوٹل کی بالائی منزل پر تھا۔

ہمیں صبح آٹھ بجے ملاقات کا وقت دیا گیا۔ ہم وقت کی پابندی کو ملحوظ رکھتے ہوئے آٹھ بجے سے پہلے ہی علامہ صاحب کی قیام گاہ پر پہنچ گئے اور کمرۂ ملاقات میں انتظار کرنے لگے۔ چند لمحے بعد کمرے میں ایک قد آور مگر متین شخصیت داخل ہوئی اور ایسا محسوس ہوا کہ ہمیں کسی نے بازو سے پکڑ کر نو وارد کے استقبال کے لیے کھڑا کر دیا ہے۔ یہ شیخ محمد اقبال تھے جن کے لیے بے چین نگاہیں اور مضطرب دل انتظار کی گھڑیاں گن رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہم سب کو چائے کی میز پر آنے کی دعوت دی چائے کے بعد حاضری کا مقصد عرض کیا گیا۔ انہیں تنظیم کے مقاصد سن کر خوشی ہوئی۔ فرمانے لگے

> ''اس کے نام میں ذرا سی تبدیلی اس کی بنیادوں کو مضبوط اور اس کے مقاصد کو بلند کر دے گی''۔ پھر فرمایا'' محمڈن سٹوڈنٹس سوسائٹی کی بجائے اس کا نام محمڈن سٹوڈنٹس سلف ایمپرووِنگ سوسائٹی ہونا چاہیے۔ اس طرح سوسائٹی کا ہر رکن اپنی اصلاح کی جانب نفسیاتی طور پر زیادہ توجہ دے سکے گا''

ہم سب نے ڈاکٹر صاحب کی اس تجویز کو شکریئے کے ساتھ قبول کرلیا۔ ڈاکٹر صاحب ہماری تعلیمی سرگرمیوں کے متعلق سوالات کرتے رہے اور ہم ان کے جواب دیتے رہے ہمارے وفد کے قائد تخفیف تصدیعہ کہتے ہوئے اٹھے اور اجازت طلب کرنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا" کہ آپ نے ان رفقاء کا تعارف نہیں کرایا" چنانچہ نام بہ نام سب کے متعلق مصحف صاحب نے کچھ نہ کچھ کہا اور یہ بھی کہہ دیا کہ ان تمام نے موزوں طبیعت پائی ہے اور شعر وسخن سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب حیرت زدہ ہوکر پوچھنے لگے کہ " کیا آپ سب شاعر ہیں"اور پھر کہنے لگے۔"اِنّا للہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔" فکر شعر میں وقت ضائع کرنا طالب علم کی زندگی کے خلاف ہے'' پھر فرمایا

> " کہ اس بناء پر اپنے لڑکے آفتاب اقبال کو لاہور سے دور سیالکوٹ کے کالج میں داخل کرایا ہے تاکہ میری شاعری کے جراثیم اس تک نہ پہنچ سکیں"

وہ اس کے بعد دیر تک ہمیں شعر و وقت کے تضاد پر نصائح فرماتے رہے اور ہم سب سر جھکائے سنتے رہے بالاخر ان کی بزرگانہ شفقت اور مشفقانہ سلوک کے گہرے احساس کے ساتھ واپس آ گئے۔

شہاب ۔ ۱۱۹ پریل ۱۹۶۲ء

واقعاتِ اقبال

حکیم کلب علی

درج ذیل یاداشتیں حکیم کلب علی کی زبان سے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر توقیر احمد خان نے مرتب کر کے شائع کیں۔ حکیم صاحب چار سال تک لاہور میں قیام پذیر رہے۔ وہ اپنے آبائی وطن امروہہ کے محلّہ بیگم سرائے میں قیام پذیر ہیں اور طبابت کا پیشہ کرتے ہیں۔ امروہہ میں انہوں نے اورینٹل سوسائٹی بنا رکھی ہے جس کے تحت اردو زبان و ادب پر گاہے بہ گاہے سیمی نار ہوتے رہتے ہیں۔ درج ذیل مضمون میں حکیم صاحب نے علامہ کے بارے میں اپنی یاداشتیں بیان کی ہیں۔ حکیم صاحب نے اقبال کے بعض اشعار کا واقعاتی پس منظر بیان کیا ہے۔ کلام اقبال کے شارحین اس پس منظر کی غیر موجودگی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے چلے آئے ہیں۔ درج ذیل تحریر کی بدولت اقبال کے ان اشعار کی نئی تفہیم ممکن ہو سکی ہے۔ لہذا اس تحریر کو کلامِ اقبال کی تشریح کے حوالے سے " نوادر " کا درجہ حاصل ہے۔ (ادارہ)

(۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک) چار سال لائل پور رہا ہوں اس دوران اقبال کی خدمت میں جاتا رہتا تھا۔ میں اقبال کے کچھ واقعات ایسے سناؤں گا جو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اقبال کا ایک شعر ہے۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

(بال جبریل غزل نمبر ۶)

میں نے اقبال سے پوچھا کہ صاحب اس کا کیا مطلب ہے یہ آپ نے کیا کہا ہے؟ اقبال نے بتایا کہ میاں اسماعیل نانوتوی نے اور پھر مولوی عبدالعزیز نے بھی یہ فتوا دیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب کے ہزاروں گھرانے اپنے مکان اور جائیداد اونے پونے بیچ کر نکل پڑے لیکن وہاں جا کر انہیں ایک وقت کا کھانا بھی میسر نہیں ہوا چنانچہ وہ تمام گھرانے پریشان حال الٹے پانو واپس آئے اور پھر ہندوستان ہی میں ایک ایک لقمہ کو ترس گئے اور بڑی مصیبت کی زندگی گزارنے لگے۔

اس طرح نہ معلوم کتنے مسلمان گھرانے برباد ہوئے۔ یہ شعر اس موقع کے لیے کہا گیا تھا۔ اقبال کا دل کس قدر نرم تھا۔ یہاں انہوں نے "ناخوش اندیشی " کہا ہے اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نہ معلوم کیا الفاظ استعمال کرتا۔ اس شعر کی طرح اقبال کا ایک اور شعر:۔

نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا
ہر خرقہ سالوس کے اندر ہے مہاجن

(بالِ جبریل۔ باغی مرید)

کا بھی ایک پس منظر ہے۔

اقبال ریل کے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کرتے تھے ایک بار وہ کہیں سے لاہور واپس آرہے تھے کہ ان کے ڈبے میں ایک شاہ جی سوار ہوئے اور اقبال کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کے بیس پچیس مرید بھی تھے۔ اقبال حقہ پی رہے تھے۔ انہوں نے حقہ کی نلی شاہ جی کی طرف موڑ دی۔ شاہ جی نے حقہ پیا اور پوچھا کہ تم کون ہو تو اقبال نے کہا میرا نام اقبال ہے۔ راستے میں شاہ جی کہیں اتر گئے اور اسٹیشن پر ہی یہ بات مشہور کر دی کہ مجھے کل کو اقبال نے لاہور بلایا ہے۔ یہ بات شاہ جی نے لوگوں کو یہ جتانے کے لیے کہی کہ دیکھو میں اتنا بڑا بزرگ ہوں کہ اقبال جیسا جیدّ عالم بھی میرا مرید ہے۔ اگلے دن صبح کو میں اقبال کے پاس بیٹھا تھا کہ علی بخش نے بتایا کہ کوئی درویش نما شخص دروازے پر ہے اقبال نے کہا انہیں اندر بلا لاؤ۔ شاہ جی لاہور سے بھی بہت سے لوگوں کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ علی بخش بولا کہ صاحب ان کے ساتھ تو سوڈیڑھ سو آدمی اور ہیں۔ تو مہمان خانہ کھول دو۔ اقبال نے کہا علی بخش نے مہمان خانہ کھول کر ان سب کو بٹھا دیا۔ جب اقبال مہمان خانہ میں داخل ہوئے تو شاہ جی ایک ایک مرید کی فریاد سن رہے تھے۔ ایک مرید نے بیس روپے کا نوٹ دیا۔ پیر صاحب نے اسے تکیہ کے نیچے رکھ لیا۔ مرید دست بستہ کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ حضور میں سات سو روپے کا قرض دار ہوں۔ بیٹی کی شادی میں یہ رقم اُدھار لے لی تھی۔ دعا کریں میرا یہ قرض ادا ہو جائے۔ اقبال نے آتے ہی یہ منظر دیکھا کہ مرید گڑگڑا رہا ہے اور رو رو کر فریاد کر رہا ہے۔ تو انہوں نے شاہ جی سے کہا حضرت یہ دس روپے تو غریب کے واپس کر دیں ۶۹۰ روپے کا ہی قرض دار رہ جائیگا۔ انہوں نے واپس نہ کیے۔ اقبال نے علی بخش سے کہا کہ تکیہ کے نیچے سے نوٹ نکال لو تو اس کے نیچے اور بھی نوٹ نکلے۔ اقبال نے کہا گنو۔ علی بخش نے گن کر بتایا کہ ۳۵۰ روپے ہیں۔ اقبال نے کہا علی بخش جاؤ اس مقروض کو سیٹھ بلاقی رام کے پاس لے جاؤ اور کہنا کہ اقبال نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اس شخص کا سود معاف کر کے اصل

رقم لے لی جائے۔ساڑے تین سو روپے یہ ہیں جو کم پڑیں میری طرف سے شامل کر لو۔علی بخش اس شخص کو لے گیا اور پھر ایسا ہی کیا۔ساری محفل اور تمام مرید مع پیر صاحب کے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔اسی موقع کے لیے اقبال نے کہا تھا

نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا

ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن

اقبال کا ایک اور شعر بھی قابل غور ہے۔

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر

کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا

خارا تو کانٹے دار پتھر کو کہتے ہیں لیکن یہ "پوشیدہ ہنر" کیا ہے؟ پھر خود ہی بتایا کہ اقبال گردے کے مریض تھے پتھری کے علاج کے لیے آپریشن کی تیاری ہوگئی۔اقبال کا پاسپورٹ اور ویزا بھی آ گیا ایک دن جانے میں تھا کہ ان کے بھائی عطا محمد آئے اور بولے کہ جانے سے پہلے ایک بزرگ حاذق کو دکھالیں۔حاذق صاحب کے یہاں جانے کے لیے گھوڑے کا سفر طے کرنا پڑتا تھا۔اقبال گھوڑے پر سوار ہو کر گئے۔حاذق صاحب نے اقبال کو دیکھا تو اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور باصرار اقبال کو اس جگہ پر بٹھایا جہاں خود بیٹھتے تھے۔باتیں کرتے رہے حاذق صاحب نے اپنے ملازم کو آواز دی اور ایک تعویذ زعفران سے لکھ کر اس کو دیا کہ ایک کورے گھڑے میں پانی بھر کر یہ تعویذ اس میں ڈال دو اور ایک پرانے گھڑے میں بھی پانی بھر کر رکھ دو۔اس نے ایسا ہی کیا۔حاذق صاحب اقبال سے بولے بیٹے گرمی بہت ہے تم سفر کے تھکے ہوئے ہو جاؤ پہلے نہالو۔اقبال نے کہا مناسب ہے میں بھی یہی چاہتا تھا ذرا تکان دور ہو جائے گی۔حاذق صاحب نے کہا پہلے کورے گھڑے کا پانی استعمال کرنا۔اقبال غسل خانے میں گئے اور جیسے ہی پانی ڈالنا شروع کیا ان کو بہت زور کا پیشاب آیا اور اقبال نے تمام جسم کو اور جگہ کو پاک کیا اور پتھری کاغذ میں لے کر باہر آئے۔حاذق صاحب نے پوچھا بیٹے کیا حال ہے؟ اقبال نے کاغذ میں لپٹی ہوئی پتھری دکھائی اور سارا واقعہ بتایا۔اس طرح انہیں آپریشن کے لیے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔اسی کے لیے اقبال نے "پوشیدہ ہنر" کی اصطلاح بنائی تھی اور کہا تھا

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر

سنتا ہوں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا

(ارمغانِ حجاز---- بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو)

اقبال کے بارے میں، میں وہی باتیں بتاؤں گا جن کا میں گواہ ہوں اور جو واقعات میرے سامنے پیش آئے ہیں۔
پھر فرمایا ایک جرمن لیڈی اقبال کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میں نے قرآن شریف کو جرمن زبان میں پڑھا ہے اور بڑی احترام سے اسے تولیہ میں لپیٹ کر رکھتی تھی لیکن جب میں نے پڑھا کہ خدا کے " کُن فَیَکُون " کہتے ہی کائنات وجود میں آ گئی تو میں نے قرآن کو میز پر پٹخ دیا۔ (حکیم صاحب نے ہاتھ سے دھکیلنے کا اشارہ کر کے بتایا اس لیڈی نے یوں کہا جیسے قرآن کو دھکیل دیا) یہ سنتے ہی اقبال کا چہرہ تمتما گیا۔ انہوں نے کہا کہ اس کا جواب میں تمھارے فلسفہ کی رو سے ہی دوں گا۔ پھر اقبال نے اس لیڈی سے پوچھا کہ تمھاری قمیص کا رنگ کیسا ہے؟ اس نے کہا۔ نیلا۔ اقبال نے بتایا کہ جرمنی فلسفہ کے مطابق کسی رنگ کو جاننے کے لیے ڈھائی کھرب تعاملات سے گزرنا پڑتا ہے۔ یعنی ڈھائی سو کلرک اگر بٹھائے جائیں تو اس کو جاننے میں بارہ سال لگ جائیں گے کہ یہ رنگ نیلا ہے اور آپ نے پلک جھپکتے ہی یہ بتا دیا کہ یہ رنگ نیلا ہے جب آپ اتنے لمبے عمل کی بات کو ایک لمحہ میں بتا سکتی ہیں تو آپ کی اس آنکھ کو بنانے والا "کُن فَیَکُون" کہہ کر کائنات کو پیدا کیوں نہیں کر سکتا۔ لیڈی کے پاس جواب نہ تھا۔ اقبال کبوتر شوقیہ نہیں پالتے تھے بلکہ رسول اللہ کے عشق میں احتراماً کبوتر پالا کرتے تھے کیونکہ ان کبوتروں میں روضہ مبارک کا ایک کبوتر تھا اس کے احترام میں اقبال اتنے کبوتر پالا کرتے تھے۔ اس واقعہ کے بیان کرنے کے ساتھ حکیم صاحب نے ایک اور بات بتائی کہ حج بیت اللہ کے موقع پر میں نے خود دیکھا ہے کہ وہاں جب کبوتروں کا جھنڈ اُڑتا ہے تو روضہ رسولؐ کے اوپر سے نہیں گزرتا بلکہ کبوتروں کا جھنڈ کا جھنڈ ادھر اُدھر پھٹ جاتا ہے اور کبوتر گنبد خضری سے بچ کر اڑتے ہیں اور ان حدود میں بیٹ بھی نہیں کرتے ہیں۔ پرندوں کے اس حیرت انگیز عمل پر میں نے ایک شعر بھی مسجد نبوی میں کہا تھا جو اس طرح ہے۔

نہ جفت ہوں نہ کریں بیٹ صحن مسجد میں
طیور بھی تو تمھارے یہاں مہذب ہیں

آخر میں اقبال کے معاملات سے متعلق ایک واقعہ بیان کرنا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو۔
جب اقبال نے دوسری شادی کر لی تو لدھیانہ والی بیوی خود ہی گھر آ گئیں۔ دوسری بیوی نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے ایک جوڑ جڑواں کنڈل بنوا دو۔ اقبال نے سیٹھ بلاقی رام کو فون کیا کہ دو جوڑ کنڈل ایک وزن کے بنا دو۔ ایک چاول کا فرق نہ ہو۔ جب کنڈل بن کر آ گئے تو انہیں ترازو میں رکھ کر تولا گیا۔ ان میں سے ایک جوڑ آدھی رتی کم تھا۔ اس پر بڑی بیوی نے کہا کہ کم والے میں لے لوں گی مگر اقبال نے ان کنڈلوں کو واپس کر دیا اور اس روایت کے راوی شفاء الملک نے بتایا کہ

سیٹھ بلاقی رام نے کم والے کنڈلوں میں آدھی رتی کا ٹانکا لگا دیا اور اس طرح دونوں دلھنوں کو برابر کے کنڈل دیے گئے۔ اسے کہتے ہیں العدل فی الحقیقت۔

(کتاب نما دہلی ستمبر ۱۹۹۶ء)

پیامِ اقبال بہ ملّتِ کہسار

ہز امپریل مجسٹی نادر شاہ فرماں روائی افغانستان کی دعوت پر اقبال ۱۹۳۲ء میں کابل تشریف لے گئے۔ وہاں کے مجلّہ ''کابل'' میں آپ کی ایک نظم ''پیام اقبال بہ ملّت کہسار'' شائع ہوئی۔ یہ نظم بھی جہاں تک میرے محدود مطالعے کا تعلق ہے اقبال کے کسی مجموعہ کلام میں نہیں ہے۔ مجلّہ ''کابل'' میں اقبال کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس نظم کا عکس شائع ہوا تھا۔ اس مطبوعہ نظم کا فوٹو میں نے کراچی میں اپنے مرحوم دوست ممتاز حسن (سکرٹیری وزارتِ مالیات حکومت پاکستان) کے ذاتی کتب خانے میں دیکھا تھا اور وہیں سے اسے اپنے لئے نقل کیا تھا۔ اس نظم میں اوپر بائیں طرف کے کونے میں اقبال کی تصویر ِسٹ ہے اور نیچے اقبال کے دستخط اس طرح سے درج ہیں۔

محمد اقبال لاہور ۲۴ مارچ ۱۹۳۲ء

یہ نظم دلدادگانِ کلام اقبال کی نذر کی جا رہی ہے۔ (جگن ناتھ آزاد)

صبا بگوئے بافغانِ کوہسار ازمن — بمنزلے رسد آں ملّتے کہ ''خودنگر'' است

مریدِ پیرِ خراباتیانِ خودبیں شو — نگاہِ او ز عقابِ گرسنہ تیز تر است

ضمیر تست کہ نقشِ زمانہ تو کشد — نہ حرکتِ فلک است ایں نہ گردشِ قمر است

دگر بہ سلسلۂ کوہسارِ خود بنگر — کہ تو کلیمی و صبحِ تجلّیِ دگر است

بیا بیا کہ بدامانِ نادر آویزیم — کہ مردِ پاک نہاد است و صاحبِ نظر است

یکے است ضربتِ اقبال و ضربتِ فرہاد
جز ایں کہ تیشۂ ما را نشانہ بر جگر است

اقبال اپنی بہن کی نظر میں

درج ذیل مضمون علامہ کی چھوٹی بہن کے اُس انٹرویو سے مرتب کیا گیا ہے جو منیرہ اور جاوید اقبال نے مل کر لیا تھا اور ریڈیو سے نشر بھی ہوا تھا۔ بعد میں یہ تحریری صورت میں "احساس لاہور" کے یکم مئی ۱۹۵۱ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ مضمون کی تدوین میں بہت کم اصل انٹرویو سے انحراف کیا گیا ہے تاہم انٹرویو کے سوالات کو حذف کر کے صرف جوابات کی بنا پر اسے مضمون کی شکل دی گئی ہے۔ علامہ کی اس بہن سے ایک انٹرویو م۔ش نے بھی کسی زمانے میں لیا تھا جو میری کتاب "اقبال کے ہم نشین" میں شامل کیا گیا ہے۔ تاہم اس مضمون میں بہت سی باتیں نئی ہیں اور پہلی بار منظر عام پر لائی جا رہی ہیں۔

(مرتب)

ہم دو بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ جن میں اقبال مجھ سے تین سال بڑے تھے۔ اقبال کی پیدائش کے بارے میں مجھے تفصیلات کا علم نہیں کیوں کہ میں اقبال سے چھوٹی تھی تاہم میں نے اپنی ماں کو یہ کہتے ضرور سنا ہے کہ اقبال جمعہ کی صبح کو پیدا ہوئے تھے اور موسم کھلی بہار کا تھا۔ اقبال کی ولادت سے بیشتر والد صاحب کو ان کی پیدائش کے متعلق کوخواب میں اشارا بھی ہوا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ اکیلے کسی وسیع میدان میں بیٹھے آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے تک رہے ہیں۔ ناگاں آسمان کی بلندیوں میں انہیں ایک سفید کبوتر اڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ عرصہ تک ان کی نگاہیں کبوتر کا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ معاً وہ کبوتر غوطہ لگاتا ہے اور ان کی جھولی میں آن گرتا ہے۔ اسی خواب کی وجہ سے جب علامہ پیدا ہوئے تو ان کا نام اقبال رکھا گیا۔

بڑے بھائی عطا محمد اپنی ملازمت کی وجہ سے سیالکوٹ سے باہر تھے۔ دو بڑی بہنیں بھی شادی شدہ تھیں گھر میں صرف ہم تین بچے تھے۔ اقبال، میں اور ہماری سب سے چھوٹی بہن جو ابھی گود میں تھی۔ میں اقبال کو اقبال کہہ کر ہی پکارتی اس لیے کہ ہماری عمروں میں بہت کم فرق تھا۔ میں چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی اور وہ چھٹی جماعت کے

طالب علم تھے۔ بچپن میں وہ شریر تھے۔ وہ میری گڑیا کی باہیں اور ٹانگیں نوچ دیا کرتے۔ اُس زمانے میں کپڑے کی گڑیاں بنائی جاتی تھیں میں بڑی محنت سے گڑیا بناتی اور یہ اس کا ستیاناس کر دیتے۔ پھر مجھے دکھا دکھا کر میرا منہ چڑایا کرتے تھے۔ چونکہ اماں کے لاڈلے تھے لہذا اماں انہیں تو کچھ نہ کہتیں اُلٹا مجھی پر خفا ہوتیں کہ تو ہر وقت گڑیوں سے کھیلتی رہتی ہے اور میں خوب روتی۔

تعلیم کے میدان میں ہم دونوں خاصے تیز تھے اور وظیفے لیتے تھے۔ پانچویں جماعت کے بعد مجھے تو اسکول سے اُٹھالیا گیا۔ تاہم اقبال بدستور پڑھتے رہے۔ میری طالب علمی کے زمانے میں اقبال مجھے اپنے ہمراہ مدرسہ تک لے جاتے۔ تاہم واپسی پر میں اکیلی آتی تھی۔

ہمارے والد (شیخ نور محمد) بڑے نرم دل واقع ہوئے تھے اس لیے ان سے مار کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ ہماری ماں بڑی سخت اور جابر قسم کی عورت تھیں وہ اقبال سے محبت تو کرتی تھیں مگر جب موقعہ پڑے تو ڈانٹ ڈپٹ بھی لیتیں مثلاً ایک دفعہ اقبال نے پھل والے سے نظر بچا کر اسکی چھابڑی سے ایک سنگترہ اٹھالیا۔ جب ہماری ماں کو پتہ چلا تو انہیں کان سے پکڑ کر سیدھی نیچے پھل والے کے پاس پہنچیں اور اقبال سے کہا کہ اسے اس کی چیز واپس دو۔ اقبال اپنی ماں سے بہت ڈرتے تھے اس لیے چپ چاپ سنگترہ لوٹا دیا۔ مگر ہماری ماں نے یہی اس قصہ کو ختم نہ کیا بلکہ اسی حالت میں اقبال کو پکڑے محلے کی ایک ایک عورت کے پاس گئیں اور کہا کہ میرا بیٹا چور ہے۔ اُس نے سنگترہ چرایا ہے۔ اس واقعہ کا اثر اقبال کے ذہن پر اتنا گہرا ہوا کہ وہ ساری زندگی اس واقعہ کو نہ بھولے۔

بچپن میں اقبال کو کبوتر بازی کا بڑا شوق تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پتنگ بازی سے بھی دلچسپی تھی۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ اسکول سے واپس آتے ہی ننگے سر ننگے پاؤں قلعہ کی طرف بھاگ جایا کرتے تھے یہ قلعہ سیالکوٹ میں ایک اونچے ٹیلے پر واقع تھا جسے کسی راجے نے بنایا تھا اور اُس وقت ایک شکستہ عمارت کی صورت میں نظر آتا تھا۔ اقبال نے یہ کبوتر خود نہیں پالے تھے بلکہ محلے میں کسی اور شخص نے پال رکھے تھے۔ ہمارے والد کو اقبال کا یہ شوق اچھا نہ لگتا تھا ایک روز وہ اُس شخص کے گھر گئے اور التجا کی کہ وہ کبوتر اڑا دے کیونکہ ان کی وجہ سے اقبال کی تعلیم متاثر ہو رہی تھی۔ چونکہ وہ شخص ہماری کشمیری برادری سے تعلق رکھتا تھا اور شیخ صاحب سے عقیدت بھی رکھتا تھا لہذا اُس نے والد صاحب کے کہنے پر تمام کبوتر اڑا دیے لیکن اقبال نے محلے سے باہر کوئی اور گھر تلاش کرلیا۔ اس پر ماں کی طرف سے انہیں کئی بار مار بھی پڑی مگر ان کا یہ شوق نہ چھوٹا آخر تنگ آ کر والد صاحب نے اقبال کو اپنے گھر پر ہی کبوتروں کے چند جوڑے رکھنے کی اجازت دے دی۔ کبوتر گھر پر

رکھنے کا انجام یہ ہوا کہ انہوں نے پڑھائی کی طرف توجہ دینی چھوڑ دی اور نویں جماعت میں فیل ہو گئے۔ تاہم جب کبھی وہ پڑھنے بیٹھتے تو انہیں ادھر اُدھر کی مطلق کوئی خبر نہ رہتی۔ رات گئے تک چراغ کی روشنی میں پڑھا کرتے اور ہماری ماں ان کے سامنے بیٹھی انہیں پنکھا جھلتیں اور ساتھ ساتھ انہیں شفقت بھری نظروں سے تکتی رہتیں۔

بچپن میں اقبال شرارتی تھے ہر وقت مذاق سوجھتا تھا۔ طبعاً سُست تھے، نہانے سے گھبراتے۔ انہیں جب بھی نہلایا جاتا تا زبردستی نہلایا جاتا۔ وہ عموماً مذاق سے کہا کرتے کہ صابن تو کالے آدمیوں کے لیے بنا ہے مگر میں تو گورا ہوں مجھے صابن کی کیا ضرورت؟ میٹرک کے بعد وہ سیالکوٹ کے مرے کالج میں داخل ہوئے۔ ہاں میٹرک کا امتحان انہوں نے گجرات میں دیا۔ والد صاحب کی خواہش صرف میٹرک تک پڑھانے کی تھی لیکن مولوی میر حسن کے مشورے سے انہیں کالج میں داخل کروایا گیا۔ ماں کے اصرار پر اقبال کی شادی میٹرک کے زمانے میں ہی کردی گئی۔ یہ شادی اُن کے منشاء کے بغیر کی گئی جس پر وہ اکثر کڑھتے رہتے تھے۔

کالج کے زمانے کے اخراجات ہمارے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے برداشت کئے۔ وہ ان دنوں رُڑکی میں ایس، ڈی، او تھے۔ اقبال اسی بنا پر اپنے بھائی کی بڑی عزت کرتے تھے اور تادم مرگ ان کے احسان کو یاد کرتے رہتے تھے۔ ہمارے والد نے کسی مدرسہ میں تو تعلیم نہیں پائی تھی اسکے باوجود وہ فارسی اور اردو بخوبی پڑھ لیتے تھے۔ لکھنا البتہ نہیں جانتے تھے۔ اصل میں وہ تصوّف کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کے مرشد مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے انہیں جو تلقین خواب میں کی تھی اس کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ اقبال جب جوان ہوئے تو والد صاحب نے انہیں بھی اس راز سے آگاہ کردیا۔ والد صاحب پر ہر شب جذب کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ساری ساری رات کبھی اونچی آواز سے روتے اور کبھی ان کی کوٹھڑی سے اللہ اللہ کی صدا آتی۔ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا گویا وہ کسی سے باتیں کر رہے ہیں حالانکہ وہ تنہا ہوتے ایک دفعہ ان سے ہم نے پوچھا کہ میاں جی آپ کل رات کِن سے باتیں کر رہے تھے تو کہنے لگے خدائی لشکر گھوڑوں پر چڑھ کر آیا تھا۔ یہ کیفیت رات کو تہجد کی نماز کے بعد جب کبھی ان پر طاری ہوتی تو ان کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور وہ مصلے پر گر پڑتے یا وجد سے جھومتے۔ جب کبھی ہماری آہٹ سن پاتے تو ہمیں ہاتھ کے اشارے سے کہہ دیتے کہ اس وقت چلے جاؤ۔

اقبال اُس زمانے میں لاہور میں پڑھتے تھے۔ چھٹیوں میں جب کبھی سیالکوٹ آتے تو دونوں میں تصوّف کے متعلق بحث ہوا کرتی۔ اکثر اوقات جب باپ بیٹا علمی مباحثہ کرتے تو اقبال لاجواب ہو جایا کرتے تھے۔ والد صاحب نے اقبال

کو تہجد کی نماز پڑھنے کی عادت ڈالی۔ والد صاحب شاعر تو نہیں تھے لیکن ہماری والدہ کی وفات کے بعد ایک روز مجھے بلوایا اور چند اشعار لکھنے کے لیے کہا۔ مجھے تمام اشعار تو یاد نہیں تاہم ایک شعر یاد رہ گیا۔ جو یوں تھا۔

یہ تنہا زندگی پیری میں نصف الموت ہوتی ہے

نہ ہو جب ہم سفر اپنا نہ ہو جب راز داں اپنا

ان اشعار سے عیاں ہوتا تھا کہ انہیں ہماری والدہ سے بے حد محبت تھی اور ان کی جدائی انہیں بہت شاق گذرتی تھی۔

اقبال کی والدہ سے محبت کے کئی واقعات ہمیں یاد ہیں۔ جب اقبال لاہور میں ملازمت کرتے تھے تو سو روپیہ گھر بھیجا کرتے تھے۔ انگلستان گئے تو ہر ہفتہ والدہ کے نام ان کا خط آیا کرتا۔ مجھے یاد ہے ہماری ماں ہر ہفتہ ظہر کی نماز کے بعد اوپر کی منزل کی کھڑکی میں بیٹھ جاتیں اور گھنٹوں ڈاکیہ کا انتظار کرتی رہتیں حتیٰ کہ دور سے ڈاکیہ نظر پڑتا تو مجھے بھگاتیں اور جب میں خط لے آتی تو مجھے پڑھواتیں اور خیر و عافیت سے مطمئن ہو کر گھر کے کام کاج میں لگ جاتیں۔

انگلستان سے واپس آنے کے بعد اقبال کی دوسری شادی کرائی گئی مگر یہ شادی بھی ان کی مرضی کے مطابق نہ ہوئی تاہم تیسری شادی میں ان کی مرضی شامل تھی لہذا کامیاب رہی۔ اقبال ان دنوں انارکلی لاہور میں قیام پزیر تھے میں بھی ان دنوں کچھ عرصہ کے لیے ان کے ہاں جا کر رہی۔ رمضان کا مہینہ تھا ایک شام اقبال کے پاس چند لڑکے پڑھنے آئے ہوئے تھے سب روزہ دار تھے بحث مباحثہ نے اس قدر طول پکڑا کہ سب روزہ افطار کرنا بھول گئے۔ جب بحث ختم ہوئی تو رات کے دس بج چکے تھے سو رات کے دس بجے روزہ افطار کیا گیا۔

انارکلی کا ایک اور واقعہ بھی مجھے یاد پڑتا ہے۔ سردیوں کی ایک رات اقبال اٹھے اُس وقت دو یا تین بجے کا عمل ہوگا اور علی بخش کو جگا کر پوچھا کہ تم نے باہر کے دروازہ کو مقفّل کیا تھا۔ اُس نے جواب دیا جی ہاں۔ اس پر خاموش ہو گئے چند دنوں کے بعد اقبال جب سیالکوٹ آئے تو انہوں نے ہمارے والد شیخ نور محمد سے اُس رات کا ذکر کیا۔ اس وقت میں بھی ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھی کہنے لگے مجھے رات کو کسی سبز پوش بزرگ نے آ کر جگایا۔ ایک گھنٹہ تک ان سے گفتگو ہوتی رہی جب وہ اٹھ کر جانے لگے تو میں انہیں دروازے تک چھوڑنے گیا۔ اس وقت دروازہ کھلا تھا معاً دیکھتا کیا ہوں کہ وہ غائب ہو چکے ہیں اور دروازہ اسی طرح مقفل ہے۔ میں نے علی بخش کو جگا کر پوچھا تو اُس نے بھی تصدیق کی کہ دروازہ بند تھا۔ اس واقعہ کے بعد اقبال نے ایک نظم بھی لکھی جس کا عنوان "خفیہ راہ" رکھا گیا۔ اسی طرح ایک رات انہیں مولانا روم کی زیارت بھی ہوئی جنہوں نے انہیں مثنوی لکھنے کے لیے کہا۔ اس واقعہ کے بعد ہی اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی نام کی مثنویاں لکھی گئیں۔

ایک بھولی ہوئی کہانی (سر ہو گئے اقبال)

عبدالمجید سالک

۱۹۲۳ء کا ذکر ہے میں ترکِ موالات کی تحریک میں ایڈیٹر "زمیندار" کی حیثیت سے ایک سال کی قید میانوالی جیل میں کاٹ کر واپس آچکا تھا۔ اور اب مہر صاحب کی رفاقت میں "زمیندار" کو مرتب کر رہا تھا۔ ہم دونوں اکٹھے دفتر جاتے۔ اکٹھے بیٹھتے سینما دیکھتے اور اکٹھے ڈاکٹر اقبال کے ہاں جاتے۔ جہاں گھنٹوں مختلف مسائل پر گفت وشنید کا ہنگامہ گرم رہتا اور کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب موج میں آکر اپنا غیر مطبوعہ کلام سنانے لگتے تو رات کے گیارہ گیارہ بجے تک سناتے ہی چلے جاتے۔ ان دلفریب اور روح افزا صحبتوں کی یاد جب آجاتی ہے۔ تو دل تڑپ جاتا ہے۔

اُس سال خطابات کی فہرست جو شائع ہوئی۔ تو اس میں ڈاکٹر اقبال کا نام بھی درج تھا اور آپ کو حکومت کی طرف سے سَر کا خطاب دیا گیا تھا۔ اگر چہ یہ خطاب کسی سرکاری خدمت کے صلے میں نہ دیا گیا۔ نہ ڈاکٹر صاحب اس قسم کسی خدمت کے اہل تھے۔ نہ اعزازات دنیوی کا ذوق رکھتے تھے۔ لیکن میں جو تین چار سال سے ترک موالات اور تحریک خلافت میں نوجوانی کے جوش کی وجہ سے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا اور ڈاکٹر اقبال کو اپنا پیر و مرشد خیال کرتا تھا۔ ان کی خطاب یافتگی سے بہت آزردہ ہوا اور ادب ولحاظ کو بالائے طاق رکھ کر "افکار وحوادث" میں ڈاکٹر صاحب کے بیشمار اشعار نقل کر کر کے اُن پر ہلکی ہلکی چوٹیں کرنے لگا۔ جب اس سے بھی دل کو اطمینان نہ ہوا تو چند اشعار لکھ کر "زمیندار" میں شائع کر دیئے۔ وہ اشعار یہ تھے۔

لو مدرسہ علم ہوا قصر حکومت
افسوس کہ علامہ سے ''سَر'' ہوگئے اقبال

پہلے تو سرِ ملتِ بیضا کے وہ تھے تاج
اب اور سنو تاج کے سَر ہو گئے اقبال

پہلے تو مسلمانوں کے سر ہوتے تھے اکثر
تنگ آکے اب انگریز کے سر ہوگئے اقبال

کیا کہنے ہیں اس شیوۂ تسلیم ورضا کے
سرکار بنی تیغ توسر ہو گئے اقبال

کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ
سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال

سر ہو گیا ترکوں کی شجاعت سے سمرنا
سر کا ر کی تدبیر سے سر ہو گئے اقبال

سودائے غم ِ عشق سے سالک تو ہوا قید
اور خوبی قسمت ہے کہ سر ہوگئے اقبال

چونکہ ترکِ موالات کے جذبات کا اثر ابھی عام تھا اور خطابات سے عوام کی نفرت و بیزاری بدستور قائم تھی۔ اس لیے شہر میں ان اشعار کی دھوم مچ گئی۔ اور جا بجا لوگ ان کو دہراتے ہوئے سنے گئے

ادھر میری یہ کیفیت ہوئی۔ کہ شوخی طبیعت سے مجبور ہو کر اشار تو لکھ دیئے۔ لیکن ندامت کا یہ عالم تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے جانے سے سخت گھبراتا تھا۔ اگر چہ مجھے احساس تھا کہ ڈاکٹر صاحب کا ظرف بہت بڑا ہے۔ وہ مجھ پر سالہا سال سے بے انتہا شفقت فرماتے ہیں اور "افکار و موادث" کے بے حد مداح اور قدر دان ہیں۔ وہ میرے اشعار کو پڑھ کر آزردہ نہ ہوئے ہونگے۔ بلکہ ان کو محض نو جوانی کی شوخی پر محمول کرتے ہونگے۔ لیکن اس احساس کے باوجود مجھے ڈاکٹر صاحب کے سامنے جاتے ہوئے بے حد شرم آتی تھی۔ مہر صاحب اُن دنوں بھی ڈاکٹر صاحب کے ہاں ہو آتے تھے۔ لیکن میرا جانا چھوٹ گیا تھا۔ ایک دو دفعہ ڈاکٹر صاحب نے مہر صاحب سے ذکر بھی کیا کہ سالک صاحب کس رنگ میں ہیں۔ کئی روز

سے انہوں نے ادھر کا رُخ نہیں کیا۔ مہر صاحب اِدھر اُدھر کی کوئی بات کر کے ٹال دیتے تھے۔ آخر کوئی چار پانچ ہفتوں کے بعد مجھ سے رہا نہ گیا اور میں ایک دن اکیلا ان کی خدمت میں حاضر ہو ہی گیا۔ اکیلا اس لیے گیا۔ کہ جو ڈانٹ پٹ متوقع تھی وہ کسی کے سامنے نہ ہو لیکن جب میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر پہنچا۔ تو ڈاکٹر صاحب حسب معمول برآمدے میں کُرسی پر بیٹھے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ تو بدستور نہایت شگفتگی سے میرے سلام کا جواب دیا۔ اور پوچھنے لگے۔ آپ کہیں لاہور سے باہر گئے ہوئے تھے؟ عرض کیا جی نہیں فرمایا کئی دن سے آپ آئے نہیں۔ میں نے کہا اپنی گستاخی پر نادم تھا، یہ سن کر بے اختیار ہنس دیئے اور کہنے لگے، اچھا؟ آپ کا مطلب اُن اشعار سے ہے جو آپ نے میرے خطاب پر لکھے تھے؟ نہیں مجھے ان کا کوئی خیال نہیں۔ آپ نے خواہ مخواہ اتنے دن کنارہ کشی اختیار کئے رکھی۔ اصلی بات یہ ہے کہ مجھے اور میرے طرز زندگی کو جانتے ہوئے آپ نے مجھ سے بے انصافی ضرور کی لیکن وہ شعر خوب تھا

سر ہو گیا ترکوں کی شجاعت سے سمرنا
سرکار کی تدبیر سے سر ہوگئے اقبال

ڈاکٹر صاحب تو شفقت و مرحمت کے پردے میں یہ ہلکے ہلکے کچوکے لگا رہے تھے اور میں شرم سے زمین میں گڑا جاتا تھا۔ پھر فرمانے لگے۔ لوگ مجھے طرح طرح کے القاب سے پکارتے ہیں۔ کوئی ڈاکٹر صاحب کہتا ہے۔ کوئی شیخ صاحب۔ کوئی علامہ کہتا ہے، کوئی ترجمان حقیقت، اسی طرح اگر گورنمنٹ نے بھی مجھے مخاطب کرنے کے لیے ایک لفظ اختیار کر لیا۔ تو اس پر اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔ پھر بتایا کہ سیالکوٹ میں ہمارے محلے کی ایک سالخوردہ بڑھیا بچپن سے اب تک مجھے "بالو" ہی کہتی ہے میری پچاس برس کی عمر ہونے کو آئی۔ اب بھی سیالکوٹ جاتا ہوں اور وہ بڑھیا مجھے دیکھنے کو آتی ہے۔ تو یہی کہتی ہے۔ "بالو" کدوں آیا ایں تگڑا تے ہیں۔ مجھے تو اس بڑھیا کے "بالو" اور سرکار کے "سر" مین کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ آپ کو بھی کوئی سالک صاحب کہتا ہے۔ کوئی مولانا کہتا ہے اور بہت سے ایسے بھی ہونگے۔ جو صرف مجید کہہ کر پکارتے ہوں گے۔ اس ہلکی پھلکی خوشگوار گفتگو سے ڈاکٹر صاحب کا دل آزردگی سے اگر وہ موجود تھی، اور میری طبعیت شرم وندامت سے بالکل پاک ہوگئی اور ہم دونوں پھر شفقت و عقیدت کے اِسی فردوس میں پہنچ گئے۔ جس میں سالہا سال سے مقیم چلے آتے تھے۔ اس کے بعد کبھی ان اشعار کا ذکر درمیان میں نہ آیا اور میں اور مہر صاحب پھر ہر دوسرے تیسرے دن ترجمان حقیقت کے آستانے پر حاضر ہوتے اور ان کے بصائر و حقائق سے مستفیض ہونے لگے۔

کوئی کیا جانے۔ کہ ڈاکٹر صاحب کے انتقال سے ہماری دنیا کس قدر ویران ہوگئی۔ ان کے بعد کوئی ایسا نہیں۔ جو کسی

اعتبار سے بھی ان کی جگہ لے سکے۔ ہمارے ذہن میں کوئی دینی، معاشرتی، ادبی مسئلہ کھٹکتا تھا۔ تو ہم اس کے حل کے لیے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے۔ کوئی لطیفہ سوجھتا تھا۔ تو ڈاکٹر صاحب کو جا کر سناتے تھے۔ خود ہنستے تھے اور ان کو ہنساتے تھے۔ کسی فکر و غم سے دل بوجھل ہو جاتا تھا۔ تو اس مرد قلندر کی ایک لمحہ کی صحبت اس بوجھ کو ہلکا کر دیتی تھی۔ ان کی نظم سے زیادہ ان کو گفتگو دلاویز اور معلومات افزا تھی۔ وہ بہت بڑے محفل آرا، بذلہ سنج، لطیفہ گو اور متکلم تھے۔ ان کا علم ایک بحرِ ذخار تھا۔ جس مسئلے پر گفتگو کرتے۔ ایک ہی مجلس میں فی البدیہہ اتنی معلومات بہم پہنچا دیتے۔ کہ اس مسئلہ پر کتاب لکھ دینے کو جی چاہتا تھا۔ آہ، وہ صحبت اب کہاں؟

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

چٹان۔ ۲۵ اپریل ۱۹۴۹ء

Tarjeta Postal

CÓRDOBA.—La Mezquita; un detalle de la fecunda inspiración de los alarifes árabes.

Modelo 65. [illegible] Avda. Gran Capitán

Cordoba (Spain). 20th Jan. 1933

Dear Sir William,
I have been wandering in south Spain. The Arab palaces & mosques here are perfect marvels of art. In a few days I hope to reach Venice to catch Conte Verde on the 10th of Feb for India. Please convey my respects to Lady Rothenstein.
Yours sincerely
Muhammad Iqbal

(2)

Sir William Rothenstein
Airlie Gardens,
London
(England)

خط بنام ولیم روتھن اسٹین، جو اسپین کے سفر سے متعلق ہے۔

چند با اقبال لمحے

از مرزا عزیز فیضانی

علامہ اقبال مرحوم کی وفات کے ساتھ ہی ان کی ملاقاتوں اور گفتگوؤں کی داستانیں جرائد میں شائع ہونی شروع ہوگئی تھیں۔ اس میں نامور و گمنام دونوں قسم کے لوگ تھے۔ ناظرین میں یہ خیال سا پیدا ہو گیا تھا ذاتی ملاقاتوں کا خیال بیان کرنے کا رواج زور پکڑ گیا ہے۔ اس لیے اسے ریا و نمود سمجھ کر جی نے چاہا کہ محترز رہے۔ اسی لئے قلم رُکا رہا۔ مگر اب چند احباب کے پیہم اصرار پر امتثال امر نا گزیر نظر آملی۔

نہ راقم کی شخصیت کوئی شخصیت ہے اور نہ اس کا ملاقات کرنا اہم مگر اس خیال سے کہ علامہ اقبال کے نیاز حاصل کرنا البتہ ضرور اہم ہے اور یہ کہ شاید ان باتوں سے کسی کو فائدہ پہنچ جائے، چند ملاقاتوں کا مختصر حال ہدیۂ ناظرین ہے۔

سب سے پہلی ملاقات جسے "زیارت" کہا جا سکتا ہے، ۱۹۲۰ء میں ہوئی جب علامہ موصوف انارکلی کے ایک مکان کی بالائی منزل میں اقامت پذیر تھے۔ راقم اپنے رفیق مکرم چوہدری ذکاءاللہ بسمل (ایڈوکیٹ) کے ہمراہ گیا۔ کیونکہ ابھی نوعمر تھا۔ اور ڈر تھا کہ بغیر تعارف شاید گفتگو ہی نہ ہو سکے۔ مگر اقبالؒ کے درویشانہ خلق کے کیا کہنے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ کہنے والا یا سننے والا کون ہے امیر یا غریب نامور ہے یا گمنام، عالم ہے یا جاہل۔ انہیں تو صرف خلوص واخوت درکار تھی اندازہ یہ ہے کہ جب تک تو وہ فراست کو ملاقاتی کے خلوص کا امتحان کرنے دیتے تھے۔ خاموش رہتے تھے مگر جونہی انہیں یقین آ گیا کہ یہ شخص درد اور خلوص کی دولت رکھتا ہے۔ انہوں نے اس طرح گفتگو شروع کر دی گویا ملاقاتی امیر خاندانی، نامی وگرامی، عالم وفہیم اور دلی حمیم ہے۔ خواہ وہ لوگوں کی اصطلاح میں غریب وگمنام ہی کیوں نہ ہو۔ نہایت شفقت سے پیش آتے، محبت سے سمجھاتے اور درد کی دولت سے مالا مال کرتے تھے۔

بسمل صاحب نے تعارف یوں کرایا کہ میرا یہ نوعمر بھائی ہم وطن ہے، نظم ونثر کا اسے ذوق ہے اور بفضلِ خداندہبی وملی ذوقی ہے، نعت گو بھی ہے، آپ کے کلام کا خصوصاً اس لیے مدّاح اور عاشق ہے کہ آپ نے شاعری کے خداداد جوہر کو صحیح راستے میں استعمال کرنا شروع کیا ہے، اس لیے لاہور آتے ہی آپ کی زیارت کا شوق اسے پیدا ہوگیا تھا۔ شاید آپ کی مثنوی کے ایک عنوان سے جواُس کے دل میں اشکال پیدا ہوگیا ہے وہ بھی آپ سے دُور کرائے۔

مکان کے چھجے میں کُرسی پر جلوہ افروز تھے۔ جگہ اتنی ہی تھی کہ ایک کے پیچھے دوسرے اور تیسری کُرسی نوکر نے بچھائی دائرہ کی شکل میں کُرسیاں وہاں رکھی نہیں جاسکتی تھیں اتفاق یہ کہ علامہ مرحوم ہماری طرف پشت کیے بیٹھے تھے، بوجہ علالت کُرسی کو موڑ نہ سکے، صرف ذرا سا پہلو موڑ لیا۔ اپنے خیال میں محو تعارف کے فقرے سُن رہے تھے، "نعت گو" کہنے پر پہلی دفعہ آنکھیں کھول کر راقم کو دیکھا۔ پھر لفظ زیارت پر۔ آخر فرمایا، میں زیارت کے لائق کہاں۔

اب بدقّت کُرسی کچھ موڑ لی۔ اور زیادہ سامنے ہوگئے۔ مزاج پُرسی پر فرمایا کہ نقرس کا عارضہ ہے

یہ بھی ترا کرم ہے کہ نقرس دیا مجھے
صحت میں گو غریب مرض میں امیر ہوں

یہ اس لیے کہ کہتے ہیں نقرس کا مرض بالعموم اُمرا کو لاحق ہوا کرتا ہے۔

مثنوی کے ذکر پر فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں مغربی تعلیم کا اثر مثنوی کے ذریعہ پھیلایا گیا ہے حالانکہ مغرب نے بھی نقالی سے کام لے کر اسلام ہی سے کئی باتیں اڑائیں اور انہیں بڑھا چڑھا کر توڑ موڑ کر اپنے مطلب کا بنا کر اپنی کہہ کر پیش کی ہیں۔ اب جو اصلی چیزوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ تو مسلمان اُسے اپنا ہی گمشدہ مال سمجھنے کی بجائے اسے یورپ کی ایجاد سمجھتا ہے۔ بھلا اس پر میں کیا کروں ہوا س کے کہ فریاد کروں۔

پھر پوچھا مثنوی کے کونسے عنوان پر اشکال پیدا ہوا۔ راقم پہلی مرتب جرأت کر کے گویا ہوا۔ یہ عنوان "جہاد کہ مقصد او جوع الارض باشدر مذہب اسلام حرام است" اس عنوان سے ان لوگوں کے دل میں شُبہ پیدا ہوتا ہے جو مجاہد کے دل کا امتحان کر کے یہ معلوم نہیں کر سکتے یا ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ اُس میں صرف رضائے مولا ہے یا فتح اسلام بھی۔ کیونکہ فوج کا مقصد فتح بھی ضرور ہوتا ہے اب یہ فرق کرنا ہر شخص کا کام نہیں کہ فتح ممالک تو ذریعہ ہے مقصد نہیں۔ مقصد اگر ہو بھی تو ادنیٰ اور دوسرے درجہ کا ہے۔ اصلی مقصد رضائے مولا ہے۔

فرمایا یہی چیز اُس شخص کو سمجھا دیجئے۔ جو فرق کرنا نہیں جانتا۔ معلوم ہو رہا ہے کہ آپ یہ فرق پہچانتے ہیں۔ اس لیے

کوئی اشکال نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ عنوان باب دراصل احادیث کا معنوی ترجمہ ہے اور ملوکیت واستعمار کے شیدائیوں سے متعلق ہے ایک مجاہدِ اسلام کی خدمت اور تبلیغ کے لیے فتح ملک چاہتا ہے۔ ایک بادشاہ یا سرِ لشکر ملک فتح کر کے وہاں بادشاہت قائم کرنے کے لیے لڑتا ہے دونوں مسلمان ہیں دونوں لڑتے ہیں۔ پہلا شخص مجاہد فی سبیل اللہ ہے دوسرا نہیں۔

پس اب سلسلہ چل نکلا تھا، چند لمحے اور اسرار و رموز بیان فرمائے، جن کا احاطہ قوتِ حافظہ قائم نہیں رکھ سکی۔ لطف انہی سے سُننے میں تھا اب دوہرانے میں کہاں!

ایک آدھ مرتبہ اور بھی نیاز حاصل کئے۔ میکلوڈ روڈ پر ایک دفعہ اپنے فارسی قطعات پیش کئے ان میں سے بطور نمونہ یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

مومن و یاس ! عین بو العجبی
رحمتِ حق برائے ماست نبیؐ
نہ شنید ہی کہ ہم خدا فرمود ؟
سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلیٰ غَضَبِیْ !

بیمِ رنج و غمِ بلا با تست
مومن استی دایں چہابا تُست
حذر از خوف کُن دلیر بزی
مرد شو ، نعرہ زن ، خُدا باتُست

پوچھا ''اصلاح کے لیے لائے'' عرض کیا نہیں، اور دل دکھانے کیلیے سرخ پھول گلستان میں لایا ہوں، خواہ نادان سمجھئے خواہ دیوانہ گردانیئے" مسکرا کر فرمایا "فلاں فلاں الفاظ والے دوبارہ پڑھیے تعمیل ارشاد ہوئی، پھر فرمایا" مخلصانہ نصیحت کرتا ہوں کہ مطالعہ زیادہ کیجئے" پوچھا" فارسی زبان کا یا فن شاعری کا" فرمایا " کسی علم کا نہیں بلکہ دل کی کتاب کا" دریافت کیا" کیونکر'' فرمایا'' دل سے پوچھئے''۔ اب راقم کچھ جھجک گیا۔ کچھ مطلب پا گیا۔ اور کچھ یہ خیال کر کے خاموش رہا کہ شاید مزید سوال ملالِ طبع کا باعث ہو یا گستاخی کا مظہر۔

ایک دفعہ خودی کی حقیقت سمجھنے کے لیے حاضر ہوا۔ کیونکہ بعض صوفیہ میں اقبال کی خودی کے زیرِ بحث آ جانے پر چند نئی دریافت طلب باتیں سامنے آ گئی تھیں۔ ہر چند کہ ابھی ابھی چند کالجیٹ نوجوانوں کو یہی چیز بالوضاحت سمجھا چکے تھے، اور راقم نے بھی عرض کر دیا کہ پھر کسی دن حاضر ہو کر سُن لونگا آپ تکلیف نہ فرمائیے، مگر یہ علامہ موصوف کا خُلق تھا کہ پھر آمادہ ہو گئے۔ اور یہ فرما کر کہ

''درست۔ مگر خدا کو کیا جواب دوں گا کہ ایک مسکین درویش صفت مسلمان بھائی پوچھنے کیلیے آیا اور اُسے کسی دوسرے دن آنے کی تکلیف دی۔ مگر دولتمندی خاندانوں کے وضعدار نوجوانوں کو اسرار سمجھاتا رہا''

قصہ مختصر پندرہ منٹ اس حقیر کے لیے بھی صدقہ کیے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خودی انائے صغیر ہے اور قوت ایمانی کا دوسرا نام۔ اس سے زیادہ تفصیل کے لیے ان چند صفحات اور اس مختصر صحبت میں گنجائش کہاں۔

آخری علالت کے آغاز میں بیمار پُرسی کے لیے پہنچا۔ تو حقہ نوشی میں محو تھے چونکہ مجھ سے پہلے ایک صاحب نے اپنے نام کی چٹ اندر بھجوائی تھی اور خادم بھی مشہور عاشقِ اقبال یعنی علی بخش کی بجائے کوئی اور وہاں متعین تھا۔ اس لیے میں نے بھی نام کی چٹ بھجوادی۔ حالانکہ علیل تھے اور آواز کمزور مگر خادم کے ہاتھ کہلا بھیجنے کی بجائے وہیں سے آواز دے دی،

''آیئے یہ چٹوں کی قید آپ کے لیے نہیں''

"جب راقم کمرے میں داخل ہوا تو نوکر سے فرمایا" حقہ اٹھالے جاؤ۔ مولوی صاحب آئے ہیں"

عرض کیا "ایک تو مولوی نہیں ہوں، پھر حقے سے ایسی نفرت نہیں کہ سامنے پڑا ہوا بھی نہ دیکھ سکوں علاوہ ازیں اس سے پہلے میرے حاضر خدمت ہونے پر آپ نے اس بات کا التزام کبھی نہیں کیا تھا" فرمایا" اب آپ کے کچھ بال سفید ہو چکے ہیں اس لئے لحاظ بھی زیادہ ہونا چاہیے "

خیر، مزاج پُرسی کی فرمایا" علاج ہو رہا ہے" طریقِ علاج وغیرہ دریافت کیا، فرمایا "تفصیل کی کیا ضرورت، دوا تو ہو رہی ہے دعا کیجئے" عرض کیا" دعا نہیں بلکہ دعائیں کی جا رہی ہیں۔ مگر مجھ ایسے بے عمل کی دعا بھی کیا" آہ۔ اس پر آبدیدہ ہو کر فرمایا" اپنی نعتوں کو پیش کر کے یوں دعا کیجئے کہ اے رسولِ پاک کے اور سب کے آقا! میری نعتوں کو قبول کرتے ہوئے اس شخص کو صحت عطا کر جس کے یہ دو شعر ہیں

معنی حرفم کُنی تحقیق اگر

ہنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر

قوتِ قلب و جگر گرد د نبی

از خدا محبوب تر گرد د نبیؐ

کچھ نہ پوچھئے کہ اُن کے اس ارشاد پر آنسوؤں نے راقم کا کیا حال کیا۔ پھر اثنائے گفتگو میں سب سے پہلی ملاقات کا ذکر یاد دلایا گیا۔ جب آپ انارکلی میں رہتے تھے اور مرض نقرس میں مبتلا تھے اس پر فرمایا" آپ کی سب سے پہلی ملاقات بھی بیمار پُرسی تھی اور یہ شاید آخری ملاقات بھی بیمار پُرسی ہی کے لیے ہے "دعائے صحت و درازی عمر پر یہ ملاقات ختم ہوئی۔

مگر آخری ملاقات اس کے علاوہ ایک اور ثابت ہوگئی۔ اور وہ علامہؒ کی وفات کے کچھ ماہ قبل تھی یعنی جب آپ انجمن حمایت اسلام کی صدارت سے بوجہ علالت وضعف مستعفی ہونے کو تھے اس کی ایک وجہ تو وہی بیماری پُرسی مگر فوری سبب یہ ہوا کہ سرحدی علاقے کا ایک پٹھان یتیم لڑکا جو انجمن کے یتیم خانے میں داخل تھا۔ اُس کی بیوہ ماں بچاری کسی گھر میں خادمہ کا کام کرتی تھی اور راقم کے گھر اس کا بایں سبب آنا جانا تھا کہ وہ کسی اچھے گھرانے کی خاتون تھی اور پڑھی لکھی وہ ایک دن آکر فریادی ہوئی کہ اُسکے لڑکے کو یتیم خانہ سے نکال دیا گیا ہے اب خطرہ ہے کہ وہ بے علم رہ کر آوارہ ہو جائے گا۔ چنانچہ راقم اور محترم دوست خان عطاء الرحمان خان دونوں پہلے تو یتیم خانے میں گئے۔ حالات دریافت گئے معلوم ہوا کہ لڑکے کا چال چلن تو اچھا ہے صرف گستاخ ہے۔ مہتمم صاحب کے مشورے پر ہم سیکرٹری صاحب یتامیٰ کمیٹی کے پاس گئے مگر انہوں نے مایوس کن جواب دیا۔ اس پر ہم سیدھے صدر انجمن یعنی علامہ موصوف کی خدمت میں جا پہنچے سب سے پہلے عیادت کا فریضہ ادا کیا گیا۔ پھر معاملہ پیش کیا۔ فرمایا اُس کی والدہ کی طرف سے عرضی لکھا کر اپنے نوٹ کے ساتھ مجھے بھجوا دیجئے میں دوبارہ داخل کرنے کا حکم اُس پر لکھ دوں گا!

اس کے بعد ارشاد ہوا۔ غالباً آپ کی تسلی ہوگئی۔ اب اصلی حقیقت سے آگاہ کروں ''ہم دونوں نے عرض کیا۔ ضرور۔ آپ "ترجمانِ حقیقت "ہیں، حقیقت سے آپ آگاہ نہ کریں گے تو ہم اور کس سے دریافت کریں گے فرمایا

''جس علاقے اور جس نسل کا یہ نونہال ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہمارے ہاں کی موجودہ تعلیم اس سے خاندانی جوہر چھین لیگی۔ نہ یہ کہ بقول اُس کی والدہ کے یہ تعلیم نہ پا کر وہ آوارہ ہو جائے" ہمیں حیرت ہوئی جب لڑکے کی والدہ کو یہ نکتہ پسند آ گیا اور

اس نے لڑکے کو یتیم خانہ میں داخل کرانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔

اثنائے گفتگو میں علامہ کی تصنیفات کی اشاعت کا ذکر آ گیا۔ اس سلسلے میں راقم نے ایک تجویز پیش کی جو علامہ موصوف کی کتابوں کی اشاعت کا شوق رکھنے والوں کو شاید مفید ثابت ہو۔ عرض کیا۔ ''اس میں شک نہیں کہ حسنِ کتابت وطباعت اور کاغذ کی عمدگی سے آپ نے خصوصاً نظموں کی طباعت کا معیار بلند کر دیا ہے۔ مگر آپ کا کلام ذوق وشوق سے پڑھنے والے زیادہ ترغربا ہیں۔ اس لیے ایک دوسرے درجہ کی ارزاں اڈیشن بھی ہو تو بہتر ہے کتابت ایک ہی ہو صرف کاغذ کے فرق پر قیمت کم کر دی جائے۔ یا اُسی کاتب سے علیحدہ مگر گنجان لکھوا کر حجم بھی کم کر لیا جائے۔

فرمایا" یہ تجویز میرے ذہن میں بھی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ کم از کم قیمت پھر بھی عہ ضرور ہو ورنہ معیار گر جائیگا۔ " آخر جب کافی دیر ہو گئی تو عرض کیا گیا کہ آپ علیل ہیں لیکن آپ کو اس ملاقات اور ہماری باتوں سے تکلیف نہ ہو ۔اجازت چاہتے ہیں فرمایا کہ کوئی تکلیف نہیں، بلکہ راحت ہے۔ یہ ملاقات بھی علامہ موصوف کی اس خواہش کے اظہار پر ختم ہوئی کہ "دعا کرتے رہیئے" مگر ایسی ختم ہوئی کہ پھر قیامت ہی کو ہو تو ہو یہاں ناممکن ہے۔

راقم خود اپنے حق میں یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کی زندگی کے "با اقبال ' لمحے وہی تھے۔ جو اقبالؒ کے ساتھ بسر ہوئے۔

اقبال ایک تاثر

تصدق حسین خالد

بھائی صادق ان دِنوں لاہور اسلامیہ کالج میں بی اے میں پڑھتے تھے۔ ان کی آنکھیں خراب ہوگئیں۔ اور مجھے ان کے پاس لاہور جانا پڑا۔ وہاں ان کے ایک ہم جماعت اکبر منیر (جو لپسرور کالج میں پروفیسر رہے) ملے وہ اپنے کالج کے "ملک الشعرا" تھے۔ خوب شعر کہتے تھے۔ لیکن اکثر علامہ اقبال کے رنگ میں ملی نظمیں لکھتے تھے بھائی عزیز بھی اسلامیہ کالج ہی میں تھے اور اکبر منیر کے بڑے مداح۔ ان کی سب نظمیں اپنی بیاض مین نقل کر رکھی تھیں۔ میں نے ان سب کو پڑھ ڈالا۔ آپ مترنم الفاظ سے کام لیتے تھے اور مشکل لیکن شگفتہ قوافی اور ردیفیں استعمال کرتے تھے۔ میرے اس قیام لاہور کے زمانے میں (یہ ۱۹۱۸ کا ذکر ہے) میرے ایک بزرگ میاں سر فضل حسین مرحوم نے علامہ اقبال سے میرا تعارف کروایا۔ ماسٹر امیر حسن ناز نے آپ کی تمام نظمیں یک جا جمع کر رکھی تھیں یہ سب میری نظر سے گذریں۔ کچھ تو منیر صاحب سے والد شیخ شمس الدین مرحوم کی بات کا اثر تھا اور کچھ علامہ اقبال کی ملی شاعری کا، میں نے بھی ملی نظمیں کہنی شروع کردیں۔ اور طرز نگارش اکبر منیر کی اختیار کرلی۔

۱۹۱۸ء میں پہلے پہل میں نے رسالہ مخزن میں طبع ہونے کے لیے اپنے کچھ اشعار بھیجے میرے دوست مولوی (اب شمس العلماء) تاجور نجیب آبادی جو ان دنوں میرے واقف نہ تھے مدیر رسالہ تھے۔ ازاں بعد وقتاً فوقتاً اور اشعار بھیجتا رہا۔ اور ان سے خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا۔ اور فرمایا بھئی تمہاری فارسیت، الفاظ کے شکوہ اور فلسفیانہ اندازِ فکر کو دیکھ کر میں سمجھ رہا تھا کہ کوئی بوڑھا مولوی ہوگا۔

گورنمنٹ کالج میں ہر سال بہترین نظم لکھنے والے کو انعام ملتا تھا اور اس موقع پر ایک عظیم الشان تقریب ہوئی۔ ۱۹۲۱ء۔ ۱۹۲۰ء میں قاضی فضل حق مرحوم کالج کی بزم سخن کے صدر تھے اور میں سیکرٹری، کالج کے سب شعراء نے نظمیں لکھ کر مقابلہ کے لیے بھیجیں۔ جو علامہ اقبال مرحوم کی خدمت میں بغرضِ فیصلہ بھیج دی گئیں۔ لکھنے والوں کے نام

نظموں کے نیچے یا کسی اور حصہ میں نہ دیئے گئے۔ چند دنوں کے بعد قاضی صاحب نے مجھے بُلا کر فرمایا کہ تمہارے ساتھ تو ظلم ہو گیا ہے۔ میں نے عرض کی وہ کیوں کر؟ فرمانے لگے تمہاری نظم پر ڈاکٹر صاحب نے لکھ دیا ہے کہ اگرچہ یہ نظم باقی سب نظموں سے بہتر ہے لیکن اسے انعام نہ دیا جائے کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی طالب علم نے کسی اور سے لکھوا کر بھیج دی ہے۔ انعام میرے دوست اسد ملتانی کو ان کی نظم "تاج محل" پر ملا۔ میری نظم کا عنوان "پیغام سروش" تھا یہ ایک ملّی نظم تھی جس میں ڈاکٹر صاحب کے اسلوب کا پورے طور پر اتباع کیا گیا تھا۔

میں نے قاضی صاحب سے عرض کی کہ مجھے علامہ اقبال کا ریمارک سن کر رنج کے بجائے بے انتہا مسرت ہوئی ہے۔ قاضی صاحب نے علامہ موصوف سے اس کا ذکر کیا اور جب میں بعد میں کسی موقع پر ان سے ملا تو آپ نے اپنی غلطی پر بہت افسوس ظاہر فرمایا اور کہا مجھے خبر ملی تھی کہ کالج سے طلباء انعام حاصل کرنے کے لیے اوروں سے نظمیں لکھوا لیتے ہیں۔ اس لیے جب میں نے تمہاری نظم پڑھی تو خیال آیا کہ یہ نظم کسی طالب علم کی نہیں بلکہ کسی پختہ کار سے لکھوائی گئی ہے۔ میں مودبانہ آداب بجالایا۔ لیکن اس واقعہ کا یہ اثر ضرور ہوا کہ اس کے بعد میں نے کوئی ملی نظم نہ لکھی اور مزے کی بات یہ ہے کہ اسدؔ اب ملی شاعر ہے۔ ؎

مکرم معظم جناب خالو جان ۔ تسلیم
میں اب بفضل خدا اچھی ہوں ۔ ہر بات کی [illegible] آپ جب
فکر کیا کریں ۔ تو ابا جان کی کوئی بات خواہ اچھی
ہو خواہ بری کیا ہو ۔ بالکل نہ کیا کریں ۔ کیونکہ
والدہ صاحبہ کی زبان بالکل قابو میں نہیں رہتی ۔ جو کچھ
آتا ہے ۔ ہر وقت گیت بنایا کرتی ہے ۔ اور
ان کو ہر وقت بہت زبانی [illegible] ۔ فقط
زیادہ آداب ۔ فقط

علامہ کی بیٹی معراج بیگم کا اپنے خالو فیروز الدین کے نام خط جس میں اپنی والدہ کے مزاج پر برہمی کا اظہار کیا گیا ہے۔

میری یادیں

راؤصاحب

"ویسے تو میں ایک ورق پارینہ ہوں۔ آج سے کوئی ۶۰ سال پہلے کی بات ہے ۱۹۲۱ء میں، میں یہاں پرتاب سنگھ کالج کا متعلم تھا۔ ہمارے ایک پرنسپل تھے اقبال کرشن جو بڑے علم دوست تھے ان دنوں میں بھی ہم علامہ کے کلام پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ ریذیڈنسی کے منشی سراج الدین بھی علامہ اقبال کے کلام سے مشغف رکھتے تھے۔ انہی دنوں مجھے علامہ کے کلام سے عقیدت پیدا ہوئی پرنسپل صاحب نے کہا کہ یونیورسٹی کے ممتحن سے تعلق ہونا چاہیے تم لاہور کے کسی کالج میں جاؤ تو رابطہ ہوگا۔ لاہور اور دہلی کالج سے رابطہ فائدے کے لیے کیا تھا۔ اس خیال سے نہیں کہ فلسفیانہ گفتگو کروں۔ آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے۔ اقبال سے فیض حاصل کرنے نہیں گیا تھا۔ انارکلی کے سامنے ایک محراب دار مکان تھا۔ دالان میں ایک معمولی بینچ تھا۔ جس پر میں بیٹھ گیا اور اپنا کارڈ بھیجا۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ کیونکہ کارڈ پر لکھ کر بھیجا

"اس وقت مصروف ہوں پھر کبھی آئیے"

میں نے کہا ملاقات نہیں تو دیدار ہو جائے۔ ملازم سے معلوم ہوا کہ چھ سات بجے چہل قدمی کے لیے جاتے ہیں۔ میں نے اسی کارڈ کے اوپر لکھ مارا کہ علامہ خاکم بدھن آپ ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس بڑی دنیا میں محض آپ مصروف آدمی ہیں ایک غریب طالب علم کشمیر میں اپنی مصروفیتیں چھوڑ کر آپ سے ملنے آیا ہے "اتنی دیر میں ایک سفید قمیص اور سفید شلوار پہنے چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے آئے اور کہا

"برخوردار تمہاری تحریر بڑی گستاخانہ ہے مگر میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے آؤ اندر چلو سادہ سا کمرہ تھا۔ مجھ پر ان کی سادگی، قناعت اور استغنا کا اثر ہوا۔ وہ کوچ پر بیٹھے اور مجھ سے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ لیکن میں کرسی پر بیٹھنے کے بجائے انکے قدموں میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے بہت اصرار کیا۔ گفت وشنید ہوتی رہی۔ میں سوچتا تھا بار خاطر تو نہیں لیکن وہ باتیں کرتے رہے اور کہا بیٹھو۔ کشمیر سے متعلق باتیں ہوئیں جب میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو پوچھا" کیا میں پھر کبھی آنے کی جرات کر سکتا ہوں۔ کیا" اس گھر کے دروازے کھلے رہیں گے

''جب بھی گیا باریابی ہوتی رہی اور مجھے یہ فیضان ملتا رہا۔ اور میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے یہ فیض حاصل ہوا''۔

آوا صاحب سری نگر:۔ ماخوذ تشخص کی تلاش کا مسئلہ اور اقبال ص ۱۱۳
اقبال انسٹیٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی سرینگر

DAIRA-I-ADABIA

THE PREMIER LITERARY SOCIETY OF THE N.W.F.P.
(Affiliated to Anjaman-i-Taraqqi-i-Urdu Deccan.)

KISSA KHANI,
PESHAWAR CITY.

زیر سرپرستی خصوصی ترجمان حقیقت
شاعر مشرق علامہ سر اقبال مد ظلہ

No.______ Dated______________193

اقبال دائرہ ادبیہ پشاور کے سرپرستوں میں تھے۔ اس کا ایک ثبوت

شاعرِ مشرق کے حضور میں

چودھری عبدالحمید

علامہ اقبال کانفرنس منعقدہ لاہور ۲۱ تا ۲۳ اپریل کے دوران مجھے ریاض مجید صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا جنہوں نے بتایا کہ مکتبہ کارواں کے مالک چودھری عبدالحمید صاحب کی علامہ سے ملاقاتیں تھیں اور وہ افغانستان کے محکمہ تعلیم سے بھی کچھ عرصہ وابستہ رہے۔ چنانچہ میں ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کی معیّت میں مکتبہ کارواں پہنچا۔ چودھری صاحب سے مل کر یہ احساس ہوا کہ ابھی ایسے لوگ ہمارے معاشرے میں موجود ہیں جو پچھلی شرافتوں کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اقبال کے بارے میں ان سے جو گفتگو ہوئی اُسے میں نے گھر آ کے قلمبند کر لیا۔

چودھری صاحب نے بتایا کہ انہوں نے علامہ کو کئی موقعوں پر دیکھا لیکن ان سے گفتگو کا حوصلہ نہ ہوا۔ ایک دفعہ انقلاب اخبار میں علامہ نے "اپنی نئی کتاب "جاوید نامہ" کا تعارف کراتے ہوئے لکھا کہ یہ ان کے گھر سے دستیاب ہے چنانچہ میں ان کے گھر پہنچا لیکن ابھی کتاب شائع نہیں ہوئی تھیں۔ ایک ہفتہ بعد جب میں دوبارہ ان کے مکان پر پہنچا تو انہوں نے میری درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے مجھ قیمتاً کتاب دی۔ میری دلی خواہش تھی کہ علامہ اس کتاب پر اپنا نام لکھ کر پیش کریں لیکن میری خواہش بلکہ اصرار کے باوجود انہوں نے کتاب پر اپنے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ مجھے اس پر افسوس ہوا لیکن کچھ عرصہ بعد میں نے اس کا بدلہ لے لیا۔

"ہوا یوں کہ علامہ علی گڑھ گئے ہوئے تھے میں نے اس کتاب کی نئی جلد تیار کروا کے ان کے دفتری سے اس پر ڈائی کی مدد سے کتاب کا نام لکھوا دیا اور یہ کتاب اپنے استاد ظفر الحسن کے ذریعے علامہ کو دی تا کہ وہ اس پر دستخط کریں۔ علامہ کتاب کی جلد دیکھ کر چونکے۔ لیکن انہوں نے کچھ پوچھا نہیں اور خاموشی سے دستخط کر کے کتاب میرے حوالے کر دی۔ تب میں نے انہیں پرانا واقعہ یاد دلایا اس پر وہ محض مسکرا کے رہ گئے اور میری اس شرارت'' پر کوئی تبصرہ نہیں کیا''

انٹرویو ڈاکٹر صابر کلوروی ۲۴ اپریل ۲۰۰۳

"محراب گل افغان کے افکار کے باب میں اقبال نے محراب گل افغان کی زبان سے اپنے افکار اور خیالات ظاہر کیے ہیں۔ یہ ایک فرضی نام ہے اور اس کی ضرورت انہیں اس لیے محسوس ہوئی کہ انہوں نے بعض نظموں میں اسلوب بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ اس فرضی نام کے بغیر کلام میں تاثیر پیدا نہیں ہوسکتی۔ مثلاً پہلی نظم میں وُہ سرحد کے کوہستان سے خطاب کرتے ہیں اور اسلوبِ بیان اس امر کا متقاضی ہے کہ متکلم وہیں کا باشندہ ہو"۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی آگے چل کر بیان کرتے ہیں کہ

"دراصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دلِ میں ملّت کا درد اس درجہ تھا کہ اس کو میں بذریعہ الفاظ بیان نہیں کر سکتا وہ ساری عمر ملت اسلامیہ کے درد میں تڑپتے رہے۔ یہ مبالغہ نہیں ہے بالکل حقیقت ہے میں نے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۰ء تک چودہ سال ان کی صحبت میں گزارے اور میں شہادت دے سکتا ہوں کہ میں نے خود بارہا انہیں ملت کی بربادی کے غم ہیں بچوں کی طرح روتے دیکھا ہے اور اس درد کا راز یہ ہے کہ وہ سرکارِ دوعالمؐ سے بے حد محبت کرتے تھے اس لیے حضورؐ کی قوم کی تباہی ان سے برداشت نہیں ہوسکتی تھی وہ سمجھتے تھے کہ اگر افغانی بیدار ہو جائیں گے۔ تو شائد ایشیاء میں اسلام اور مسلمانوں کے سربلندی کا کچھ انتظام ہو جائے گا۔ اسلیے انہوں نے ساری عمر افغانوں کی خودی کو بیدار کرنے کی کوشش کی سن ۱۹۳۳ء میں افغانستان جانے سے کچھ دنوں پہلے میرے ایک اعتراض کے جواب میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ"

"تم جذباتی ہو اس لیے نادر شاہ سے ناراض ہو یہ دیکھو کہ بچہ سقہ کو ختم کر کے اس نے بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ میں جلب منفعت کے لیے نہیں جارہا ہوں مجھے محض اسلامی اخوّات کا جذبہ کھینچے لیے جارہا ہے کیا عجب کہ میں اس قوم کی بیداری میں کوئی حصہ لے سکوں" پھر کہنے لگے

"ہندوستان کے مسلمان تو کئی سو سال سے غلامی کی زندگی بسر کررہے ہیں انگریز کا مقابلہ اگر کر سکتے ہیں تو وہ مسلمان کر سکتے ہیں جو پشاور اور کابل کے درمیان علاقے میں رہتے ہیں کاش! کوئی اللہ کا بندہ ان کوہستانی شیروں کو بیدار کر سکے"

رعنا کاظمی اور اقبال

فارغ بخاری کا غیر مطبوعہ مضمون

رعنا کاظمی اور جگر کاظمی آپس میں چچازاد بھائی تھے اور دونوں میرے رشتے کے ماموں تھے جگر کاظمی ہندکو، اردو اور فارسی تین زبانوں کے شاعر تھے اور ان کا شمار یہاں کے اساتذہ شعراء میں ہوتا تھا۔ رعنا کاظمی انقلابی مزاج کا نوجوان تھا۔ عربی، فارسی زبانوں کا عالم، قرآن، حدیث، فقہ، منطق، حکمت تمام مروجہ علوم پر دسترس حاصل تھی۔ تحریک خلافت کا سرگرم رہنما اور برصغیر کی جنگ آزادی کا نڈر سپاہی۔۔۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ملک کے جن حریت پسند نوجوانوں کے خلاف سنگین الزامات کے تحت فرنگی حکومت نے بنایا اور بہت سے نوجوان رعنا کی قیادت میں علاقہ غیر میں پناہ لی اور وہاں سے افغانستان چلے گئے انکی منزل ترکی تھی لیکن وہاں منتشر ہو کر کچھ ترکی چلے گئے کچھ انگلینڈ، جرمنی اور مصر جا پہنچے۔ رعنا کاظمی حصول علم کی لگن میں ہرات جا کر وہاں ایک جید عالم علامہ نصیر الدین سے دو برس تک درس لیتے اور انکی ہدایت پر انکے دوسرے شاگردوں کو درس دیتے رہے۔

صوبہ سرحد کا ایک اور عالم اجل اور فارسی کا بے مثال شاعر علامہ ادیب پشاوری بہت پہلے ایران ہجرت کر چکے تھے ان سے رعنا کی ایک عرصہ سے خط و کتابت تھی وہ اسے ایران بلانے پر مصر تھے ہرات میں بھی ادیب پشاوری سے انکا رابطہ رہا اور آخر انکے اصرار پر علامہ نصیر الدین سے فارغ التحصیل ہونے کی سند لے کر رعنا ایران ادیب پشاوری کے پاس پہنچ گیا۔ جہاں انہوں نے اسے اپنے زیر تعلیم ہی رکھا اور اسے کسی نہایت اہم درسگاہ میں ملازمت بھی دلوادی۔ اسطرح پورے دس برس رعنا نے ایران میں گزار دیے اور دس برس کے بعد پشاور لوٹ آیا۔

یہاں علامہ ادیب پشاوری کے متعلق یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ انہیں ایران کی جدید شاعری کا رہنما مانا جاتا ہے اہل ایران جو زبان کے سلسلے میں علامہ اقبال پر بھی حرف گیری کرتے رہے ہیں۔ برصغیر کے متاخرین شعرا میں غلام ادیب پشاوری کی پرستش کی

حد تک عظمت کے قائل ہیں اور انکے بعد رعنا کاظمی کے علم وفضل اور شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے ہیں جس کا ثبوت ''تاریخ ادبیات ایران'' اور وہاں کی دوسری شعری ادبی تذکروں سے ملتا ہے۔

رعنا ایران سے لوٹ کر آئے تو میری عمر اس وقت سات برس تھی اور وہ تیس برس کے ہو گئے۔ مجھے یاد ہے انکے آنے سے سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی لیکن یہاں آ کر وہ خوش نہیں تھے ایک تو حکومت کی طرف سے قدم قدم پر انکی نگرانی ہو رہی تھی دوسرا مسلسل بیکاری انکے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ آدمی شاہانہ طبیعت کے تھے جو کچھ ایران میں کمایا بہت کم پس انداز کر کے ساتھ لائے جو چند مہینوں ہی میں ختم کر بیٹھے۔ ان کے بڑے بھائی دلاور شاہ جو کلاہ دوزی کا کام کرتے تھے اور ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنے کسب میں علامہ روز گار تھے وہی رعنا کے کفیل بنے رہے لیکن انکے بھائی بھی تند مزاج تھے اور یہ بھی میر بد دماغ واقع ہوئے تھے اسلیے بھائی سے انکی بنتی نہ تھی ہمیشہ انکی آپس میں ٹھنی رہتی اور آخر میں تو تنازعہ یہاں تک بڑھا کہ وہ الگ ہو کر محلہ گنج میں ایک کرائے کے چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے جہاں فقر و فاقہ تک نوبت جا پہنچی۔ انکے قدر دانوں کی یہاں بھی کمی نہ تھی لیکن آدمی بے حد خود دار تھے کسی کی اعانت گوارا نہ کرتے تھے

سُنا ہے ایک خاتون انکی مدد کرتی تھی جو انہیں چاہتی بھی تھی اور شادی کرنے کی آرزو مند تھی لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر انہوں نے اس سے شادی کرنا پسند نہ کیا

علامہ اقبال سے انکے مراسم اسطرح رہے کہ علامہ مرحوم نے ایک مصرع میں " سی پارۂ دل" باندھا تھا انہوں نے ایک خط میں اس مصرعے کی اصلاح کرتے ہوئے "پارۂ دل" کر دیا اور انہیں لکھا کہ "سی پارۂ دل" غلط ہے۔ علامہ نے یہ اصلاح قبول کر لی اور یہ شعر انکی کتاب میں اصلاح شدہ صورت میں شامل ہے۔

اس طرح علامہ اقبال سے ان کے مراسم استوار ہوئے انہوں نے انہیں لاہور بلایا اور انکے علم وفضل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ گرامی مرحوم کی طرح ان سے استفادہ کرتے رہے۔ کسی طرح رعنا کی بدحالی کی بھنک بھی انہیں پڑی اور وہ غیر محسوس طور پر اُسکی کچھ مدد بھی کرتے رہے۔ اور اسے مشورہ بھی دیا کہ والئی دکن کا ایک قصیدہ لکھو اور وہ اسے وہاں ملازمت دلوا دینگے لیکن رعنا نے یہ گوارا نہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد حکومت نے رعنا کو نوٹ بنانے کے فرضی الزام میں ملوث کر کے گرفتار کر لیا اور سنٹرل جیل لاہور بھجوا دیا جہاں علامہ اقبال کی کوششوں ہی سے چند ماہ کی حراست کے بعد اسے رہائی ملی۔

اسی اثنا میں نادر شاہ والئی افغانستان نے افغانستان کی تاریخ لکھنے کے لیے دو موزوں ادیبوں کے نام تجویز کرنے کے لیے لکھا۔ علامہ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور رعنا کو بڑی مشکل سے راضی کرنے کے بعد ایک رعنا کاظمی کا نام اور

دوسرا جلال پور جٹاں (گجرات) کے ڈاکٹر عبدالغنی کا نام لکھ بھیجے جسے منظور کرتے ہوئے معقول مشاہرہ پر انہیں یہ کام کرنے کی منظوری دیدی گئی۔

ڈاکٹر عبدالغنی امیر عبدالرحمن خان والئی افغانستان کے عہد میں ایک باوقار منصب پر کابل میں فائز رہ چکے تھے اور علم وفضل میں ممتاز شخصیت رکھتے تھے انہوں نے امیر کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی مولوی نجف علی خان کو بھی جو پنجاب میں منصفی کے عہدے پر تھے اپنے پاس بلالیا جسے شہزادہ امان اللہ خان کا اتالیق مقرر کیا گیا۔

ڈاکٹر عبدالغنی نے والئی افغانستان کی منظوری کے بعد رعنا سے رابطہ قائم کیا اور جب پشاور آ کر ان کی سقیم حالت دیکھی تو اسے اپنے ہمراہ جلال پور جٹاں لے گئے جہاں دونوں نے مل کر تاریخ افغانستان پر کام شروع کیا ڈاکٹر عبدالغنی رعنا کی علمیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی لڑکی سے انکی شادی کر دی لیکن بد قسمتی سے ایک سال کے اندر ہی رعنا نمونیہ کا شکار ہو کر انتقال کر گئے۔

اقبال اور علامہ مشرقی

فارغ بخاری صاحب نے ۲۱ ستمبر ۱۹۸۱ء کو میری درخواست پر یہ مضمون لکھا۔ (ص۔ک)

نابغہ روزگار شخصیتیں بہت کم ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں اقبال اور علامہ مشرقی کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ پاکستان بننے کے بعد تو مشرقی صاحب نے اقبال کی شاعری کی تکذیب میں سارا زورِ قلم صرف کر دیا۔ تاہم ابتدا میں ان کی رائے علامہ کے بارے میں اچھی تھی۔ درج ذیل نوٹ علامہ مشرقی کا علامہ اقبال کو خراج عقیدت ہے۔

''شاعری سے مجھے کسی زمانے میں کم از کم ایک ہزار دیوان نوکِ زبان ہونے کے باوجود کچھ رغبت نہیں رہی۔ میں لکھ چکا ہوں کہ جو قوم اپنے اندر بڑے شاعر پیدا کر رہی ہے وہ بڑے زوال کے چکر میں ہے۔ محترم علامہ اقبال صرف شاعر نہ تھے بلکہ شاعری کو پیغمبری کا جزو سمجھ کر اس کو بڑا روحانی عمل یقین کرتے تھے۔ اس ذوقِ یقیں نے قوم میں اثر پیدا کیا اور آج جبکہ ان کی روح والہانہ طور پر طلبِ ثواب کے لئے رب بریں کے عرش کے سامنے کھڑی ہے آؤ ہم سب اس مداحِ دینِ رسول ﷺ کے لئے نہ صرف مغفرت کی دعا مانگیں بلکہ گڑگڑا کر اس کے لئے طلبِ اجر کریں کیونکہ محترم اقبال ایک انسان تھا جو قوم کے دل پر ادنیٰ ساز خم سہی لیکن لگا کر گیا۔ اب قوم کا کام ہے کہ اس کی تعلیم پر عمل کر کے اس کی روح کی خوش رکھے۔''

عنایت اللہ خان (المشرقی) ۲۶ اپریل ۱۹۳۸ء شائع شدہ الاصلاح ۲۹ اپریل ۱۹۳۸ء

کچھ بھولی بِسری یادیں

ڈاکٹر ہیرالال چوپڑا
ایم۔اے۔ڈی لٹ

ترجمہ:۔ بادشاہ منیر بخاری
لیکچرار شعبۂ اردو پشاور یونیورسٹی

میں نے پہلی بار ڈاکٹر محمد اقبال کو نومبر ۱۹۱۷ء میں دیکھا جب پہلی عالمی جنگ اپنے عروج پر تھی۔ اتحادی جنگ ہار رہے تھے اور پنجاب کے عوام کا حوصلہ بلند رکھنے کے لیے یعنی ہندوستان کے بازوے شمشیرزن کو، جو لڑنے والی افواج کی سب سے بڑی تعداد مہیا کرتا تھا اور توپچی کی حیثیت سے مزید سپاہیوں کی ضرورت پوری کرسکتا، پنجاب کے وار پبلسٹی بورڈ کی طرف سے لاہور کے برکت علی محمڈن ہال میں ایک بہت بڑے اردو مشاعرے کا انتظام کیا گیا جس میں دہلی اور پنجاب کے شعراء نے اپنا کلام پڑھ کر سُنایا تا کہ پنجابیوں میں اور زیادہ جوش وخروش پیدا ہو۔

ڈاکٹر محمد اقبال بھی مشاعرے کے ججوں میں سے ایک تھے جنہوں نے دہلی کے منشی مہاراج بہادر برق کو پہلا انعام، لاہور کے عبدالماجد ازل کو دوئم اور میانوالی کے منشی تلوک چند محروم کو سوئم قرار دیا۔ ڈاکٹر اقبال نے نتیجے کا اعلان کیا جس پر دیر تک نعرے اور تالیاں بجتی رہیں۔ میرے والد محترم، علاج معالجے کے پیشے سے تعلق رکھنے کے باوجود خود بھی اردو کے ایک شاعر تھے اور اقبال کی شاعری کے ایک سچے عاشق بھی۔ وہ ایک مشترکہ دوست، ''اردو دیش'' ''پبلک'' اور ''ہمالیہ'' کے ایڈیٹر مسٹر دینا ناتھ کے توسط ان سے ملے بھی تھے۔ میری عمر اگر چہ ابھی 11 برس سے کم تھی۔ اقبال کی کئی نظمیں میں نے یاد کر لی تھیں جو میں نے مختلف اردو رسالوں میں پڑھی تھیں۔ اقبال کی ذات کو دیکھ کر میں واقعی خوشی سے پھولا نہ سمایا۔

ایک سال بعد دوبارہ، جب اتحادی جنگ جیت گئے لاہور کی بریڈلا ہال میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت اس وقت کے پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اڈوائر نے کی۔ یہاں پھر ڈاکٹر اقبال جج بنے۔ لیکن مجمع نے اصرار کیا کہ ڈاکٹر اقبال خود بھی کچھ اشعار پڑھ کر سنائیں۔ انہوں نے پانچ فارسی اشعار پڑھ کر سنائے۔ جن کا عنوان تھا ''تقدیر کی تقسیم'' جسے میں اس وقت سمجھنے سے قاصر رہا۔ لیکن وہ مجھے ٹھیک ٹھیک یاد ہو گئے۔ وہ اشعار اقبال کی مطبوعہ کتابوں میں کبھی شائع نہیں ہوئے۔

۱۹۲۴ء میں ان کی اردو نظموں کا پہلا مجموعہ ''بانگِ درا'' شائع ہوا اور میں نے ان سے ان کی میکلوڈ روڈ کی رہائش گاہ میں اس پر آٹو گراف لکھوایا۔ یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو پہلے ہی انہیں اعزاز سے نوازا جاچکا تھا اوران کی دو فارسی کتابیں اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی شائع ہو چکی تھیں ان کے انگریزی میں ترجمے ہو چکے تھے اور مشرق اور مغرب سے تعلق رکھنے والے مستشرقین کے قلم سے موافقانہ تبصرے بھی کیے گئے تھے

۱۹۲۶ء میں اقبال، پنجاب لیجسلیٹیو (Legislative) کونسل کی رکنیت کے لیے الیکشن لڑے اور اپنے انتخابی پروپیگنڈے کے جلسوں میں ہر شام وہ اپنی نظمیں پڑھ کر سنانے لگے۔ ہم اس وقت کالج کے لڑکے ان جلسوں میں شریک ہوتے اور اکثر اقبال کے حق میں تقریریں کرتے۔ ۱۹۲۹ء میں جب میں ایم۔اے فارسی کی تیاری کر رہا تھا کثرت سے ان کے گھر ان سے ملنے جایا کرتا اور دیکھتا کہ اگر چہ وہ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے الہ آباد مشن کے لیے صدر منتخب ہو گئے تھے جہاں انہوں نے اپنے دوقومی نظریہ کا اعلان کیا، لیکن اپنی نجی زندگی اور معاملات میں مطلقاً غیر فرقہ وارانہ رویہ رکھتے تھے۔ میں اپنے ایم۔اے فائنل میں فرسٹ کلاس کے ساتھ فرسٹ آیا اور پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔اے فارسی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی کو فرسٹ کلاس ملی تھی۔ آج بھی پنجاب یونیورسٹی میں رائج یہ دستور ہے کہ ایم۔اے میں امیدواروں کو جو رول نمبر دیے جاتے ہیں وہ شعبہ رازداری کی طرف سے تبدیل کر دیئے جاتے ہیں تا کہ جب حل شدہ پرچے ممتحنین کو جانچنے کے لیے بھیجے جائیں تو ان کو امیدواروں کے تشخص کا پتہ نہ ہو۔ آخر میں جب ممتحنین کا بورڈ جانچ پڑتال کرنے اور نتیجے کے اعلان کے لیے بیٹھا تو انہیں معلوم ہوا کہ ایک طالب علم جس نے پہلی بار فرسٹ کلاس کے ساتھ یونیورسٹی ٹاپ کیا ہے وہ ایک غیر مسلم ہے۔ (یعنی میں) بورڈ کے کچھ ارکان نے تجویز پیش کی کہ چند نمبر گھٹا دیئے جائیں اور سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے طالب علم کو سیکنڈ کلاس دے دی جائے۔ ڈاکٹر اقبال اس تجویز کی پرزور مخالفت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے ساتھیوں کو اس بات کی ہرگز اجازت نہ دی کہ وہ اپنے ہی نتائج پر نظر ثانی کریں اور فرسٹ کلاس کے ساتھ میرے کامیاب ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس واقعے سے اقبال کی اعلیٰ درجے کی قانون پسندی اور زندگی میں ان کے غیر فرقہ وارانہ رویے کا واضح اظہار ہوتا ہے۔

اقبال کے عمر بھر کے دیرینہ دوست سر عبدالقادر مرحوم جس نے اقبال کی نظموں کو اپنے ماہانہ مخزن لاہور میں شائع کر کے اردو دان دنیا میں انہیں شہرت عام سے نوازا، انہوں نے یہ حقیقت خود مجھ سے بیان کی کہ بیسویں صدی کے شروع میں عیسائی مبلغین خاص کر عیسائی اُستاد اسکولوں اور کالجوں میں ہندو اور مسلمان طلبہ کی ایک بڑی تعداد کو تبدیلی مذہب کی طرف مائل کر رہے ہیں اور ان کو نفع بخش ملازمتوں کا لالچ دے رہے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائیت قبول کر لیں۔ کچھ سنجیدہ اہل دانش کی طرف سے محسوس کیا گیا کہ اس لہر کو روکنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے اور پروفیسر محمد اقبال، سردار جوگندر سنگھ، شیخ عبدالقادر اور ذوالفقار علی خان قزلباش، (جن کو بعد کی زندگی میں خطابات سے نوازا گیا) ان سب نے مل کر ۱۹۰۳ء میں نوجوانوں کی عیسائی مجلسوں کے مقابلے

میں نوجوانوں کی ہندوستانی ینگ مین کرسچین ایسوسی ایشن کے جواب میں ایک ینگ مین انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔

انہوں نے مشہور انقلابی لالہ ہردیال کو بھی اپنے ساتھ اس کے سیکرٹری کی حیثیت سے شامل کر لیا (جس نے بعد میں یو۔ایس۔اے کے اندر غدر موومنٹ کی بنیاد ڈالی، اور وہ اس وقت لاہور میں ایم۔اے کا ایک طالب علم تھا۔

فروری ۱۹۰۴ء میں اس ایسوسی ایشن نے اپنی پہلی سالگرہ منائی اور سوامی رام تیرتھ (جو ڈاکٹر اقبال کے دوست تھے اور جنہوں نے فارمن کرسچین کالج لاہور میں (Mathematics) کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے بعد سنیاس لے لیا تھا اور جو سوامی وایوکانندا کی پیروی میں ویدانت کو پھیلانے کے لیے یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ کا دورہ کر رہے تھے) ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنا ایک مضمون بھیجیں جو جلسے میں پڑھا جائے گا انہوں نے ''ہندوستان پر مغرب کا روحانی قرض'' کے عنوان سے اپنا لیکچر بھیج کر ممنون احسان کیا۔اس جلسے کے لیے پروفیسر اقبال نے اپنا مشہور قومی ترانہ ''ہندوستان ہمارا'' منظوم کیا جو ماہنامہ مخزن میں شائع ہوتے ہی بہت جلد ملک میں رواج پا کر عام ہو گیا۔سر رمزے میکڈونلڈ (بعد کے انگلینڈ کے وزیر اعظم) نے اپنی کتاب ''ہندوستان کی بیداری'' میں جسے برطانوی حکمرانوں نے داخل نصاب کیا، انھوں نے ذکر کیا ہے اس نظم نے پورے شمالی ہند میں ایک قومی ترانے کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔

گوتم بدھ، رام چندر جی، گرونانک، ٹیپو سلطان اور سوامی رام تیرتھ کو اقبال کا خراج عقیدت، اور ہمالیہ، گاتری، جلیانوالہ باغ، کشمیر ٹریجڈی، خلافت وغیرہ کے متعلق ان کی نظمیں ہندوستان کی نسبت پر جوش جذبہ حب الوطنی کا ٹھوس ثبوت ہیں۔وہ اول تا آخر ایک ہندوستانی تھے۔

ڈاکٹر محمد اقبال کے سال پیدائش کے متعلق ایک غیر ضروری اختلافی مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ایک بہت غریب خاندان میں پیدا ہوئے اور یہ بات ان کے والد شیخ نور محمد کے ذرائع آمدنی میں ممکن نہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے وسائل مہیا کر سکیں اور یہ کہ خاندان میں کوئی دوسرا کمانے والا فرد ہو جو آمدنی میں اضافہ کر سکے۔اقبال نے قدرے تاخیر سے سکول جانا شروع کیا۔جبکہ اس وقت مسلمانوں میں رائج دستور کے مطابق انہیں ابتدائی حروف تہجی کی تعلیم مکتب میں حاصل کرنا پڑی

ایک مرتبہ وہ اسکول میں داخل ہو گئے تو اپنی پڑھائی میں ہونہار ہونے کے باعث اپنی تعلیم جاری رکھنا۔ان کے لیے ایک آسان سفر ہو گیا۔خاص کر جب ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے جو عمر میں چودہ سال ان سے بڑے تھے۔پہلے ہی کمانا اور خاندان کی مالی مدد کرنا شروع کر دیا تھا۔

خاندان کے کچھ بڑے سن رسیدہ افراد کے بیانات کے مطابق یہ بات مستند طور پر یقین سے کہی جاتی ہے کہ اقبال ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے، اگر فروری نہیں تو نومبر میں۔اس حقیقت کی تائید بلدیہ کے ریکارڈ سے بھی ہوتی ہے۔دو مزید شہادتیں ۱۸۷۳ء کے حق میں موجود ہیں۔اقبال پر سر عبدالقادر کا ایک مضمون ''گریٹ مین آف انڈیا'' ہندوستان کے بڑے آدمی میں شامل

ہے۔ جس کو رشبروک ولیمز نے مرتب کیا اور اقبال کے انتقال (۱۹۳۸ء) کے بعد ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں سر عبد القادر نے شاعر کی پیدائش کی تاریخ دی ہے جو ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء ہے۔ یہ تاریخ انہوں نے خاندان کے افراد کی تصدیق کے بعد درج کی ہے۔ منشی محمد دین فوق کشمیری نے شاعر کی مدت حیات کے دوران اردو میں ایک کتاب لکھی، جس میں وہ بھی خود شاعر سے تصدیق کے بعد یہی تاریخ درج کرتے ہیں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ دونوں مصنف شروع ہی سے یعنی اقبال کے دور شاعری کی ابتداء ہی سے ان کے بہت قریب رہے۔ ان دونوں کی طرف سے درج کیا گیا سال ولادت مستند ہے۔ ۱۸۷۷ء کا سال اقبال کے کچھ مداحوں کا ایسا خیال ہے جو بعد کی پیداوار ہے۔ وہ اس حقیقت کو ہضم نہیں کر سکے کہ کہ شاعر نے اپنا انٹرنس کا امتحان ۲۰ سال کی عمر میں ۱۸۹۳ء میں پاس کیا ہوگا۔

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL,
M.L.C.
BARRISTER-AT-LAW.

۲۶ جولائی

جناب سردار صاحب السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مل گیا ہے جس کے لیے شکر گزار ہوں

الحمد للہ خیریت ہے۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ اپنے مقاصد میں

کامیاب ہوئے۔ الحمد للہ

زیادہ کیا عرض کروں۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا

مخلص محمد اقبال

میں جب بھی لاہور آتا تھا تو چند لوگوں کو چھوڑ کر جیسے ظفر علی خان تھے، جو ایک بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے ان سے ملتا تھا اور گھنٹہ آدھ گھنٹے کی ملاقات کے بعد چلا آتا تھا۔ علامہ اقبال سے میری ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب وہ بھوپال میں قیام پذیر تھے۔ اس کے بعد پانی پت میں یوم حالؔی کے سلسلے میں آئے تھے۔ میں بھی گیا تھا۔ تو ۱۹۳۵ء میں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ لیکن ان کی فراخ دلی کا ایک ثبوت میرے پاس ہے۔ اس کا میں ہمیشہ قایل رہا اور اس کا میں ہمیشہ ذکر کرتا ہوں ۱۹۳۰ء میں میں نے شوپہنار۔ مشہور جرمنی حکیم فلسفی پر مختصر سی کتاب لکھی جسے خود میں نے شائع کیا تھا۔ اس کتاب کو میں نے دو آدمیوں کے پاس خصوصیت کے ساتھ بھیجا تھا۔ ایک تو ڈاکٹر اقبال کے پاس، دوسرے عبدالماجد دریا آبادی کے پاس، اس لئے کہ انہوں نے فلسفے کی ابتدا کی۔ جدید فلسفے کی۔ مغربی فلسفے کی۔ ابتدا اُردو میں کی۔ کسی زمانے میں عبدالماجد دریا آبادی فلسفی مشہور تھے پھر وہ صوفی ہوگئے تو دو خط میں نے دونوں کو لکھے میں نے دونوں سے کہا کہ آپ اسے پڑھیں۔

اگر کسی لحاظ سے بھی قابل قدر پائیں تو میری ہمت بڑھائیں۔ حوصلہ بڑھائیں۔ تاکہ میں اس طرح اور مغربی مفکروں پر اتنی ہی مختصر کتاب لکھتا رہوں۔ میرا ارمان یہ تھا مگر عبدالماجد دریا آبادی نے اس پر اپنی رائے نہیں دی۔ درمیان میں خواہ مخواہ میری اس سے بدمزگی ہوگئی۔ میری طرف سے تو بدمزگی تھی نہیں میں ہمیشہ انہیں سلام کرتا رہا اور وہ ہچکچاتے رہے مجھ سے، لیکن میں ڈاکٹر اقبال کا قائل ہوں۔

انہوں نے غالباً سات دن بعد میرے خط کا جواب اور میری کتاب کی رسید دیتے ہوئے لکھا کہ آج مجھے معلوم ہوا کہ اُردو زبان بھی اس قابل ہے کہ اس میں فلسفے کو ادب بنا کر پیش کیا جا سکے یہ بہت بڑا اخراج تھا۔ اگر کسی دوسرے کے پاس یہ خط ہوتا تو وہ سونے کے فریم میں اس کو محفوظ رکھتا۔ لیکن میرے پاس خطوط جمع تو رہتے ہیں مگر میں ان

علامہ مجنوں گورکھپوری کی نظر میں

کی خاصی احتیاط کے ساتھ حفاظت نہیں کرتا۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد مسلم لیگیوں کے گھروں پر دھاوا بولا گیا۔ چونکہ میرے والد مسلم لیگ کے چیف وھپ تھے، یوپی اسمبلی میں اور مشرقی یوپی میں انہوں نے مسلم لیگ کو مستحکم کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اس وجہ سے وہاں تلاشی آئی۔ تو میرے پاس بھی تلاشی آئی اور تلاشی سے چند منٹ پہلے، میرے دو سوٹ کیس تھے۔ جن میں میرے دوستوں کے خطوط تھے، کچھ عزیزوں کے خطوط تھے، کچھ مختلف میدان میں ہمارے رفقائے کار تھے ان کے خطوط تھے، اسی میں ڈاکٹر اقبال کا بھی خط تھا میں نے سب کو نکالا۔ اور اس خیال سے کہ یہ ظالموں کے ہاتھ لگیں گے تو بے حرمتی ہوگی، مٹی کا تیل چھڑک کر خود آگ لگادی۔ اس طرح یادگار خطوط کا سرمایہ ضائع ہوگیا۔ بہرحال ڈاکٹر اقبال سے میری خط و کتابت تھی اور ان سے ایک آدھ اور بھی ملاقات ہوئی۔

(ارمغان مجنوں (۱۹۸۰ء) سے اقتباس) ص ۸۹۔۹۹ شائع کردہ مجنوں اکیڈیمی معرفت 'افکار' والسبن روڈ کراچی

اقبال کی ایک یادگار تحریر

"برصغیر کی تقسیم سے قبل ۱۹۲۹ء کی ایک یادگار تحریر جو علامہ اقبال نے پنجاب کے ایک مشہور انگریز نواز مسٹر ایم بی گوہر مرحوم سپیشل آرمی ریکروٹر جنگ عظیم اول ۱۹۱۴ء کے بارے میں لکھی:-

This is to certify that M. B. Gauhar has done good service to govt. in various capacities for which he holds sanads & testimonials. I have read some of them, and have no hesitation in saying that he deserves some kind of recognition for his loyal services to govt. I understand that he did all this as a matter of duty & not for the sake of reward as several other people did.

Lahore
27th Apr 1929.

Muhammad Iqbal M.A.,
Barrister-at-Law, Ph.D., M.L.C.,
Lahore.

اقبال اور عطیہ بیگم

درج ذیل تحریر ہر ہائنس نازلی رفیعہ سلطان نواب بیگم صاحبہ کے سفر یورپ کا روزنامچہ ہے جس کو محترمہ زہرا بیگم فیضی نے مرتب کیا تھا اور یونین اسٹیم پریس لاہور سے ''سیر یورپ'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس سفرنامہ میں دو ایک جگہ اقبال کا ذکر بھی آیا ہے۔ اقبال ان دنوں انگلستان میں بسلسلہ تعلیم مقیم تھے۔ واضح ہو کہ بیگم صاحبہ عطیہ فیضی کی ماں تھیں۔

۲۰ مئی ۱۹۰۸ بروز بدھ

''ڈاکٹر انصاری جو ازہر کے دوست ہیں بہت لائق آدمی ہیں ہمیں ملنے آئے اور بہت دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ آپ اصل میں لکھنو کے رہنے والے ہیں۔ یہاں انہیں ہز ہائی نس نظام دکن کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے۔ سب امتحان پاس کر چکے ہیں اور یہیں لندن میں انہیں کام مل گیا ہے۔ یہاں انہیں بیس پونڈ (تین سو روپے) ماہوار ملتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کی بہت تعریف کرتے تھے۔ اقبال ایک دفعہ آئے تھے مگر اس وقت حضور تشریف نہیں رکھتے تھے! حضور کو ان سے ملنے کا شوق ہے۔ مگر پھر نہیں آئے۔'' (ص ۲٦)

۱۰ جون ۱۹۰۸ بروز بدھ

''لنچ کے بعد مسٹر رومیش چندر دت صاحب نے ہم چاروں کو بلایا تھا (اس کے بعد) ہم سب واپس چلے آئے کیونکہ میں نے ان عنایت فرماؤں کو چائے کی دعوت دی تھی جن کی مہمان داری سے فائدہ اٹھایا تھا۔ مگر افسوس کہ بہت تھوڑا مجمع ہوا۔ تاہم مسٹر اور مسز بوکینن، مس ساموئیل مسٹر ساسون اور مس ساسون، آنریبل مس کنیرڈ جن کے بھائی لارڈ کنیرڈ ہیں۔ بھائی قمر الدین، بھائی ازہر، مسٹر محمد اقبال اور مس پی کے رے موجود تھے۔ نہایت لطف کا وقت کٹا۔ مسز ساموئل بہت لیاقت والی اور اچھی محبت بھرے دل والی ہیں۔ انہیں یہ بھاتا ہے کہ ہمارے لئے ہر طرح کی مدد کریں شنبہ ان کے ساتھ ہسپتال ملاحظہ کرنے کو چلیں گے مسٹر بوکنین ہم کو ہاؤس آف کامنز دکھانے والے

ہیں۔ تاریخ بعد میں مقرر کریں گے۔

کئی مہمانوں نے دستخطوں کی کتاب میں اپنے دستخط اور عبارتیں لکھیں مسٹر اقبال نے اس روز یہ شعرفی البدیہ یہ کہہ کر میری کتاب میں درج کر دیے جنہیں میں یہاں نقل کرتی ہوں۔

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر — اور فیضِ آستاں بُوسی سے گل بر سر قمر

روشنی لے کر تری موجِ غبارِ راہ سے — دیتا ہے لیلائے شب کو نور کی چادر قمر

کاروانِ قوم کو تجھ سے ہے زینت اس طرح — جس طرح گردوں پہ صدرِ محفل اختر قمر

شمع بزمِ اہلِ ملت راچراغ طور کُن

یعنی ظلمت خانہ ما را سراپا نور کُن

حواشی:

۱؎ اشارہ عطیہ فیضی کے والد نواب سر سیّدی احمد خان بہادر جی سی آئی ای کی طرف ہے

(ماخوذ 'سیر یورپ' مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور)

ے چند اوراق

ں پر روشنی پڑتی ہے

نے اقبال سے کہا کہ وہ سب سوال لکھ دیں تو جواب دیا کہ کیا فائدہ موقع سے کہا وہ سن لیا بس کافی ہے اس کو لکھنے کی ضرورت نہیں"۔

عطیہ بیگم نے ۹ اپریل ۱۹۰۷ء کو لکھا "آج اقبال نے فرایس کیمبرج کے یہاں مجھے عصرانے پر بلایا اس موقع پر میں نے چند تعریفی کلمات کہے تو انہوں نے فرمایا: میں ایک ذات میں دو شخصیتوں کا حامل ہوں ان میں بیرونی شخصیت وہ ہے جو قابل مطالعہ اور قابل مشاہدہ ہے جو عملی اور فعال ہے اور دوسری شخصیت جو میری داخلی شخصیت ہے وہ ایک خواب دیکھنے والے اور فلسفی

عطیہ فیضی کی ڈائری کا ایک ورق: جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاً یہ ڈائری اردو میں لکھی گئی تھی جسے بعد میں انگریزی میں منتقل کیا گیا۔

علامہ اقبال اور پختون شخصیات

پرویش شاہین

شاعر اسلام علامہ محمد اقبال نے پوری دنیائے اسلام کی تاریخ کو گہری نظروں سے پڑھا تھا۔ اور مسلمانانِ عالم کو اچھی طرح پرکھا تھا۔ اپنے گہرے مشاہدے اور سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ:

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندہ صحرائی یا مردِ کوہستانی

لیکن بعد میں جب بندہ صحرائی بھی ان کی نظروں سے گر گئے تو اب ان کی ساری توجہ مردِ کوہستانی (پشتون) پر تھی اور دنیا کی امامت کے لیے وہ ان سے کچھ کرنے کی اُمید لئے بیٹھے تھے۔ مردِ کوہستانی سے اسی وجہ سے انہیں بڑی عقیدت تھی اور انہوں نے ان سے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ ان کوہستانیوں کے علاقوں کو انہوں نے بچشم خود دیکھا تھا۔ اور ان کی عظیم تاریخ اور عظیم روایات کو پڑھا تھا۔ ان کی اسلام دوستی، سادگی، جذبہِ حریت، مہمان نوازی، وطن دوستی اور اعلیٰ اخلاق کی پاسداری سے آپ بے حد متاثر ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں، میں ان کو جگہ جگہ سمویا ہے۔

پشتون شخصیات اور علامہ اقبال کے موضوع پر کچھ نہ کچھ کام تو ضرور ہوا ہے۔ لیکن زیادہ تر اُن میں اُن شخصیات کا انتخاب کر لیا گیا ہے۔ جو یا تو بادشاہ تھے، وزیر تھے، اعلیٰ افسران تھے، بڑے بڑے اور جیّد علماء تھے، بڑے بڑے شعراء آزادی کے علمبردار اور فلسفی تھے۔

لیکن ان کے علاوہ بہت سی ایسی شخصیات بھی ہیں۔ جو کسی نہ کسی طور پر اونچے لوگ تھے۔ اور علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری دی تھی۔ ان سے مشورے مانگے تھے، ان سے کچھ کرانے گئے تھے یا صرف ان سے بے پناہ عقیدت کی وجہ سے ان کی زیارت کے لیے گئے تھے۔

آج کی نشست میں ہم اس قسم کی بہت سی شخصیات میں سے چند ایک کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

حکمران ریاست سوات:

میجر جنرل محمد عبدالحق جہانزیب خان (۱۹۰۸۔۱۹۸۴) ۱۹۴۹ء میں سوات کے حکمران بنے ان کی بے پناہ صلاحیتوں کی وجہ سے ریاست سوات بڑی مستعدی کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی۔ان کی اور بہت سی کرم فرمائیوں کے علاوہ ریاست سوات کے باشندوں کے لئے سو فیصد مفت تعلیم کا بندوبست کرنا تھا۔شاہ جہان زیب کا ایک زریں کارنامہ، انہوں نے پوری ریاست کے ہر چھوٹے بڑے دیہات اور گاؤں میں مدرسے قائم کئے تھے۔چاہے کسی دیہات کی آبادی ۱۵ گھروں پر مشتمل ہی کیوں نہ ہو۔

عالم شہزادگی ہی میں وہ اپنے والد جناب میاں گل عبدالودود حکمران ریاست سوات سے ناراض ہوگئے۔اس لئے سوات سے غائب ہوگئے اور ہندوستان کی سیر پر چلے گئے۔میں اُن سے اُن کی زندگی اور بادشاہت کے دور کے بارے میں تاریخ سوات کے لئے کبھی کبھی انٹرویو کرتا رہا۔ایک دن میں نے دیوار پر لکھی ہوئی ایک تصویر کے بارے میں پوچھا، انہوں نے فرمایا کہ یہ حمید اللہ خان والی بھوپال کی تصویر ہے۔جب بادشاہ صاحب نے مجھے ۱۹۳۳ء میں جلاوطن کیا تھا تو ہندوستان کی سیر کے دنوں میں میں ان کے پاس بھی گیا تھا۔میں نے سنا تھا کہ وہ ایک پختون بادشاہ ہے۔یقیناً اُن میں پختونیت کی ساری باتیں موجود تھیں۔میری خوب خاطر مدارت کی، مجھے اپنے ہاں ٹھہرایا اور ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی، ایک دن محل میں مجھے معلوم ہوا کہ علامہ اقبال بھی اسی محل میں آج ٹھہرے ہوئے ہیں۔چونکہ میں اقبال کو ان کے شکوہ اور جواب شکوہ کی وجہ سے جانتا تھا۔اس لیے میں ان سے ملنے کے لئے گیا۔میں دیکھ کر حیران ہوا، کیونکہ مجھے تو وہ بالکل ایک ولی اللہ لگے تھے۔سلام کے بعد جب مجھ سے میرا نام، جگہ وغیرہ کے بارے میں پوچھا اور میں نے سب کچھ بتا دیا تو اُٹھ گئے اور پلنگ پر بیٹھ گئے۔کہنے لگے شہزادے، کل کلاں تمہیں بادشاہ بننا ہے، کیوں باپ سے ناراض ہو۔ان کے پاس رہو۔ ان سے کچھ سیکھنے کی کوشش کرو۔تمہارے پڑوس میں افغانستان کی عظیم حکومت ہے وہاں سے بھی کچھ سیکھنے کی کوشش کرو، ہمیشہ انصاف پر قائم رہو، اور ظلم سے دُور رہو، اپنے لوگوں میں جذبہ حریت اور تیز کرو، خدا کرے تم میری زندگی میں ہی بادشاہ بن جاؤ تاکہ میں تم بھی کچھ کام لے سکوں۔

حکمران بتا رہے تھے۔کہ میں کبھی کبھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور وہ مجھ سے پٹھانوں کی عادات شجاعت، تاریخ، میری ذاتی تعلیم اور میری پسند و ناپسند کے بارے میں پوچھ لیا کرتے تھے۔

لالہ پوردل خان:

جناب پُردل خان سوات کے ایک معزز اور پُر وقار شخصیت تھے۔ سابق ریاست سوات میں جون ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے، اعلیٰ تعلیم پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ۱۹۳۸ء میں یونیورسٹی آف پنجاب سے سیاسیات میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کر لی۔

۱۹۴۹ء میں بادشاہ سوات میاں گل عبدالودود کے پرائیوٹ سکریڑی رہے۔

جناب پُردل خان اپنی رہانت، شرافت، بردباری، انکساری اور خدا ترسی کے لئے عام وخاص میں مقبول تھے اور سوات کا بچہ بچہ اور بوڑھا بوڑھا ان کو خان لالہ کے نام سے پکارتا تھا۔

ان کے ساتھ ایک ملاقات میں خان لالہ نے بالکل ایک نئی بات کا انکشاف کیا، لالہ پُردل خان نے کہا کہ جب میں لاہور میں ایم۔اے، پولیٹکل سائنس کا طالب علم تھا تو چند ساتھیوں کے ساتھ علامہ اقبال سے ملاقات کے لئے ان کی کوٹھی پر گیا علامہ اقبال بڑی گرم جوشی سے ملے، اگرچہ ان کی صحت ٹھیک نہیں تھی، باری باری سب کی خیریت دریافت کی، جب میری باری آئی تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کہاں سے تعلق رکھتے ہو۔ میں نے بتادیا کہ میرا تعلق ریاستِ سوات سے ہے اور یہاں گورنمنٹ کالج لاہور میں پولیٹکل سائنس کا طالب علم ہوں۔ علامہ اقبال بڑے خوش ہوئے، لیکن انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ تم پولیٹکل سائنس کے بجائے قانون کیوں نہیں پڑھتے؟ میں نے جواباً عرض کیا کہ ریاستوں میں پریکٹس کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے قانون پڑھنا زیادہ سودمند نہیں۔ اس پر علامہ اقبال نے فرمایا، کہ وہ وقت بہت جلد آرہا ہے کہ یہ ریاستیں ختم ہوجائیں گی، اور پورے ملک میں ایک جیسا نظام رائج ہوجائے گا۔

لالہ پُوردل خان کا کہنا ہے کہ میں خاموش ہوگیا، کچھ دیر تک ان کے ساتھ رہا اور پھر ان سے اجازت لے کر رخصت ہوا۔

اسد ملتانی:

اسد ملتانی جن کا پورا نام محمد خان تھا، ۱۹۰۲ء میں ملتان کے ایک معزز افغانی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق افغانستان کے ایک مشہور قبیلہ شیرانی سے تھا۔ مرحوم اسد ملتانی گورنمنٹ کالج لاہور کے فارغ التحصیل تھے۔ اُردو زبان پر اُن کو پر ان کو بہت عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے تھی کہ اہل لکھنو اور اہل دہلی ان کی اُردو کو تسلیم کرتے تھے، ۱۹۵۹ء میں انتقال کر گئے۔

اسد ملتانی مرحوم نے دس برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اپنی تعلیم کے دوران گورنمنٹ کالج لاہور سے ایک نظم ''قطرہ شبنم'' پر علامہ اقبال سے اصلاح لی، گویا یہ ان کی پہلی اور آخری اصلاح تھی۔ یہ نظم علامہ محمد اقبال کی قطع و برید کے بعد اقبالنامہ میں عکسی چھپی ہوئی ہے اور ان کو اسی نظم پر گورنمنٹ کالج لاہور میں انعام ملا تھا۔

علامہ اقبال کے ساتھ ان کے گہرے ادبی تعلقات تھے۔ علامہ اقبال بھی ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ ایک بار علامہ اقبال سے کسی نے پنجابی زبان کے بارے میں پوچھا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ پنجابی کی خدمت اسد کے حوالے کر چکا ہوں۔

علامہ اقبال آپ کی حقیقت پسندی اور بلندی افکار سے بے حد متاثر تھے، چنانچہ علامہ مرحوم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ سخن گوئی کا روشن مستقبل دو جوانوں سے وابستہ ہے۔ ایک اسد ملتانی اور دوسرے ڈاکٹر تاثیر۔

افسوس کا مقام ہے کہ اتنے عظیم شاعر اور انسان کا کلام ابھی تک قارئین کے سامنے کتابی شکل میں نمودار نہ ہو سکا۔ صرف مرثیہ اقبال اور تحفہ حرم (سفرنامہ حج) کا منظوم ترجمہ ادارہ الشمس ملتان کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

نمونہ کلام

اقبال کی یہ بات بہر طور ٹھیک ہے
باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
جو کچھ بھی چاہیے وہ خدا سے طلب کریں
اس کے سوا کسی سے بھی مانگیں تو بھیک ہے

فضل احمد غر:

آخر میں صوبہ سرحد کی ایک اور پختون شخصیت فضل احمد غر کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جنہیں اقبال کا ہم جلیس ہونے کا شرف حاصل ہے۔

فضل احمد غر کا پورا نام ابوسعید فضل احمد تھا۔ وہ ۱۸۹۹ء میں ضلع مردان کے مشہور گاؤں سُر وڈیری میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد عبداللہ مسافر صحرائی تھا۔ جو اپنے وقت کے بہت بڑے ولی اللہ تھے۔

فضل احمد صاحب نے میٹرک تک تعلیم باغبانپورہ لاہور سے حاصل کی۔ پھر ۱۹۲۶ء میں حیدرآباد دکن گئے اور وہاں اپنے ماموں کے ساتھ مقیم ہو گئے اور ۱۹۴۹ء تک دکن میں رہے۔ اس کے بعد وہ واپس پشاور آ گئے اور ۱۹۵۲ء میں ہی یہیں انتقال کیا۔

فضل احمد صاحب اُردو، فارسی اور پشتو کے ایک اچھے، سیر گو اور مستند شاعر تھے۔ فضل احمد صاحب ابتداء میں افغاں تخلص کرتے تھے۔ بعد میں کوہی اور غر تخلص کرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ غر صاحب کا پورا اور سارا کلام ۸۰ ہزار اشعار پر مشتمل تھا، لیکن بدقسمتی سے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ان کا کلام انقلاب کے شعلوں کی نذر ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ فضل احمد غر نے پشتونوں کے بارے میں ایک بہت شاندار اور زور دار قصیدہ لکھا تھا۔ جس میں پشتونوں کی قدیم تاریخ، ثقافت اور کلچر کو بڑے بلیغ انداز میں فصیح اور شستہ زبان میں بیان کیا تھا۔ اسی قصیدہ کے انگریزی ترجمہ میں علامہ اقبال نے اپنے ہاتھوں سے تصیح فرمائی تھی۔

اس بیان کی روشنی میں ہم درج ذیل نکات کو تلاش کرنا چاہتے ہیں۔

۱ فضل احمد غر صاحب علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان سے بعض چیزوں پر اصلاح لیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اقبالیات میں ہمیں اس بارے میں کچھ بھی نہیں ملتا۔

۲ چونکہ فضل احمد غر صاحب ایک تعلیم یافتہ اور اپنی تاریخ و ثقافت سے اچھی طرح واقف نوجوان تھے۔ سیاسی بصیرت کے مالک تھے، اس لئے علامہ اقبال کی افغان شناسی میں فضل احمد غر صاحب کا کافی حصہ ہوسکتا ہے۔

۳ اس تصحیح شدہ قصیدہ کی تاریخ معلوم نہیں کہ یہ کب لکھا گیا، لیکن قیاس ہے کہ امان اللہ خان امیر افغانستان یا نادر شاہ کی کامیابی کے وقت یہ قصیدہ لکھا گیا ہو۔

۴ انگریزی کا یہ مقالہ پھر کیا ہوا، کہاں غائب ہو گیا۔ آیا یہ کسی اخبار، رسالہ یا پمفلٹ میں چھپا بھی تھا یا نہیں۔ یہ مقالہ بڑا کارآمد، مستند اور مدلّل تھا اگر یہ ایسا نہ ہوتا تو علامہ اقبال اس پر خوش کیوں ہوتے اور اسی میں تصحیح کیوں فرماتے۔ حالانکہ بہت سے لوگوں سے سننے میں آتا ہے کہ یہ مقالہ چھپ گیا تھا۔ دوسرا یہ کہ جس طرح کہ یہ انگریزی کا ترجمہ شدہ قصیدہ ابھی تک ہماری نظروں کے سامنے نہ آسکا، اسی طرح اس کا اصلی پشتو متن بھی ناپید ہے۔

۵ علامہ اقبال اور فضل احمد غر صاحب کی ملاقاتیں کسی جگہ ہوا کرتی تھیں۔ دکن یا لاہور میں، اس بارے میں بھی ہمیں کوئی مواد نہیں ملتا۔ ہاں سنی سنائی بات ہے کہ جب علامہ اقبال عازمِ افغانستان ہو رہے تھے، تو انہوں نے فضل احمد غر کو ملاقات کے لئے بلایا تھا یہ شاید پشتونوں کے علاقوں کے بارے میں عام معلومات حاصل کرنے کے لئے بلایا ہو۔ بہرحال حقیقت کچھ ہو، صاحبانِ بصیرت کی خدمت میں گذارش ہے کہ اس بارے میں اپنی معلومات ہم طالب علموں تک پہنچا دیں تاکہ اقبالیات کا یہ گوشہ مکمل ہو سکے۔

اقبال کے چار اہم اسفار

(سوانح اقبال کا ایسا گوشہ جو اب تک اقبال کے سوانح نگاروں کی نظروں سے اوجھل رہا ہے۔)

NAWASHAHR:

HAZARA.

محترم قائد اعظم - السلام علیکم

ہماری صوبہ سرحد نے شریک آزادی پر شکریہ کے بعد اسلام و پاکستان پر جو

جماعتی دنیا کی شکست قبول فرمائی -

جمہوریت اقبال کے دو چند شعر بطور ہدیہ پیش ہیں -

مغربی جمہوریت = ع بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اسلامی جمہوریت = بندوں کو تولا کرتے ہیں گنا نہیں کرتے

سہ جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ع جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

سہ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

ہماری ضلع ہزارہ کو قدوم میمنت لزوم سے محروم نہ رکھیں!

مرسلہ مولوی محمد عجب خان - الف [illegible]

مسلم آوٹ لک کے ایڈیٹر داؤد آپسن سے علام کی گفتگو بذریعہ تحریر موصوف بہرے تھے۔ لہذا علامہ کاغذ پر کچھ لکھ کر موصوف سے استفسار کیا کرتے تھے۔

علامہ اقبال کا سفر مراد آباد

پروفیسر محمد طاہر فاروقی

۳۳-۱۹۳۲ء کی بات ہے کہ علامہ اقبال مراد آباد تشریف لائے تھے۔ اہل مراد آباد کے لیے یہ ایک غیر معمولی موقعہ تھا کہ ان کو اپنے محبوب شاعر و رہنما کی زیارت گھر بیٹھے نصیب ہوگئی۔ بات یہ تھی کہ ہمارے ایک رشتہ کے چچا خان بہادر مسعود الحسن صاحب بیرسٹر (جو اس وقت ریاست رام پور میں چیف منسٹر تھے) کی صاجزادی کی شادی تھی۔ بارات لاہور سے آئی تھی۔ اور اس بارات میں پنجاب کی کئی سر برآوردہ رہنما شامل تھے۔ کتنے ہی لوگ تھے جنہوں نے علامہ اقبال اور سر سکندر خان مرحوم کی زیارت سب سے پہلے اسی وقت کی تھی۔

علامہ اقبال کے شیدائی اور عقیدت مند کس جگہ نہ تھے۔ اور اس تقریب میں تو دور دور سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ سب سے پہلی چیز جس نے لوگوں کو متاثر کیا، وہ حضرت علامہ کی سادگی تھی۔ عام طور پر لوگ سمجھتے تھے کہ اقبال بھی دوسروں کے مانند ایک پر تکلف سوٹ میں ملبوس ہونگے۔ لیکن آپ وہی سادہ لباس پہنے ہوئے تھے جو ان دنوں پنجاب میں عام تھا۔ یعنی لمبا کوٹ اور شلوار۔ اسی طرح اٹھنے بیٹھنے، بات چیت اور رفتار واطوار میں وہ سادگی نظر آتی، جو علامہ کے کردار کی خصوصیت تھی۔

بارات کا قیام مراد آباد میں دو دن رہا۔ ایک دن صبح آئی اور دو دن ایک رات ٹھہر کر رات کو ڈاک گاڑی سے واپس ہوگئی۔ علامہ اقبال کو لاہور ہائی کورٹ میں کسی اہم مقدمے کی پیروی کرنی تھی۔ اس لیے آپ نے فرمادیا تھا کہ آپ صرف پہلے روز دن بھر قیام کریں گے۔ اور اسی رات واپس چلے جائیں گے۔ لیکن پھر ایسی صورت پیش آئی کہ آپ اس دن رک گئے اور اگلی رات برات کے ساتھ ہی واپس گئے۔ یہی واقعہ میں اس وقت آپ کو خاص طور پر سنانا چاہتا ہوں۔

خان بہادر قاضی شوکت حسین صاحب مرحوم مراد آباد کے رئیس اعظم، اور پرانی تہذیب و روایات کے مجسم پاسدار تھے۔ پہلے دن شام کو ان کی کوٹھی شوکت باغ میں

برات کے اعزاز میں پرتکلف شاندار عصرانہ کا اہتمام تھا۔ شوکت باغ میں سیاسی رہنماؤں اور والیان ریاست کے اعزاز میں ایسی کتنی ہی تقریبیں منعقد ہوتی رہی ہیں۔ لیکن منتخب مسلمان اکابر کی موجودگی کے باعث اس شام کو کچھ اور ہی شان اور وقار حاصل تھا۔ اور یہ بات بغیر کہے ہوئے سمجھ میں آسکتی ہے کہ مہمانوں میں علامہ اقبال کی ذات ہی سب کے لیے زیادہ کشش اور رجوع کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

جملہ معترضہ کے طور پر ایک تعارف ضروری ہے۔ جناب خورشید الحسن صاحب کو یوپی اور روہیلکھنڈ میں کون نہیں جانتا اب ۱۹۷۶ء میں تو وہ نوے ۹۰ سال کے لگ بھگ ہیں اور ملازمت اور کام سے سبک دوش ہو چکے ہیں مگر اسکول ساز ہیڈ ماسٹر ماہر تعلیم اور شفیق و مربی اور معلم ہونے کے علاوہ ان کی ذات میں وہ دل کشی موجود ہے۔ ہر محفل پر چھا جایا کرتے ہیں ۔انہوں نے علامہ اقبال کا ایک واقعہ سنایا کہ دہرہ دون میں سب سے پہلے حضرت علامہ کو قاضی شوکت حسین صاحب مرحوم سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ علامہ نے قاضی صاحب کو قدیم تہذیب کا صحیح نمائندہ پا کر خورشید صاحب سے پوچھا کہ ''آپ نے اُن میں کبھی کوئی تبدیلی بھی دیکھی ہے'' خورشید صاحب نے کہا نفی میں جواب دیا تو علامہ اقبال نے کہا

"ہماری قدیم تہذیب کی بڑی چیز وضعداری تھی۔ یہ حضرات دوستی اور مخالفت سب میں پکے اور سچے ہوتے تھے۔ اور افسوس کہ اب یہ بات بالکل اٹھتی جا رہی ہے"۔

یہ تو بات میں بات نکل آئی۔ میں تو اس وقت علامہ کے قیام مراد آباد کا ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں مگر اس کے لیے ایک مختصر تعارف اور ضروری ہے ڈاکٹر عشرت حسین کا نام علمی ادبی دنیا میں معروف ہے۔ آپ کو علامہ اقبال اور ان کے کلام سے جو عقیدت اور شعف حاصل تھا۔ اسکا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آپ نے ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب پروفیسر فلفسہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی نگرانی میں اقبال کے فلسفۂ ماورایات ہی پر ریسرچ کی۔ اور اقبال کا فلسفہ، "مابعد الطبیعیات "Meta Physics of Iqbal کے عنوان سے۔ مقالہ لکھ کر ڈاکٹری کی سند حاصل کی تھی۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس وقت عشرت صاحب دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ لیکن اس سال اتنے سخت بیمار ہوئے کہ ہائی سکول کے امتحان میں بھی شرکت نہ کر سکے۔ ان دنوں میں ان کی بیماری اس قدر طول پکڑ چکی تھی کہ صاحبِ فراش تھے اور اس قابل بھی نہ تھے کہ انہیں کسی سواری میں علامہ اقبال کی قیام گاہ تک لایا جاسکے۔ مگر انہیں اصرار تھا کہ میں زیارت کے لیے ضرور جاوں گا۔ بیماری انسان کو ضدی اور چڑ چڑا بنا دیتی ہے اور اس وقت تو معاملہ بھی جذباتی اور اعتقادی تھا۔

جب گھر والوں کے بس کا معاملہ نہ رہا تو خورشید صاحب کو بیچ میں ڈالا گیا۔ خورشید صاحب کا سبھی لحاظ اور احترام

کرتے تھے اور عشرت صاحب کے لیے ان کی ذات خاص عقیدت کا مرکز تھی۔ مگر عشرت کو اس وقت سمجھانے بجھانے میں وہ بھی ناکام رہے۔

خورشید صاحب بارات کے منتظمین میں بھی تھے۔ آخر انہوں نے ہمت کی کہ وہ علامہ اقبال کو عشرت صاحب کے گھر لانے کی کوشش کریں۔ علامہ نے یہی عذر کیا کہ انہیں شوکت باغ کی تقریب کے بعد اتنا وقت نہیں کہ کہیں اور جا سکیں، اس لیے کہ اسی رات انہیں لاہور واپس جانا ضروری ہے۔

لیکن خورشید صاحب نے عشرت کی بیماری اور بیچارگی، اور اسی کے ساتھ ان کے شوق و عقیدت کا ذکر کچھ اس طرح کیا کہ حضرت علامہ کی رائے بدل گئی۔ آپ نے خورشید صاحب سے کہا کہ تم میرے وہاں جانے کا اعلان نہ کرنا لیکن میں اس لڑکے کے پاس ضرور جاؤں گا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عشرت صاحب کی اس وقت کی حالت سے طبیبوں اور تیمارداروں کو واقعی مایوسی ہو چکی تھی۔ اسلیے ان کا حال بیان کرنے میں خورشید صاحب نے جو کچھ کہا وہ سب سچائی پر مبنی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ حضرت علامہ کے ان کی عیادت کو جانے کی برکت سے ان کا حال ہی بدل گیا۔ اور رفتہ رفتہ انہیں صحتِ کاملہ حاصل ہو گئی۔

اس شام شوکت باغ میں چند در چند موٹر موجود تھے۔ لیکن خورشید صاحب نے علامہ کی ہدایت کے مطابق اس رازداری کے خیال سے کہ علامہ کے جانے کی شہرت نہ ہو، انہیں چپکے سے ایک تانگہ میں بٹھایا اور عشرت کے گھر لے گئے۔ عشرت صاحب کے لیے علامہ کا دیدار عید کی مسرتوں سے زیادہ تھا۔ لیکن علامہ کے کردار کا یہ رخ کہ ایک گمنام مسلمان طالب علم کے شوق و ذوق اور اس کی بیماری و معذوری کا خیال کر کے اتنی زحمت گوارا کی، جس طرح ان کی جلالیت شان کو نمایاں کرتا ہے، اسی طرح آج کل کی دنیا میں عجیب و نادر بھی ہے۔

یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ حضرت علامہ نے ہدایت فرما دی تھی کہ آپ وہاں سے بہت جلد واپس ہونگے تا کہ وقت پر اسٹیشن پہنچ سکیں۔ لیکن عشرت میاں نے اس طرح کی باتیں چھیڑ دیں جو ایک نوجوان اپنے معتقدات کے دیوتا کو سامنے دیکھکر کیا کرتا ہے۔ ان کی باتوں میں نثر بھی تھی اور نظم بھی۔ بیمار کی باتیں تھیں جن کا رخ کبھی اقبال کی شاعری کی طرف ہو جاتا ہے کبھی قومی مسائل کبھی اسلامی معاملات اور کبھی کچھ اور۔ علامہ مسکرا مسکرا کر ان کی ہمت افزائی فرماتے جاتے تھے۔ کبھی کچھ ارشاد بھی فرماتے۔ درمیان میں خورشید صاحب نے کئی بار یاد دلایا کہ آپ کو اسٹیشن جانا ہے۔ مگر عشرت ہر دفعہ عرض کرتے تھے۔ " کہ چند منٹ اور تشریف رکھئے۔ " اور حضرت علامہ اٹھنے کا ارادہ ملتوی کر دیتے تھے۔ آخر جب

وہاں سے رخصت ہوئے ہیں تو ریل کا وقت نکل چکا تھا۔ خورشید صاحب نے عرض کیا کہ میں اس الزام سے بچنا چاہتا تھا کہ میرے سبب سے آپ کا اتنا ضروری سفر ملتوی ہو جائے۔ مگر علامہ نے جواب کیا" میں چلا آتا تو اس بچہ کی دل شکنی ہوتی اور آنحضرت صلعم نے مریض کی دل شکنی سے منع فرمایا ہے"

سبحان اللہ! تو یہ سب کام اس لیے ہوا کہ اقبال کو ارشادِ نبویؐ کی پیروی اور سرکارِ دو عالمؐ کا اتباع مقصود تھا۔ بیمار پرسی کے لئے جانا بھی آپ نے اسی جذبے کے ماتحت منظور کیا، اور اپنے اہم سفر کا التوا بھی اسی لئے گوارا کیا، کہ آنحضرت صلعم کے فرمان کے مطابق عمل ہو سکے۔

اردو بولو اردو لکھو اردو پڑھو

از دفتر اقبال ایسوسی ایشن ڈیرہ اسماعیل خان

مورخہ ۲۳ مارچ ۴۸ء

F 65

آسمانِ حشمت، پیکرِ صدق و صفا، حضرت قائد اعظم مدظلہ العالی

بصد ادب تسلیم۔ گورنر جنرل مملکتِ پاکستان

گذارش ہے کہ زیر اہتمام "اقبال ایسوسی ایشن" ڈیرہ اسمٰعیل خان میں ۲۱ اپریل کو "یوم اقبال" منایا جا رہا ہے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ اس مبارک موقعہ پر آپ اپنے ہاتھوں سے چند سطور علامہ اقبال مرحوم سے متعلق تحریر فرما کر ہمیں ضرور بھیجدیں آپکا یہ پیغام ہم اپنے جلسہ میں پڑھکر اپنے اجلاس کی زینت بڑھا سکیں گے ساتھ ہی ساتھ علامہ مرحوم سے متعلق قوم آپکے نیک خیال سے آگاہ ہو سکیگی اور ہمیں آپکی تحریر کی زیارت بھی نصیب ہو جائیگی امید کہ بہت جلد آپ کا پیغام ہم تک پہنچ جائیگا۔

آپکا ادنیٰ خادم

جنرل سیکرٹری کیف بنارسی

صدر اقبال ایسوسی ایشن

PRIVATE SECRETARY TO QUAID-I-AZAM OFFICE OF
Dy. No/370-GG/48

ڈیرہ اسماعیل خان کی اقبال ایسوسی ایشن کا خط بنام قائداعظم جس میں قائد کو یوم اقبال کے سلسلے میں ڈیرہ بلایا جارہا ہے۔

شاعر مشرق کا سفر جالندھر

حافظ نثار احمد جالندھری

۱۹۳۵ء کا زمانہ تھا۔ تحریک سیرت الانبیاء عبدالمجید صاحب قریشی مرحوم کی زیر نگرانی ملک کے طول عرض میں مقبولیت حاصل کرتی جا رہی تھی، جالندھر چھاونی کی ایک مقامی انجمن جس کا نام انجمن اخوان الصفا تھا اس تقریب سعید کو چند سال سے نہایت لامحدود پیمانہ پر منایا کرتی تھی۔ ربیع الاول کی آمد آمد تھی تحریک کے ہمہ گیر اثرات سے متاثر ہو کر اہالیان جالندھر شہر و چھاؤنی نے باہمی اشتراک سے اس تقریب سعید کو ہر سال منظم طریقے سے منانے کی سکیم تیار کی۔ اس سکیم کی بناء پر یہ تقریب ۱۱ ربیع الاول کو چھاؤنی میں اور ۱۲ کو شہر میں منائے جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ چونکہ انجمن اخوان الصفا اس دن یہ تقریب منایا کرتی تھی لہذا ضروری سمجھا گیا کہ انجمن مذکورہ کے پروگرام کو تحریک سیرت میں مدغم کر دیا جاوے۔ اراکین انجمن اس بات پر تیار نہ تھے یہاں تک کہ معاملہ نے انتہائی نازک صورت اختیار کر لی۔ اگر عین وقت پر جناب ڈاکٹر مرزا حمید اللہ بیگ صاحب سابق ایم۔ ایل۔ اے نے جو اس زمانے میں کنٹونمنٹ بورڈ جالندھر چھاونی کے ورکس پریزیڈنٹ بھی تھے ایک نہایت مناسب تجویز پیش کی جس پر تمام مسلمانان جالندھر چھاونی و اراکین انجمن متفق ہو گئے۔

چونکہ وقت بہت تھوڑا رہ گیا تھا لہذا سب کی کوشش یہی تھی کہ اس دن کو اس کی شان کے مطابق منایا جائے پروگرام ترتیب دیا گیا۔ انتظامات زور و شور سے شروع کر دیے گئے۔ جلوس تیار ہونے لگے ایک ہفتہ کے اندر اندر چھاونی اور اس کے مضافات کے ۳۳ جیوش تیار ہو گئے پروگرام میں جلوس کی تجویز کو نمایاں اہمیت دی گئی۔ چونکہ اس زمانے میں پنجاب کی فرقہ وارانہ فضا کسی قدر مکدر تھی نیز جلسوں اور جلوسوں پر تمام پنجاب میں پابندی عاید تھی (غالباً تحریک شہید گنج شروع ہو چکی تھی) لہذا جلوس کی اجازت ملنا محال نظر آ رہا تھا لیکن ڈاکٹر مرزا صاحب نے ایک نیا رستہ تلاش کر ہی لیا۔ آپ نے جنرل سیکرٹری سیرت کمیٹی جالندھر چھاونی کی طرف سے ایک درخواست حکام متعلقہ کو گذاری

کہ عید میلاد النبی ﷺ کے سلسلہ میں ڈاکٹر محمد اقبال بحیثیت صدر جلسہ تشریف لا رہے ہیں لہذا مسلمانان جالندھر چھاونی میدان عقب ڈاک بنگلہ پر ان کا استقبال کریں گے اور ڈاک بنگلہ سے ان کو جلسہ گاہ تک لائیں گے چونکہ یہ استقبال صدر ہو گا جلوس نہیں ہو گا لہذا احکام متعلقہ کو اس معاملے میں اعتراض نہیں ہونا چاہیے نیتجتاً تھوڑی سی بحث کے بعد درخواست منظور کر لی گئی۔ اب رہ گیا سوال شاعر مشرق کو ایسی چھوٹی اور گمنام سی جگہ پر لانے کی سر ڈاکٹر مرزا صاحب نے یہ مرحلہ بھی نہایت خوش اسلوبی سے طے کر لیا۔ جالندھر چھاونی میں اس وقت بریگیڈیر Huch Inson متعین تھے۔ لطیفہ یہ ہوا کہ اُن کی وردی ایک مقامی مسلمان ٹیلر ماسٹر کے پاس مرمت کے لئے آئی ہوئی تھی قریب کے ایک ہندو دکاندار نے اس مسلمان ٹیلر ماسٹر سے اتفاقاً دریافت کیا کہ یہ وردی کسی افسر کی ہے اس مسلمان نے ازراہ مذاق کہہ دیا کہ جرنیل صاحب نے یہ وردی ڈاکٹر صاحب کو بھیجی ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب کل یہ وردی پہن کر جلوس کی اور جلوس کے بعد ملٹری کی سلامی لینگے ٹیلر ماسٹر کا اشارہ ڈاکٹر مرزا صاحب کی طرف تھا۔ چونکہ علامہ اقبال مرحوم بھی ڈاکٹر تھے اور اشتہاروں کے ذریعہ ان کی آمد کی خبر تمام ضلع میں پھیل چکی تھی اس ہندو نے سمجھا کہ ڈاکٹر محمد اقبال جرنیل کی وردی پہن کر ملٹری کی سلامی لینگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے دن جب جلوس نکلا تو لالہ ہندوؤں کی تمام دوکانوں پر قفل پڑے ہوئے تھے۔

جالندھر چھاونی پنجاب کی ایک نہایت مختصر اور خوبصورت چھاونی ہے اس کے ۳۲ محلے ہیں اور ۳۲ محلوں کی شکل مستطیل ہے ہر چار محلوں کے درمیان صلیب کی شکل میں سڑکیں ہیں شرقاً غرباً کھلے میدان ہیں ڈاک بنگلہ ایک سرے پر واقع ہے یہاں سے جلوس چلنا تھا اور میدان عقب جامع مسجد جو جانب غرب ہے یہاں جلسہ گاہ تھی یہاں جلوس ختم ہونا تھا۔ ڈاکٹر مرزا صاحب نے جلوس کے تمام راستے کو اس طریق سے ترتیب دیا کہ ڈاک بنگلہ سے لے کر میدان عقب جامع مسجد تک بخطِ نسخ لفظ محمد ﷺ کی تشکیل ہو جاتی تھی۔

۱۱ ربیع الاول کی علی الصبح ہی لوگ جوق در جوق حضرت علامہ کے استقبال کے لئے عقب ڈاک بنگلہ جمع ہونے شروع ہو گئے دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کا ایک سمندر تھا جو چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ یکا یک شور ہوا کہ علامہ اقبال آ گئے لوگ فرط محبت سے دیوانہ وار علامہ کی زیارت کو دوڑے۔ مجمع اتنا زیادہ تھا کہ بڑی ہی مشکل سے قابو پایا گیا جلوس تقریباً ۹ بجے روانہ ہوا علامہ اقبال مرحوم کو ایک کھلی موٹر میں سوار کیا گیا اس موقع پر مجھے بھی فخر حاصل ہوا کہ میں حضرت علامہ کے محافظ دستہ کا ایک رکن مقرر کیا گیا۔

اب اگر یہاں میں جلوس کے مناظر بالتفصیل بیان کرنے لگوں تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ مختصراً یہ کہ

جالندھر چھاونی میں اس شان کا جلوس پھر کبھی نہیں نکلا۔ حالانکہ آئندہ سالوں میں اس تقریب کے سلسلہ میں ڈاکٹر رشید الدین خاں سابق رام داس خاں پرنسپل سناتن دھرم کالج لاہور۔ علامہ عبداللہ یوسف علی۔ میر غلام بھیک صاحب نیرنگ و خاں افتخار حسین خاں آف ممدوٹ بھی جالندھر چھاونی تشریف لائے مگر وہ بات پیدا نہ ہوسکی جو علامہ مرحوم کی آمد پر تھی بہر حال جلوس آہستہ آہستہ جلسہ گاہ تک پہنچا۔ علامہ مرحوم اس وقت بادامی رنگ کی سلکی سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے سر پر سیاہ رنگ کی گول ٹوپی تھی۔ جلسہ گاہ میں پہنچ کر لوگ ادب سے کھڑے رہے۔ حتیٰ کہ علامہ مرحوم کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے اس کے بعد حاضرین خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ تلاوت کلام پاک کے بعد صوفی عبدالعزیز صاحب ظفر نگری نے جو بہت اچھے اور خوش گلو نظم خواں تھے ترنم سے علامہ مرحوم کی مشہور غزل ''کبھی اے حقیقت منتظر نظر آلباس مجاز میں'' پر کسی غیر معروف شاعر کی تضمین سنائی۔ قارئین کرام جن لوگوں نے یہ منظر دیکھا ہے وہ میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ تضمین اتنی اچھی، پیرایہ اتنا دلکش، الفاظ و معانی اتنے پیارے اور نرالے تھے کہ نظم کے دوران میں علامہ مرحوم پر سیمابی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اور ایک سیل گریہ تھا جس نے میز پر رکھے ہوئے تختہ جاذب کی قوت جاذبیت ختم کردی تھی۔

نظم کے خاتمہ پر کچھ دیر تک تو آپ خاموش رہے پھر آہستہ سے فرمایا ''اس شاعر نے اقبال کو سمجھ لیا ہے'' تھوڑی دیر بعد آپ سے کچھ فرمانے کی درخواست کی گئی آپ نے دو تین منٹ کے عرصہ میں چند فقرے فرمائے اور خاموش ہوگئے ۔آپ نے ارشاد کیا کہ ''اقبال نے ایک خواب دیکھا تھا آج وہ اس خواب کی تعبیر دیکھ رہا ہے اقبال خدا سے دعا کرتا ہے۔ کہ وہ ملت اسلامیہ کا یہ جوش ہمیشہ سے قائم رکھے پھر فرمایا کہ یہی ایک پلیٹ فارم ہے جس پر تمام مسلمانان متحد ہوسکتے ہیں''

(ہفت روزہ قندیل لاہور)

اقبال کا سفرِ بہار

جگن ناتھ آزاد

اقبال اپنے ایک خط میں جس پر ۹ مارچ ۱۹۲۰ء کی تاریخ درج ہے۔ خان محمد نیاز الدین خاں کو لکھتے ہیں:۔

"میں ایک طویل سفر کے بعد پرسوں لاہور آیا ہوں۔ ایک مقدمے کے ضمن میں آرہ (صوبہ بہار) گیا ہوا تھا"

اقبال کے سفر آرہ کی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ ہاں عبداللہ انور بیگ نے اقبال کے ایک سفر پٹنہ کا ذکر کیا ہے۔ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ وہی سفر ہے جسے اقبال نے سفر آرہ کہا ہے یا کوئی اور لیکن گمان یہی ہے کہ یہ دونوں ایک ہی سفر ہیں [1] اس لئے کہ اقبال نے بہار میں محض دو ایک دن کا قیام کیا تھا۔ اور اسے اپنے خط میں طویل سفر کہا ہے۔ چونکہ پٹنے سے واپسی پر اقبال نے الہ آباد میں اکبر الہ آبادی کے ساتھ چند روز قیام کیا تھا، اس لئے ممکن ہے کہ اسی صورت ہی سے یہ سفر طویل بن گیا ہو۔ بہر طور پٹنے کے سفر کی داستان یہ ہے کہ یہ سفر بطور شاعر یا ادیب کے نہیں تھا بلکہ بطور وکیل کے تھا۔ بات یہ ہے کہ اقبال کی بیرسٹری کے متعلق یہ بالکل بے بنیاد قصے ہیں کہ ان کی وکالت چلتی نہیں تھی اور وہ کوئی بہت بڑے وکیل نہ تھے وغیرہ وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال اپنا سارا وقت ادب، فلسفہ اور اسلامیات کو دینا چاہتے تھے چنانچہ وکالت کی طرف اتنی ہی توجہ کرتے تھے جتنی قوت لایموت کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ مقدمات لینے سے محض اس بنا کہ انکار کر دیتے تھے کہ ان کے پاس چند ہفتوں یا چند ماہ کا خرچ موجود ہوتا تھا۔ لیکن جب کبھی بھی وہ کوئی مقدمہ ہاتھ میں لیتے تھے تو پوری یکسوئی کے ساتھ اس پر کام کرتے تھے اور اس کی انہیں اچھی خاصی فیس ملتی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پٹنے میں عدالت عالیہ کے سامنے ایک بڑا مقدمہ آیا جو اپنے زمانے میں ڈمراؤں راج کیس کے نام سے مشہور ہوا۔ اس مقدمے میں ایک لفظ متنازعہ فیہ بن گیا اور اس کی تشریح و توضیح میں دونوں طرف کے وکیلوں نے اپنی پوری قابلیت، پوری طاقت اور پورا زور و بیاں صرف کر دیا۔ اس مقدمے میں ایک طرف سے

سی آر سی داس وکیل تھے اور دوسری طرف سے موتی لال نہرو۔ ڈاکٹر عبداللہ سہروردی اور اس پائے کے دوسرے وکیل سی آر داس اور موتی لال نہرو کی اعانت کے لئے مقرر تھے۔

سی آر داس حکومت کی طرف سے مقدمہ لڑ رہے تھے، چنانچہ انہوں نے حکومت کی اجازت سے اقبال کو لاہور سے اس غرض سے بلوایا کہ وہ اس متنازعہ فیہ لفظ کے متعلق اپنی رائے عدالت کے سامنے پیش کریں اس مقدمے کے لئے عدالت نے ایک ہزار روپیہ روزانہ اور ان کے کلرک کو سو روپیہ روزانہ دینا منظور کیا۔

عدالت نے اقبال سے کہا کہ وہ بہار میں ایک یا دو مہینے تک جتنی مدت چاہیں مقدمے کی تیاری کے سلسلے میں قیام کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنی بعض کتب یا حوالہ دیکھنے کے لئے لاہور یا کلکتے جانا چاہیں تو آمد و رفت کے اخراجات حکومت ادا کرے گی۔

اقبال جب پٹنے پہنچے تو سی آر داس انہیں لینے کے لئے اسٹیشن پر آئے۔ دوسرے دن سی۔ آر۔ داس کی اقبال سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اگلی صبح جب سی آر داس سے اقبال کی ملاقات ہوئی تو اقبال نے انہیں بتایا کہ مقدمے کے تمام کاغذات وہ تیار کر چکے ہیں اور فوراً ہی اپنا نقطہ نگاہ عدالت کے سامنے پیش کر کے لاہور واپس جانا چاہتے ہیں سی آر داس نے انہیں بتایا کہ یہ حکومت کا مقدمہ ہے اور اس میں اس قدر جلد اپنی رائے دینے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے اقبال کو یہ مشورہ دیا کہ اپنے کاغذات اطمینان سے تیار کریں اور اس سلسلے میں دو ماہ تک یہاں قیام کر سکتے ہیں جس کے لئے انہیں ایک ہزار روپیہ روزانہ ملتا رہے گا۔ لیکن اقبال مصر تھے کہ میرے کاغذات تیار ہیں اور میں جلد از جلد اپنا بیان عدالت کے سامنے دینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اگلے دن انہوں نے اپنے بیان کو قطعی صورت دی اور اسے عدالت کے سپرد کر دیا۔

اتفاق کی بات ہے کہ جب اقبال اپنا بیان عدالت میں دے چکے اور لاہور واپسی کا عندیہ ظاہر کیا تو بنک بند ہو چکے تھے۔ اور ان کی فیس نقد کی صورت میں عمال حکومت کے پاس موجود نہ تھی۔ اگر اقبال ایک دن اور رک جاتے تو انہیں ایک ہزار روپیہ اور مل جاتا۔ لیکن انہوں نے واپسی پر اصرار کیا۔ چنانچہ اعمال حکومت نے ادھر ادھر سے روپیہ جمع کر کے اقبال کو ان کی فیس ادا کر دی اور اقبال پہلی ٹرین سے واپس لاہور روانہ ہو آئے۔

چراغ رہگزر دسمبر ۱۹۷۷ء

ا میرے اس اندازے پر ایک اعتراض ہو سکتا ہے جس سے اس موضوع پر تحقیق کے نئے پہلو نکل سکتے ہیں اور وہ یہ کہ آرہ چھوٹا سا شہر ہے اور پٹنہ بڑا اگر اقبال ان دونوں شہروں میں ایک ہی سفر میں گئے ہوتے تو وہ اس سفر کو پٹنے سے منسوب کرتے نہ کہ آرہ سے۔ (آزاد)

اقبال کا سفر پشاور

ڈاکٹر صابر کلوروی
شعبہ اُردو پشاور یونیورسٹی

علامہ اقبال چار دفعہ صوبہ سرحد میں تشریف لائے۔ پہلی بار مئی ۱۹۰۳ء میں ڈیرہ غازی خان سے ہوتے ہوئے، ڈیرہ اسماعیل خان پہنچے۔ ۱ ڈیرہ میں علامہ کا قیام سردار احمد لغاری کے ہاں ہوا۔ لغاری خاندان کے سیالکوٹ کے آذری خاندان سے دوستانہ مراسم تھے شاید بزرگوں کے مشورے سے انہوں نے لغاری خاندان کا مہمان بننا پسند کیا۲ دوسری وجہ غالباً یہ تھی کہ سردار احمد لغاری کا لارڈ کرزن سے قریبی رابطہ تھا اور انگریز، سردار صاحب جیسے علم دوست افسر کی بڑی قدر کرتے تھے۔ علامہ کا یہ سفر اپنے بڑے بھائی عطا محمد کے فوجداری مقدمے کے سلسلے میں تھا جو ان دنوں فورٹ سنڈیمن میں ایم ای ایس میں اوورسیئر تھے۔ لغاری خاندان کے مطابق علامہ ایک ماہ ستائیس دن ڈیرہ اسماعیل میں قیام پذیر رہے۔ ۳ ڈیرہ اسماعیل خان کے راستے بلوچستان کا یہ سفر گھوڑے پر طے ہوا۔ اس سفر کے بارے میں بعض نادر اور اہم معلومات علامہ کے ملازمِ خاص علی بخش کی ڈائری میں محفوظ ہیں۔ یہ یادداشتیں جو علی بخش نے آخری عمر میں اپنے بھتیجے محمد اقبال سے لکھوائی تھیں میرے پاس محفوظ ہیں۔

صوبہ سرحد سے اقبال کا دوسرا رابطہ بھی شیخ عطا محمد کی وجہ سے ہوا۔ شیخ صاحب لارڈ کرزن کی مداخلت سے مقدمے سے بری ہوئے تو انہیں S.D.O کے عہدے پر ترقی ملی۔ اس کے ساتھ ہی ان کا تبادلہ ایم ای ایس ایبٹ آباد میں ہوا۔ شیخ عطا محمد کی سروس بک کے مطابق انہوں نے ایبٹ آباد میں اپنے عہدے کا چارج ۱۸ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو سنبھالا وہ جنوری ۱۹۰۵ء تک ایبٹ آباد میں مقیم رہے۔ علامہ جب یورپ جانے لگے تو اُس وقت وہ ہنگو (کوہاٹ) میں اپنے سرکاری فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ علامہ کے اس دوسرے سفر کی غرض وغایت یہ تھی کہ وہ شیخ عطا محمد کے اہل وعیال کو سیالکوٹ سے لے کر آئے تھے۔ جولائی ۱۹۰۴ء کے اواخر میں علامہ ایک دفعہ پھر ایبٹ آباد آئے۔ علامہ کا یہ سفر دراصل اپنے بھائی کو اس امر پر آمادہ کرنے کے لئے تھا

کہ وہ یورپ میں ان کے تعلیمی اخراجات برداشت کریں اس سفر کی یادگار علامہ کی دو نظمیں ہیں جو بانگ درا میں موجود ہیں۔ میری مراد بانگ درا میں شامل نظم ''ابر'' اور ''طفلِ شیرخوار'' سے ہے۔ اس کے علاوہ اس سفر کی ایک خاص بات علامہ کا وہ مشہور خطبہ بھی ہے جو انہوں نے نمبر ۲ ہائی سکول ایبٹ آباد میں ''قومی زندگی'' کے نام سے دیا تھا۔ جواب ان کے مضامین کے مجموعے ''مقالات اقبال'' میں شامل ہے۔

صوبہ سرحد میں اقبال کا چوتھا اور آخری سفر ۱۹۳۳ء میں ہوا۔ اقبال افغانستان جاتے ہوئے ایک رات پشاور میں ٹھہرے۔ اس سفر کی غرض و غایت بظاہر یہی تھی کہ حکومت افغانستان اپنی تعلیمی اصلاحات کے ضمن میں علامہ کے مفید مشوروں کی طالب تھی لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ نادر شاہ اُس احسان کا بدلہ چکانا چاہتا تھا جو علامہ نے نادر خان کو برسر اقتدار لانے کے لئے کیا تھا۔

یہاں پر علی بخش کی اُس ڈائری سے ایک اقتباس پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جس کا ذکر میں ابتداء میں کر چکا ہوں۔ ''کابل کا سفر'' کے عنوان سے علی بخش رقمطراز ہے۔

''غالباً جس حد تک مجھے یاد پڑتا ہے میں یہ کہہ سکوں گا کہ ایک مرتبہ جب میرے آقا کسی مقدمے کے سلسلے میں عدالت گئے ہوئے تھے تو ایک رعب دار شخص بڑی موٹر میں کوٹھی پر آیا اور مجھ سے ڈاکٹر صاحب کی بابت دریافت کیا۔ میں نے کہا جناب وہ عدالت گئے ہوئے ہیں شاید تھوڑی دیر میں واپس آ جائیں گے آپ اگر چاہیں تو کمرہ میں تشریف رکھیں۔ اس پر اس نے مجھے اپنے نام کا کارڈ دے کر کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو دے دینا۔ اس کے بعد وہ موٹر میں بیٹھ کر چلا گیا۔ ان کا گھر سے نکلنا تھا کہ میرے آقا بھی تشریف لے آئے۔ میں نے کارڈ ان کو دے دیا انہوں نے دیکھ کر کہا وہ کب آئے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ جناب وہ ابھی آپ کے آنے سے کچھ وقت پہلے گئے ہیں اس پر ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا پاگل وہ تو افغانستان کا بادشاہ تھا اسے تھوڑی دیر تو بٹھایا ہوتا۔ میں نے جواب دیا جناب مجھے کیا معلوم تھا۔ اُس وقت میرے آقا میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہتے تھے پھر کچھ روز گزرنے کے بعد افغانستان سے خط آنے پر میرے آقا نے وہاں جانے کی تیاریاں شروع کر دیں اور مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا گیا۔ (۳۱ب)

یہاں سفر کابل کا تاریخی پس منظر بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ۱۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو بچہ سقہ نے امان اللہ خان کا تختہ الٹ دیا۔ نادر خان اس کی سرکوبی کے لئے ہندوستان کے راستے داخل ہوا۔ نادر خان کی امداد کے لئے علامہ اقبال کی سربراہی میں ۳ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ''نادر خان ہلال احمر'' کے نام سے ایک فنڈ قائم کیا گیا۔ اس اثنا میں نادر خان نے افغانستان پر بھرپور حملے کے لئے علی خیل کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیا۔ نادر شاہ کو حسب توقع کامیابی ہوئی علامہ کی وساطت سے

حکومت برطانیہ سے درخواست کی گئی کہ وہ افغانستان کے قومی جرگے کے فیصلے کے مطابق جنرل نادر خان کی بادشاہت کو تسلیم کرے جو قبول کرلی گئی۔ ۵ نومبر ۱۹۲۹ء تک ہلال احمر فنڈ میں آٹھ ہزار روپے جمع ہوئے جو نادر خان کو بھیج دیے گئے ۴ مجلسِ امدادیہ ملی نے اس رقم کی وصولی پر علامہ کو شکریے کو خط لکھا جس کے آخر میں کہا کہ افغانستان کے باشندے ان کی زیارت کا بے انتہا اشتیاق رکھتے ہیں اور اگر وہ یہاں تشریف لائیں تو حکومت وملت دونوں کی طرف سے مخلصانہ عزت و پذیرائی کی جائے گی ۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۳۰ء کو نادر شاہ غازی نے علامہ کو جو خط لکھا اُس میں بھی علامہ کی مساعی کو سراہا گیا۔ خط میں لکھا تھا۔

''افغانستان کے لئے آپ ہمیشہ جن صمیمانہ احساسات کا اظہار فرماتے ہیں اور دورِ انقلاب میں آپ کی طرف سے اور ہندوستان کے مسلمان بھائیوں کی طرف سے ہمدردی و دوستی کے جن جذبات کا عملی اظہار ہوا ہے ان کے لیے ممنون ہوں اور ملتِ افغانستان بھی ہندوستان کے مسلمان بھائیوں کی ہمدردی کی ممنون ہے۔'' ۵

نادر خان کی حکومت مستحکم ہوئی تو اس نے افغانستان میں اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا افغانستان میں ثانوی اسکول تو موجود لیکن اعلیٰ تعلیم کا مناسب بندوبست موجود نہ تھا حکومت کابل میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی لیکن قدامت پسند علماء کسی طرح بھی سائنسی تعلیم کے فروغ کے حق میں نہ تھے۔ اس مقصد کے لئے حکومتِ افغانستان نے ہندوستان سے ایک تعلیمی وفد کو افغانستان آنے کی دعوت دی تا کہ مجوزہ یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں مشورہ کیا جائے۔ اس وفد میں علامہ اقبال کے علاوہ سید سلیمان ندوی، سر راس مسعود، وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی، پروفیسر ہادی حسن علی گڑھ یونیورسٹی اور غلام رسول بیرسٹر لا (لاہور) کو شامل کیا گیا۔ کابل جانے سے پہلے علامہ نے لاہور میں جو بیان دیا اُس سے سفر کے مقاصد پر روشنی پڑتی ہے۔ آپ نے فرمایا

''اعلیٰ حضرت نادر شاہ غازی نے ہمیں تعلیمی معاملات میں وزیرِ تعلیم کی رہنمائی اور کابل میں مجوزہ یونی ورسٹی کے قیام کے متعلق دعوت دی ہے، ہم اس دعوت کی قبولیت کو اپنا فرض تصور کرتے ہیں۔ افغانستان کا نوجوان طبقہ علوم حاضرہ کے حصول اور ان کی اپنے مذہب و کلچر کے ساتھ مطابقت کے لئے بے حد آرزومند ہے۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم بقدرِ استطاعت ان کی ہر ممکن امداد کریں۔ ذاتی طور پر میری یہ رائے ہے کہ تعلیم کو مکمل طور پر دینوی بنا دینے سے کسی جگہ بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ ہر ملک کی ضروریات جداگانہ ہیں لہٰذا ان کے تعلیمی مسائل پر بھی ان کی ضروریات کی روشنی میں بحث کی جانی چاہیے کابل میں ایک جدید یونیورسٹی کے قیام اور اسلامیہ کالج پشاور کو ایک یونیورسٹی بنا دینے سے افغانستان اور ہندوستان کی سرحدوں کے درمیان ذکی اور ذہین افغان آبادی کو بے انتہا فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔ ۶

علامہ اسی روز لاہور سے بذریعہ فرنٹیر میل پشاور روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ سر راس مسعود بھی تھے۔ وفد میں جو لوگ علامہ کے ساتھ شامل تھے ان میں سید سلیمان ندوی بھی تھی۔ لیکن انگریز حکومت نے پاسپورٹ جاری کرنے سے پہلے تحقیق و تفتیش میں خاصا وقت ضائع کردیا۔ جس کی وجہ سے ندوی صاحب لاہور یا پشاور میں علامہ کے ساتھ شریک سفر نہ ہو سکے۔ سید سلیمان ندوی ۲۴ اکتوبر کو پشاور پہنچے۔ ۷ جہاں سے وہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۳ء کا کابل میں وفد میں شامل ہو گئے۔

علامہ ۲۰ اپریل کی شام کو پشاور پہنچے تھے۔ پشاور ریلوے اسٹیشن پر حکومتِ افغانستان کی طرف سے گاڑیاں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی گاڑی بھی اسٹیشن پر موجود تھی۔ صاحبزادہ صاحب اُس زمانے میں انگریز حکومت میں وزیر تھے۔

علامہ کا استقبال کرنے والوں میں اسلامیہ کالج کا ایک وفد بھی شامل تھا جس کی قیادت تاریخ کے پروفیسر محمد شفیع صاحب کررہے تھے۔ ان کے ہمراہ اسلامیہ کالج کے طلبہ کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ پروگرام یہ تھا کہ علامہ کو اسلامیہ کالج لے جایا جائے گا جہاں ان کے اعزاز میں چائے کی دعوت ہوگی۔ ۸ لیکن صاحبزادہ صاحب مصر ہو گئے اور یوں علامہ تھوڑی دیر کے لئے بادل نخواستہ صاحبزادہ صاحب کے بنگلے پر رُکے صاحبزادہ صاحب کا بنگلہ ریلوے اسٹیشن کے بالمقابل تھا جہاں ایک زمانے میں پاسپورٹ آفس قائم کیا گیا تھا۔ یہاں علامہ نے کچھ دیر قیام کیا اور چائے نوش کی۔ صاحبزادہ صاحب نے رات کے کھانے کے لئے اصرار کیا لیکن علامہ نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ وہ اپنی رہائش گاہ پر جانا چاہتے ہیں تاکہ سفر میں اُن کی جو نمازیں قضا ہوئی ہیں انہیں ادا کیا جاسکے۔

حکومتِ افغانستان کی طرف سے علامہ کی رہائش کا بندوبست ڈینز ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ علامہ کی سید سلیمان ندوی سے جو خط کتابت ہوئی ہے اس میں اس ہوٹل کا ذکر موجود ہے۔ پروفیسر امداد حسین مرحوم نے ایک ملاقات میں مجھے بتایا کہ اس مقصد کے لئے ڈینز ہوٹل میں کمرہ نمبر ۶ اور ۷ مخصوص کئے گئے تھے۔

علامہ کے سفرِ پشاور کی خاص بات یہ تھی کہ جب علامہ صاحبزادہ صاحب کے گھر سے باہر نکلے تو اسلامیہ کالج کے طلبہ اُن کی گاڑی کو کھینچ کر ڈینز ہوٹل لے گئے۔ اس مقصد کے لئے لمبے لمبے رسے موٹر کے ساتھ باندھ دیے گئے تھے۔ ان طلبہ میں خیال بخاری بھی شامل تھے جو اُس وقت اسلامیہ کالج میں طالب علم تھے۔ خیال بخاری بتاتے ہیں کہ حکومت افغانستان کی طرف سے جو موٹر علامہ کو لینے آئی تھی اس کا رنگ سیاہ تھا جسے پندرہ بیس طلبہ کھینچ کر ہوٹل تک لے گئے تھے۔

پشاور میں علامہ کا قیام صرف ایک رات تھا۔ وہ سفر کی تھکاوٹ کے باعث اسلامیہ کالج نہ جاسکے۔ تاہم بعض

حضرات اس ہوٹل میں علامہ سے ملے جن میں عبدالودود قمر، پروفیسر امداد حسین، ابوالکیف کیفی سرحدی اور اسلامیہ کالج پشاور کے پروفیسر محمد شفیع کے بارے میں ٹھوس شہادتیں موجود ہیں۔ علامہ کی پشاور آمد کی خبر مقامی اخبارات میں یقیناً شائع ہوئی ہوگی۔ میں نے اس ضمن میں پرانے اخبارات کی تلاش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اُس زمانے میں روزنامہ خیبر میل شائع ہو رہا تھا

اس اخبار کے پرانے پرچے اب نیشنل آرکائیوز کی لائبریری میں محفوظ ہیں لیکن بدقسمتی سے ۱۹۳۳ء کا فائل اس ذخیرے سے غائب ہے۔ چنانچہ اس سفر کے بارے میں معلومات کا واحد ذریعہ روزنامہ انقلاب ہی ہے۔ ڈینز ہوٹل میں افغانوں کا ایک نمائندہ وفد بھی علامہ سے ملا جس کے ممبران کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔ اس وفد میں اخبار ''افغان'' اور ''جمہوریت'' کے ایڈیٹر خان میر ہلالی (متوفی ۱۹۷۳ء) بھی شامل تھے۔ اس وفد کی علامہ سے کہا گفتگو ہوئی خوش قسمتی سے یہ روداد منظوم شکل میں ہلالی صاحب کے پشتو شعری مجموعے ''افکار ہلالی'' میں شامل ہے جو فروری ۱۹۶۱ء میں منظور عام پریس سے انور بیگ غازی نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں ''اقبال اور پشتون'' کے عنوان سے ہلالی صاحب کی علامہ اقبال سے ملاقات کا حال بیان ہوا ہے۔ ۳۴ اشعار پر مشتمل اس پشتو نظم کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

''ڈینز ہوٹل میں علامہ اقبال نے جو آسمانِ کمال کا درخشندہ ستارہ بھی ہے اور اسرار حقیقت کا شناسا بھی، فرمایا کہ ہر قوم کو اللہ تعالیٰ نے ایک شان بخشی ہے۔ ترکی قوم کی شان وشوکت اور دبدبہ ختم ہو گیا تھا جسے مصطفےٰ کمال نے دوبارہ زندہ کیا۔ مغلوں اور سادات نے بھی اپنا زمانہ گذار لیا۔ سلجوقیوں کے جمال کا زمانہ بھی گذر گیا تمہیں تو نظر نہیں آ رہا میری دوربین نگاہیں ان ہیروں کو دیکھ رہی ہیں جو پختونوں کی راکھ میں چھپے ہوئے ہیں میں اس قوم کے ہاتھ میں راہبری کا جھنڈا دیکھ رہا ہوں، وقت آ رہا ہے کہ پختون قوم اپنے کمال کو آشکارا کرے گی یہ فطرت کے رازوں سے پردے ہٹائے گی اور اسلام کا ستون ثابت ہوگی پختون شاہین کی طرح پہاڑوں میں پروان چڑھتے ہیں اور شیروں کی طرح دشت وصحرا میں پلے بڑھے ہیں۔''

علامہ کے اس تبصرے پر ہلالی صاحب نے علامہ سے کہا

اے علامہ آپ کی نگاہ بلند اور سوچ ارفع ہے آپ قوموں کی زندگی اور موت کے رازوں سے واقف ہیں۔ آپ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے سربستہ راز آشکارا کئے ہیں۔ لوگ تو افغانوں کا مذاق اڑاتے ہیں آپ ہیں کہ پشتونوں کے متعلق اتنے بلند خیال رکھتے ہیں۔

علامہ نے جواب دیا

''پشتون قوم میں زندگی کی نشانیاں موجود ہیں۔ زندگی سے محبت کرنے والے ہی لازوال زندگی پاتے ہیں۔ افغانوں کے خصائل عربوں سے ملتے ہیں۔ افغانوں کی تاریخ ننگ وغیرت کے واقعات سے درخشندہ ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ دست قدرت

پختون قوم کوتاج بخشنے والا ہے اور اس کے کاندھوں پر قیادت کا دوشالہ رکھا جانے والا ہے۔''

اس پر خان میر ہلالی نے کہا

''علامہ صاحب پختون تو انگریزوں کے غلام بن گئے ہیں۔ انگریز قبائل پر حملے کر رہا ہے کیا ممکن ہے کہ انگریز پر زوال آجائے۔

دانائے راز نے سر اُٹھایا اور ہلالی صاحب کو گھورتے ہوئے کہا۔

''فرنگی کا کاسہ بھر گیا ہے بہت جلد اس کے مکر وفریب کا جال تار تار ہو جائے گا اگر یہ ایک مرکز پر جمع ہو گئی تو انگریزوں کے غرور کو خاک میں ملا دے گی تب یہ ملتِ واحدہ بن جائے گی اور غیرت اور ناموس کی بے مثال داستانیں رقم کرے گی۔''

اقبال نے ایسے ہی خیالات کا اظہار اپنی اُس تقریر میں بھی کیا جو انہوں نے انجمنِ ادبی کابلی کے اجلاس میں کی۔ آپ نے فرمایا

مسولینی نے ایک اچھا نظریہ قائم کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اٹلی کو چاہیے کہ اپنی نجات حاصل کرنے کے لئے ایک کروڑ پتی کو پیدا کرے جو اٹلی کے گریبان کو اینگلو سکسن اقوام کے قرضہ جات کے چنگل سے چھڑا سکے یا کسی دوسرے دانتے کو پیدا کرے جو نئی جنت پیش کرے یا کسی نئے کولمبس کو حاصل کرے جو ایک نئے براعظم کا پتہ چلائے۔ اگر آپ مجھ سے افغانستان کی نجات کے متعلق سوال کریں تو میں کہوں گا کہ افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو اس کی قبائلی زندگی سے نکال کر وحدتِ ملی کی زندگی سے آشنا کرے۔'' [9]

ڈینز ہوٹل میں ایک رات قیام کے بعد علامہ دوسرے روز یعنی ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو کابل کے لئے روانہ ہوئے۔ مہمانوں کے لئے حکومتِ کابل نے دو موٹروں کا بندوبست کیا تھا۔ ڈینز ہوٹل کی یہ عمارت کچھ ہی عرصہ میں نئی نسلوں کے لئے قصہ پارینہ بن جائے گی اب اسے ایشیا کا سب سے بڑا تجارتی مرکز ہونے کا اعزاز دلایا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں اگر اس مرکز کے ایک حصے کو علامہ اقبال سے منسوب کر دیا جائے تو اسے ایشیا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کا مرکز نگاہ بنایا جا سکتا ہے۔

حواشی:

۱۔ علی بخش کی غیر مطبوعہ ڈائری مملوکہ راقم الحروف
۲۔ فکر نو ڈیرہ اسماعیل خان یکم فروری ۱۹۸۳ء
۳۔ ایضاً
۳(ب)۔ علی بخش کی غیر مطبوعہ ڈائری صفحہ ۸۵
۴۔ روزنامہ انقلاب ۱۵ نومبر ۱۹۲۹ء
۵۔ ایضاً
۶۔ ایضاً
۷۔ سیر افغانستان: مطبوعہ شیخ غلام علی سنز لاہور صفحہ ۶
۸۔ روزنامہ انقلاب ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۳ء
۹۔ سیر افغانستان صفحہ ۱۸

سیمی نار کے مقالات

شعبۂ اُردو کے تحت

تیسرا کل پاکستان باڑہ گلی سیمی نار
۱۲تا۱۵اگست ۱۹۹۵ء

اس حصے میں مذکورہ سیمی نار کے وہ مقالات شائع کئے جا رہے ہیں جو سیمی نار کے لئے لکھے گئے تھے لیکن ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ جو مقالات دیگر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں انہیں شامل نہیں کیا جا رہا۔

(ادارہ)

پاکستانی جامعات میں اقبالیاتی تحقیق

رفیع الدین ہاشمی

وضاحت:۔ یہ مضمون اقبال سیمینار (باڑا گلی، ۱۲ تا ۱۴ جون ۱۹۹۵ء میں پڑھا گیا تھا معمولی لفظی ترامیم کے بعد اسے جوں کا توں پیش کیا جا رہا ہے البتہ آخر میں ''پس نوشت'' کے عنوان سے اس میں بعض تازہ معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ ہاشمی

اس سیمی نار کے لیے جو موضوع (یونیورسٹیوں کی سطح پر اقبالیات پر تحقیق) مجھے تفویض کیا گیا، وہ خاصا وسیع و بسیط اور ایک درجے میں بے کراں سا ہے لہذا میں نے اپنی معروضات کو پاکستانی جامعات تک محدود کر لیا ہے۔ (اس تحدید کے باوجود مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ جائزہ شاید ناتمام ہی رہے گا) بہر حال، ذیل میں پاکستانی جامعات میں اقبالیات پر تحریر کردہ ڈاکٹریٹ کے مقالوں کا تعارف اور تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

☆ اسلامی تصوّف اور اقبال (ابوسعید نورالدین):۔

مقالہ نگار نے اقبال اکادمی پاکستان کے ریسرچ فیلو (۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۶ء) کی حیثیت سے یہ مقالہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی نگرانی میں تحریر کیا، جس پر کراچی یونی ورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔

۱۹۵۹ء میں، اقبال اکادمی سے اس کی اشاعت کے موقع پر جناب ممتاز حسن نے اپنے مقدمے میں لکھا

''اردو زبان میں اس موضوع پر ایسا مبسوط اور تحقیقی مقالہ میری نظر سے نہیں گزرا۔
نورالدین صاحب کی محنت ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے''

پچاس کی دہائی کے لحاظ سے جناب ممتاز حسن صاحب کی یہ رائے درست تھی، بلکہ ممتاز حسن ایسے وسیع المطالعہ عالم کی طرف سے نورالدین صاحب کو یہ ایک عمدہ خراجِ تحسین تھا۔ بلاشبہ مقالہ نگار نے موضوعِ تحقیق پر مقدور بھر محنت و کاوش کی، لیکن جہاں تک تحقیق کے اصول و طریق (Research Methodology) کا تعلق ہے، میرا خیال ہے یہ مقالہ تحقیق اقبالیات کے عہد طفولیت میں لکھا گیا تھا۔ تحقیق کے بہت ہی عمومی اور پیش پا افتادہ اصول بھی شاید تحقیق کار کے سامنے نہیں تھے

۱۔ حوالے ادھورے، نامکمل بعض اوقات صرف کتاب کا اور مصنف کا نام دینے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ناشر، ایڈیشن یا سنہ ندارد

۲۔ کتابیات میں اردو، فارسی اور انگریزی کتابیں اور رسالے یکجا اور بلا ترتیب۔ جو ترتیب ہے، وہ نہ الفبائی ہے اور نہ زمانی

۔۔۔۔اور ناموں میں کچھ اغلاط بھی ہیں

۳۔ گو کہ مصنف نے طبع سوم (۱۹۹۵ء) میں کتاب پر نظر ثانی کی ہے ان کے بقول ''کتاب میں پہلے جو خامیاں رہ گئی تھیں، وہ ارباب علم کے تبصروں کی روشنی میں دور کردی گئی ہیں'' فہرست کے اجمالی مندرجات کو تبدیل کر کے ابو سعید نورالدین صاحب نے ''تفصیلی فہرست'' مرتب کر دی ہے تا کہ کتاب کی ''افادیت بڑھ'' جائے۔ مگر کتابیات جوں کی توں ہے۔ ''نقش دوم'' اور اب ''نقش سوم'' بھی، ''نقش اوّل'' کے مطابق۔

میں نے ابھی عہد طفولیت کی بات کی تھی۔ اس سلسلے میں مصنف کا یہ اقتباس دیکھیے

''کتاب کے حصہ اول یعنی اسلامی تصوف کی تاریخ پر مشتمل جز کے بارے میں بعض بزرگوں کا کہنا ہے کہ اس میں خود مصنف کی تحقیق کم ہے اور دوسرے محققین کی تحقیقات سے استفادہ بے شک زیادہ ہے۔ ان کا کہنا بالکل درست ہے۔ اس حصے کے ماخذ اکثر و بیشتر ثانوی ہیں'' (ص ۲۰۔۲۱۔ دیباچہ طبع سوم)

اس سے بھی زیادہ صاف گوئی اس سے اگلے پیراگراف میں ملتی ہے۔ لکھتے ہیں

''بعض دانشوروں کو اس بات پر اصرار ہے کہ حسبِ دستور، کتاب کے اخیر میں انڈکس شامل کیا جائے۔ اس سلسلے میں اطلاعاً عرض ہے کہ میں نے قصداً ایسا نہیں کیا اس لیے کہ میرے خیال میں اس نوع کے موضوع کے لیے سوائے اس کے، کہ کتاب کی ضخامت غیر ضروری طور پر بڑھ جاتی ہے۔ انڈکس کا عملاً کوئی مصرف نہیں ہوتا'' (ص ۲۱، طبع سوم)

آپ کہیں گے کہ کیسی غیر علمی بات ہے (اگر کوئی مبصر بھی، مصنف کی طرح صاف گوئی سے کام لے تو شاید کہے۔ کیسی جاہلانہ بات کی ہے) مگر اس سے یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ جامعات کی تحقیق اقبالیات، چالیس برس بعد بلوغت کی منزل سے دور ہے۔ اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ ناشر نے، جو پاکستان کا سب سے قدیم، سب سے معروف اور سب سے بڑا اقبالیاتی ادارہ ہے۔ یعنی: اقبال اکادمی پاکستان۔ اس نے بھی، انڈکس کی عدم شمولیت اور منقولہ بالا پیراگراف شائع کر کے، گویا مصنف کے نقطۂ نظر کی تائید کر دی ہے۔

اب اقبال اکادمی کی بات آئی ہے تو بلاشبہ اقبالیات کے ضمن میں اکادمی کی خدمات بھی بہت ہیں، مگر بہر حال ہے تو یہ ایک سرکاری ادارہ ہمارے اداروں میں کیا ہوتا ہے؟ اسی کتاب کے طبع سوم کے دیباچے کا ایک قدرے طویل اقتباس سن لیجیے مصنف لکھتے ہیں۔

''پہلا ایڈیشن بہت پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ دوسرے ایڈیشن کے لیے میں نے کتاب پر نظر ثانی کر کے بہت سی

ترمیمات عمل میں لاکر مسوّدہ ۱۹۷۵ء میں اقبال اکادمی پاکستان کراچی کو بھیج دیا تھا۔ اس زمانے میں اکادمی کے نائب صدر سید عبدالواحد تھے موصوف کے ایک مراسلے سے معلوم ہوا تھا کہ کتاب کی طباعت کا کام شروع ہو چکا تھا۔

''بعد ازاں ملک میں جو سیاسی افراتفری پھیلی ۔اس میں کافی عرصہ بیت گیا۔ اوائل ۱۹۷۶ء میں حالات جب قدرے مساعد ہوئے تو میں نے کتاب کی اشاعت کے بارے میں خط لکھ کر دریافت کیا معلوم ہوا کہ اس اثناء میں اکادمی کا دفتر کراچی سے لاہور منتقل ہوگیا اور اس کتاب کو علامہ اقبال کے جشن صد سالہ کی اشاعتی پروگرام میں شامل کیا گیا۔ جس کی تیاریاں ان دنوں زوروں پر تھیں۔ اس سے میں مطمئن رہا''

''نومبر ۱۹۷۷ء میں جشن صد سالہ کے سلسلے میں ''کانگریس انٹرنیشنل علامہ اقبال'' میں شرکت کے لیے میں لاہور گیا تو دیکھا۔ صورت حال دِگرگوں ہے کتاب کی اشاعتِ دوم فوٹو پرنٹ میں بغیر کسی ترمیم کے جوں کی توں شائع کر دی ہے۔ دیکھ کر بڑا قلق ہوا۔ جب دریافت کیا گیا کہ ایسا کیوں ہوا تو معلوم ہوا کہ ترمیم کردہ مسوّدے کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہ تھا بہرحال جو ہونا تھا ہوگیا''

''کانگریس انٹرنیشنل کے اختتام پر وہ ترمیم کردہ مسوّدہ تلاش کرایا۔ مگر اکادمی کے دفتر میں کہیں اس کا سراغ نہ ملا۔ شاید دفتر کی کراچی سے منتقلی کے دوران کہیں تلف ہوگیا''

''لامحالہ کیا ہوا کام مجھے دوبارہ کرنا پڑا۔ پھر سے پوری کتاب پڑھی اور حسبِ ضرورت کانٹ چھانٹ اور حذف و اضافہ کے بعد تیسرے ایڈیشن کے لیے ازسرِ نو مسوّدہ تیار کیا اور اکادمی کے دفتر لاہور بھیج دیا۔ مگر میری شوئ قسمت کہ وہ مسوّدہ بھی گم ہوگیا۔ خط کتابت کے ذریعے تلاش جاری رکھنے کی درخواست کی۔ مگر اس مسوّدہ کا کسی طرح کوئی پتہ نہ چلا۔ ہمت ٹوٹ گئی۔ اکادمی سے وعدہ تو کر لیا تھا کہ پھر سے مسوّدہ درست کر کے بھیج دوں گا۔ مگر وعدہ کے مطابق کام نہ ہو سکا۔ غیر معمولی تاخیر ہوگئی''

''اس اثناء میں کتاب نایاب ہو چکی ہے۔ لہذا مزید تاخیر کیے بغیر کام مکمل کر کے مسوّدہ اکادمی کو بھیجا، تاکہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے کتاب کی اشاعت سوم کا انتظام کیا جا سکے'' (ص ۱۷، ۱۸ طبع سوم)

اس طویل اقتباس کے لیے معذرت چاہتا ہوں، آپ کی سمع خراشی ہوئی مگر اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اقبالیات کے نشیب و فراز کیا ہیں اور اقبالیاتی تحقیق اور اقبالیات کے اشاعتی معیار میں کمیوں، کوتاہیوں کے اسباب کس نوعیت کے ہیں۔ اقبال اکادمی کا ذکر چل رہا ہے تو جناب مشاہد حسین رزّاقی (م ۱۴ مئی ۱۹۹۹ء) کا ایک اقتباس بھی سنتے چلیے۔ انہوں نے اقبال کی انگریزی تحریروں کا ایک مجموعہ قیامِ حیدر آباد دکن کے زمانے میں تیار کیا تھا، فسادات، ہجرت اور نقلِ مکانی میں وہ ضائع ہوگیا، پاکستان پہنچ کر انہوں نے ازسرِ نو محنت کی اور دوبارہ مجموعہ تیار کیا اور اشاعت کے لیے اسے اکادمی کے سپرد کر دیا، مگر اس کی اشاعت اکادمی سے نہیں، بلکہ لاہور کے ایک پرائیویٹ پبلشر، شیخ غلام علی اینڈ سنز کے ہاں سے عمل میں آئی اور وہ بھی کوئی ۱۵، ۱۶ برس بعد ۱۹۷۹ء میں کیوں؟ رزاقی صاحب کی زبانی سنیے

This collection should have been published in the early sixties, but I was kept in delusion by the director of a well known academy in which I had placed great hopes of assistance. All my efforts in this connecion proved futile. Extreme lethargy was demonstrated where acute deligence was called for and it was not without difficulty that I got back my manuscript after five years. However all that is over and the collection is now being published by Messrs Sh. Ghulam Ali & Sons, Lahore.

اس قصۂ عجیب و دردناک کو یہیں چھوڑ کر آگے چلتے ہیں۔

☆ The Political Philosophy of Iqbal (پروین فیروز حسن)

ابوسعید نورالدین کے مقالے کے تقریباً گیارہ سال بعد، (جی ہاں اس طویل عرصے میں کسی پاکستانی یونیورسٹی میں علامہ اقبال پر پی۔ایچ ڈی سطح کی کوئی تحقیق نہیں ہوئی) پروین فیروز حسن (اب پروین شوکت علی) نے جامعۂ پنجاب کے شعبۂ سیاسیات سے ۱۹۶۷ء میں عنوانِ بالا پر تحقیق مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ ڈاکٹر منیر الدین چغتائی کی نگرانی میں مکمل ہوا۔

مقالہ نگار کا خیال ہے کہ اقبال کے فکر و نظر کے مختلف شعبوں (سیاسیات، مذہبیات، اخلاقیات، الٰہیات وغیرہ) میں ان کے سیاسی تفکّر و نظریات کا اصل چہرہ، تاحال ایک تاریک غبار میں پنہاں ہے اور سیاسیات کے ضمن میں فکرِ اقبال کو ان کے مذہبی اور فلسفیانہ تصورات سے مربوط کر کے پیش نہیں کیا گیا۔ یہ مقالہ اسی خلا کر پُر کرنے کی ایک کوشش ہے۔ (دیباچہ، طبع دوم ۱۹۷۸ء، ص xviv)

ڈاکٹر پروین نے اپنی تحقیقی کاوش میں حاکمیّت، نبوّت، اجتہاد، تصورات خودی، مردِ کامل اور ملّت کی سیاسی اہمیت، وطن پرستی، مسلم آفاقیت، اشتراکیت، جمہوریت جیسے موضوعات کے ساتھ فکرِ اقبال کا ربط تلاش کیا ہے۔ انہوں نے اقبال کے نظریۂ اجتہاد پر انہیں زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے، ان کے خیال میں یہ اقبال کے (Most creative contributions) میں سے ہے (ص ۳۴۹، ۳۵۰)۔ پروین شوکت علی کہتی ہیں کہ اقبال پیشہ ور سیاستدان نہ تھے آپ انہیں (Philosopher . Politicion) کہہ سکتے ہیں۔ ان کے نتائج تحقیق کا اختتام اس تاثر پر ہوتا ہے کہ اسلام کی حالیہ تاریخ میں کوئی اور ایسی شخصیت نظر نہیں آتی، جس نے اسلامی نظریے کی حیاتِ نو میں اقبال جیسا کارنامہ انجام دیا ہو۔ سیاسی مسائل کے حل کے لیے اقبال کا تعقّل

آمیز طرزِ فکر، اسلام کے سیاسی فلسفیوں میں انھیں ایک ممتاز مقام عطا کرتا ہے

کچھ شبہ نہیں کہ مصنفہ نے مقالہ محنت و کاوش سے تیار کیا ہے اور اقبال کے فکر و فلسفے کو اس کے صحیح تناظر میں پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ باعثِ اطمینان یہ ہے کہ مقالے کی تدوین و ترتیب میں انھوں نے بڑی مہارت اور سلیقہ مندی سے تحقیقی اصولوں کی پاسداری کی ہے۔ مصنفہ نے پی۔ ایچ ڈی سے پہلے اپنی متعلمی کا کچھ زمانہ انگلستان کی بعض یونیورسٹیوں میں گزارا۔ مزید برآں بہت سے مغربی اور یورپی مآخذ ان کے زیرِ مطالعہ رہے غالباً اسی مطالعے اور تربیت کا نتیجہ ہے کہ مقالے کی کتابیات اور اشاریہ ہنر مندی سے مرتب کیے گئے ہیں

☆ Iqbal,s Philosophy of Knowledge: ۔ (محمد معروف)

اس مقالے پر مصنف کو پنجاب یونیورسٹی (شعبہ فلسفہ) نے ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ ڈاکٹر محمد معروف فلسفے کے استاد ہیں اور اس تحقیقی مقالے کے بعد بھی، علامہ کے فکر و فلسفے پر لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ چند یوم کی محدود مدت میں اس غیر مطبوعہ مقالے (بلکہ کسی بھی غیر مطبوعہ مقالے) تک ہماری رسائی نہیں ہوسکتی۔ تاہم مقالے کے معیار کے بارے میں ہم حسنِ ظن رکھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔

☆ Impact of Rumi on the Relegious thought of Iqbal: (ایم نذیر)

۱۹۷۳ء میں ایم نذیر نے جامعہ پنجاب کے شعبۂ فلسفہ سے عنوانِ بالا پر مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ مولّف کے قلمی نام نذیر قیصر سے چھپ چکا ہے (اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۸۹ء) جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، تحقیق کار نے اقبال کے مذہبی افکار پر رومی کے اثرات کا مطالعہ کیا ہے، یہ ایک طرح کا تقابلی جائزہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عشق، فقر، خودی، مردِ کامل، تقدیر، عقل و عشق، جہد و عمل، اسی طرح وحی، معراج، خدا، جنت دوزخ، ہبوطِ آدم، مزید برآں غلامی، نقالی، مایوسی، خوف اور حُزن و خوف جیسے مسائل و نکات پر اقبالؔ نے رومی کے اثرات قبول کیے، اور دونوں کے نقطۂ نظر میں خاصی ہم آہنگی ملتی ہے۔ مصنف نے متذکرہ بالا عنوانات کے علاوہ بھی بعض پہلوؤں سے رُومی و اقبالؔ کے نظریات پر بحث کی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ دونوں کے افکار کا بنیادی سرچشمہ قرآن و حدیث ہے۔ رُومی نے تیرھویں صدی کے لوگوں کے لیے اور اقبالؔ نے اپنے معاصرین کے لیے قرآن کے چشمۂ صافی کی تشریحات پیش کی ہیں، اسی لیے دونوں مذہبی اور اخلاقی نقطہ نظر سے کائنات کی معنویت پر یقین رکھتے ہیں، دونوں کا پیغام آفاقی ہے اور دونوں کے نزدیک مذہب پر اس کی صحیح روح کے ساتھ عمل پیرا ہونے ہی میں نجات مضمر ہے۔

ڈاکٹر نذیر قیصر کا خیال ہے کہ اقبالؔ نے رومیؔ کو مسلم فکر و روایت کی ایک مثال سمجھتے ہوئے اس سے براہِ راست، اور بالواسطہ بھی وسیع الاطراف اور ہمہ گیر اثرات قبول کیے ہیں۔ بایں ہمہ وہ ایک اُرِجنل مفکّر ہیں۔ انہوں نے رومی کو مرشدِ معنوی ضرور بنایا،

مگر رُومی کے سیدھے سادے فکر کے مقابلے میں اقبالؔ کا ذہن فلسفیانہ اور منطقی ہے۔ بعض اعتبار سے وہ رُومیؔ پر سبقت رکھتے ہیں۔ رُومیؔ تیرھویں صدی کا صوفی شاعر اور اقبالؔ بیسویں صدی کا فلسفی شاعر ہے۔ پروفیسر شمِلؔ اور ڈاکٹر جاوید اقبالؔ نے مصنف کی کاوش کو سراہا ہے مگر مؤخر الذکر کی رائے سے اتفاق ممکن نہیں یہ ایک اور جنل کاوش ہے اور لائق تقلید بھی۔

اس مقالے کے بارے میں راقم کو ذاتی طور پر علم ہے کہ اشاعت کے موقع پر، ناشر کے ہاں اس کی صحت و تصحیح کا خاصا کام ہوا۔ اس کے باوجود بعض مقامات اب بھی چغلی کھاتے ہیں کہ مؤلف کے ہاں فارسی کا پہلو خاصا کمزور ہے، مثلاً ص ۹۹ پر مصنف نے رومی کے ایک شعر میں مُستعمل ترکیب ''بادۂ عِلّمی'' کو ''زیادۂ غبی'' لکھا اور اس ترجمہ غبی کی شراب کیا ہے اب ظاہر ہے اگر آپ فارسی سے ناواقف ہیں تو رومی کا مطالعہ، اور پھر اقبال پر اس کے اثرات کا جائزہ ایک اطمینان بخش کاوش کیسے قرار پائے گا۔

متذکرہ بالا دو تحقیقی مقالوں کے بعد، پھر ایک لمبا وقفہ آتا ہے۔ آئیندہ کئی برسوں میں پاکستانی جامعات میں اقبال پر کوئی تحقیق نہیں ہو سکی۔ ۱۹۷۷ء میں ولادتِ اقبال کے صد سالہ جشن کے موقع پر بکثرت تقاریب اور کتابوں کی اشاعت نے اقبالیات پر کام کی تحریک پیدا کی۔ آیندہ ۱۲، ۱۳ میں برسوں اس رجحان کا ایک مثبت اور خاطر خواہ نتیجہ حسبِ ذیل تحقیقی مقالوں کی صورت میں سامنے آیا۔

۱۔	تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ	رفیع الدین ہاشمی	۱۹۸۰ء	جامعہ پنجاب، اردو
۲۔	اقبال کا تصور بقا سے دوام	نعیم احمد	۱۹۸۷ء	جامعہ پنجاب، فلسفہ
۳۔	مکاتیب اقبال کا تنقیدی جائزہ	رحیم بخش شاہین	۱۹۸۷ء	جامعہ سندھ، اردو
۴۔	فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ	محمد صدیق جاوید	۱۹۸۷ء	جامعہ پنجاب، اردو
۵۔	باقیاتِ شعر اقبال کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	صابر حسین کلوروی	۱۹۸۹ء	جامعہ پنجاب، اردو
۶۔	اردو شاعری پر اقبال کے اثرات	محمد آفتاب احمد ثاقب	۱۹۹۰ء	جامعہ پنجاب، اردو

☆ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ (رفیع الدین ہاشمی):۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی نگرانی میں تحریر کردہ یہ مقالہ، اقبال کی شاعری اور نثر کے متن کا ایک تحقیقی مطالعہ ہے۔ علامہ کے شعری مجموعوں کی تالیف و اشاعت کب کہاں ہوئی؟ اولین اور مابعد اشاعتوں میں صحتِ متن کی کیا ضروت ہے؟ علامہ نے اپنے متن میں کب اور کیا کیا تبدیلیاں اور حذف و اضافے کیے؟ پھر متنِ اقبال کی تحقیقی تدوین کی کیا ضرورت و اہمیت ہے اور اس کی کیا صورت ممکن ہے۔ مختصر یہ کہ متنِ اقبال کو اصل، مکمل تر اور زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ مدوّن کر کے شائع کرنے کی جانب پہلی بار توجہ دلائی گئی ہے۔

اس مقالے کے معیار کے بارے میں میرے لیے کچھ کہنا مشکل ہے۔

البتہ یہ بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ علی گڑھ سے ڈاکٹر ابن فرید نے اسے ایک ''اہم اور نا قابلِ فراموش کتاب'' (''الفاظ'' علی گڑھ، ستمبر اکتوبر ۱۹۸۳ء) اور ڈاکٹر انور سدید نے اسے ''اقبالیات پر کام کرنے کے لیے ایک اساسی دستاویز'' قرار دیا (''اوراق'' لاہور، مئی، جون ۱۹۸۳ء) پٹنہ سے ڈاکٹر عبدالمغنی کے خیال میں یہ ''اقبالیات میں ایک وقیع اضافہ'' اور ''ایک بے مثال علمی دستاویز'' ہے (''مریخ'' پٹنہ، جنوری تا اگست ۱۹۹۹ء)[۳]

☆ اقبال کا تصور بقائے دوام (نعیم احمد):۔

عنوان سے موضوع مقالہ واضح ہے، مقالہ نگار کے خیال میں موت کا مسئلہ بقائے دوام سے گہرا تعلق رکھتا ہے، بقائے دوام کا ایقان مذہبی بنیادوں پر ہی ہوسکتا ہے۔ اس کا اقرار رجائیت پسند طرزِ فکر کے تحت فرد کو آمادہ عمل رکھتا ہے اور اس کا انکار قنوطیت، حسرت و یاس اور بے معنویت پیدا کرتا ہے۔ فرد سے آگے بڑھ کر کسی معاشرے کی سماجی اور معاشرتی صورتِ حال پر اس کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اِسی اقرار یا انکار کی بنیاد پر بعض نظام ہائے حیات کی پوری عمارت اُستوار ہوتی ہے۔ مصنف کے خیال میں بقائے دوام کے مسئلے پر اقبال بعض مغربی فلسفیوں خصوصاً برگساں، ولیم جیمز اور نطشے سے متاثر ہوئے، بعد ازاں رومی نے حقائق و معارف کے گہرے سمندروں تک اس کی رہنمائی کی، مزید برآں قرآنی تعلیمات نے بھی اس ضمن میں فکرِ اقبال کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ مگر اقبال کا تصور بقائے دوام کیا ہے؟ ڈاکٹر نعیم احمد کے مطابق اقبال کے نظریہ بقا اور قرآن کے نظریۂ بقا میں کوئی فرق نہیں۔ اس ضمن میں اقبال کے عقیدے کی اساس مذہبی ہے۔ وہ اس مسئلے کے فکری اِشکالات اور منطقی تضادات سے آگاہ ہیں۔ ان کا زاویۂ فکر و نظر فلسفیانہ ہے شاید اسی لیے بعض امور (جیسے: جنت دوزخ مقامات نہیں۔ نفسی احوال ہیں) پر اعتراض کیے گئے ہیں۔ مصنف کہتے ہیں کہ اگر اقبال کے مجموعی فکر کو سامنے رکھیں تو پھر یہ اِشکال پیدا نہیں ہوتے، اور نہ اُن کے تصورات میں تناقصات نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر نعیم نے موضوع کے جملہ پہلوؤں کا بڑی خوبی اور خوبصورتی سے احاطہ کیا ہے۔ اپنے موقف کی تائید میں انہوں نے اقبال کی شاعری سے بھی اِستشہاد کیا ہے اور علامہ کے زیرِ مطالعہ کتب اور اُن پر اُنکے حواشی اور نشانات نے بھی ڈاکٹر نعیم احمد کی رہنمائی کی ہے۔ ایک جگہ انہوں نے ایسی آیاتِ قرآنی کا شمار ''متشابہات'' کے ذیل میں کیا ہے جن میں آخرت کا نقشہ کھینچا گیا ہے، ہمارے خیال میں یہ درست نہیں ہے۔ اسی طرح یہ اسلوب: اقبال کہتا ہے ---۔ اقبال لکھتا ہے ---۔ اقبال تشریح کرتا ہے ----۔ اُردو میں نامانوس اور غریب ہے اور علامہ اقبال کے سلسلے میں تو نامناسب، اور ہم مشرقیوں اور اقبالیین کے نقطۂ نظر سے) خلافِ ادب بھی ---۔ بہر حال مجموعی طور پر یہ ایک عالمانہ مطالعہ ہے۔ باعثِ مسرت و اطمینان یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر نعیم احمد

نے ایک فلسفیانہ موضوع پر لکھتے ہوئے ایسا سادہ، مگر علمی اسلوب اختیار کیا ہے، جو اِبلاغ و تفہیم کے جملہ تقاضے پورے کرتا ہے۔
اس سے مصنف کے سلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ، اُردو زبان میں ترسیل و اظہارِ معنی کے وسیع امکانات کا اندازہ ہوتا ہے ۴

☆ مکاتیب اقبال کا تنقیدی جائزہ (رحیم بخش شاہین):۔
یہ مقالہ اقبال کے خطوط کی تحقیق و تدوین کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ مقالہ نگار نے منتخب مکاتیب کا متن درست کیا ہے، مکاتیب الیہم کے حالات اور اقبال سے ان کے روابط پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں متنِ خطوط پر ضروری حواشی کا اہتمام بھی کیا ہے۔ وہ اس مقالے کو، نظرِ ثانی کے بعد شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور غالباً تا حال اِن ۸ برسوں میں انہوں نے اپنا ارادہ فسخ بھی نہیں کیا۔ مگر وہ مطلوبہ نظرِ ثانی کا کام بھی مکمل نہیں کر سکے ۵ ان کی یہ تحقیق شائع ہو جائے تو تدوینِ متنِ اقبال کے سلسلے میں بہتوں کے لیے راہ نما ثابت ہوگی۔ (راقم کو یہ غیر مطبوعہ مقالہ دیکھنے کا موقع ملا ہے)

☆ فکرِ اقبال کا عمرانی مطالعہ (محمد صدیق جاوید):۔
مقالہ غیر مطبوعہ ہے البتہ اسکے چند اجزا بعض رسائل میں شائع ہوئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے خاصی محنت و کاوش سے کام لیا ہے۔ جناب صدیق جاوید، اقبالیات کے زیرک اور باریک بین محقق ہیں۔ اس موضوع پر اِکا دُکا مضامین تو ملتے ہیں، مگر ایک جامع اور مربوط مطالعہ پہلی بار پیش کیا گیا ہے ۶

☆ باقیاتِ شعرِ اقبال کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (صابر حسین کلوروی):۔
اس مقالے کے بارے میں بھی کوئی تفصیلی رائے دینا مشکل محسوس ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ یہ مقالہ میری نگرانی میں لکھا گیا۔ تاہم جو شخص بھی ان کے مقالے پر انصاف کی نظر ڈالے گا وہ مقالہ نگار کی غیر معمولی محنت و جاں کاہی کی داد دینے پر مجبور ہوگا۔ اقبالیات کا یہ اہم موضوع ایک عرصے سے تحقیق طلب تھا، کلوروی صاحب نے اسے تحقیق کے لیے منتخب کیا اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ انہوں نے اس کا حق ادا کر دیا۔ انہوں نے اپنے زیرِ تحقیق موضوع پر بہت سی نئی معلومات پیش کی ہیں۔ اقبال کا بہت سا غیر مدوّن کلام، رسائل و جرائد اور اخبارات سے جمع و یکجا کیا ہے۔ مختلف مقامات پر شائع ہونے والے متون کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اس امر پر بحث کی ہے کہ اقبال نے کن وجوہ پر اپنی بعض نظموں اور غزلوں کو کلام میں شامل نہیں کیا۔ اپنے مقالے کے آخر میں انہوں نے کلامِ اقبال کی اشاعت کی زمانی ترتیب کا تعین کیا ہے۔ اسی طرح اس مقالے میں اور مختلف النوع اشاریے، تقابلی گوشوارے، اقبال کی تحریروں کے عکس وغیرہ شامل ہیں۔ مختصر یہ کہ باقیاتِ اقبال (نہیں، باقیاتِ شعرِ اقبال) سے متعلق ہر نوع کی معلومات، نتائج اور کم و کیف شاملِ مقالہ ہے۔ قابلِ ذکر، بلکہ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے یہ سارا کام اقبالیات کے مرکز لاہور سے دور رہ کر کیا ہے۔ (لاہور کو اقبالیات کا مرکز، اس لیے کہا ہے کہ مآخذِ اقبالیات کا سب سے بڑا ذخیرہ اسی شہر میں دستیاب ہے۔)

صابر کلوروی نے پہلی بار علامہ اقبال کی قلمی بیاضوں کو باریک بینی سے دیکھا، اسی طرح رسائل و جرائد کے سیکڑوں شماروں سے بھی بہت کچھ اخذ و اکتساب کیا۔ اقبالیات کے ایک اہم موضوع پر یہ ایک نہایت عمدہ تحقیقی کاوش ہے، جو مستقبل میں تحقیقِ اقبالیات کے لیے ایک بنیاد فراہم کرے گی۔

☆ **اردو شاعری پر اقبال کے اثرات** (محمد آفتاب احمد ثاقب)

مقالہ نگار نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔ یہ مقالہ پروفیسر محمد منور (ناظم شعبہ اقبالیات پنجاب یونیورسٹی) کی نگرانی میں لکھا گیا۔ مقالہ تا حال غیر مطبوعہ ہے اور راقم کی نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ عرصہ تحقیق میں ایک بار فاضلِ گرامی نگرانِ مقالہ نے، جسے اس مقالے کے ایک دو باب دکھائے تھے۔ راقم کی رائے اطمینان بخش نہیں تھی۔

ا۔ پس نوشت:۔

مندرجہ بالا معروضات، شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی کے زیر اہتمام، باڑا گلی میں منعقدہ اقبال سیمینار (۱۲ تا ۱۴ جون ۱۹۹۵ء) میں پیش کی گئی تھیں۔ (اس سیمی نار کی منتظمہ پروفیسر منور روف نے اپنے دورِ صدارت میں ایسے متعدد علمی و ادبی سیمی ناروں کا اہتمام کیا۔ ان کی اس خدمت بلکہ ''صدقۂ جاریہ'' کا اعتراف ضروری ہے۔ سیمیناروں کے اس سلسلے کو جناب صابر کلوروری جاری رکھے ہوئے ہیں) اس دوران میں اقبالیاتی تحقیق کے ضمن میں خاص پیش رفت ہوئی ہے۔ ذیل میں ان کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ ایک نظر میں اس موضوع کی کامل جھلک سامنے آجائے۔

--1--

ا۔ ''اقبال کے ذہنی ارتقا میں فکر مغرب کا حصہ'' کے موضوع پر شعبہ اردو، جامعہ کراچی سے ایم عبدالرزاق نے ۱۹۹۳ء میں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ نگران ڈاکٹر شاہ علی تھے (بہ حوالہ فہرست شعبہ اردو، جامعہ کراچی)

۲۔ ''محمد اقبال وصلتہ التعافیر بالعالم العربی تاثرہ وتاثیرہ'' کے موضوع پر شعبہ علوم اسلامیہ، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے نُہی قطب الدین نجاّر نے ۱۹۹۵ء میں پی۔ ایچ ڈی میں کی۔ نگران: الٰہی بخش جارُاللہ۔

۳۔ ۱۹۹۴ء میں نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ اسلام آباد سے بریگیڈیر (ر) محمد اشرف چودھری کی تصنیف شائع ہوئی (The Muslim Ummah and Iqbal) ۔ گو مصنف نے کہیں یہ نہیں بتایا کہ یہ ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے، لیکن قرائن سے یہی اندازہ ہوتا ہے انہوں نے دیباچے میں اپنے نگران کار پروفیسر منظور احمد صدر شعبہ فلسفہ جامعہ کراچی کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ہمارے خیال میں ''اُمت مسلمہ اور اقبال'' تحقیق سے زیادہ تنقیدی موضوع ہے۔ مولّف نے آخر میں تصانیف اقبال کی جو فہرست دی ہے، اس میں ان کے اردو انگریزی مضامین ومقالات اور خطوط کے مجموعوں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ اقبال پر کوئی بھی تحقیق وتنقیدی بحث ان کے مکاتیب ومضامین سے اِعتنا کیے بغیر، مکمل نہیں ہوسکتی۔

۴۔ ''جاوید نامہ'' مقدمہ، حواشی اور تعلیقات'' کے موضوع پر ارشاد احمد شاکر نے ۱۹۹۹ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ اقبالیات سے اپنی تحقیق برائے پی۔ ایچ ڈی مکمل کی۔ نگران: ڈاکٹر محمد معزّ الدین۔ تا حال مقالہ غیر مطبوعہ ہے۔

۵۔ ''اقبال کے تصور ارتقاء'' پر محمد آصف اعوان نے ۲۰۰۰ء میں اوپن یونیورسٹی کے شعبہ اقبالیات ہی سے پی۔ ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ مکمل کیا ان کے نگران: ڈاکٹر محمد معروف تھے یہ مقالہ ابھی تک شائع نہیں ہوسکا۔

6. اوپن یونیورسٹی ہی سے ۲۰۰۰ء میں ایک اور ڈگری عبدالغنی صاحب نے حاصل کی موضوع:۔ An Evaluation of English translations of Iqbal Poetry نگران:۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ تا حال غیر مطبوعہ

۷۔ محمد ایوب صابر نے ۲۰۰۰ء میں اپنا مقالہ پنجاب یونیورسٹی میں داخل کیا۔ موضوع بہت اہم اور جامع تھا۔ ''علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر اعتراضات'' (تحقیقی وتنقیدی جائزہ) انہوں نے اقبال مخالف کتابوں اور مباحث کی نوعیت اور محرکات کا جائزہ لیا، بعدازاں اقبال کی شخصیت اور افکار وتصورات کے مختلف پہلوؤں (مذہبی، الٰہیاتی، سیاسی، ملی) پر اور پھر اُن کے شعری فن پر اعتراضات۔ (اختلافات سے لے کر مخالفتوں اور مُعاندانہ رویوں) کا ایک سیر حاصل اور بھر پور تجزیہ پیش کیا اس مقالے کا دائرہ بحث بہت وسیع تھا۔ اردو اور انگریزی میں پاکستان، بھارت اور بیرونی ممالک میں شائع شدہ لٹریچر، کتابیں اور مضامین اور بعض نہایت قدیم تحریریں۔۔۔۔ مقالہ نگار نے بڑی ہُنر مندی سے ان سب چیزوں کا اِحاطہ کیا۔ اس مقالے پر ۲۰۰۲ء میں اُنہیں ڈگری ملی تھی۔۔ یہ ضخیم مقالہ کئی حصوں میں زیر اشاعت ہے۔ اس کی تکمیل راقم کی نگرانی میں ہوئی۔

۸۔ ''علامہ اقبال پر برطانوی شعراء کے اثرات'' کے موضوع پر ۲۰۰۱ء ہی میں شیخ محمد اقبال صاحب نے اوپن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے نگران ڈاکٹر آغا محمد یمین تھے۔ واضح رہے کہ شیخ صاحب موصوف نے نابینا ہونے کے باوجود، اعلیٰ تعلیمی مدارج (ایم۔اے انگریزی، ایم۔اے اردو، ایم فل اقبالیات اوراب پی۔ ایچ ڈی اقبالیات) طے کیے ہیں

۹۔ ندیم شفیق ملک نے اوپن یونیورسٹی سے ۲۰۰۲ء میں Perception of life and works of Allama Iqbal in Pakistani English Journalism: A Survey of the English Dailies کے موضوع پر مقالہ مکمل کیا۔ انکے نگران ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی تھے۔ یہ اس لحاظ سے بہت اہم مقالہ ہے کہ مصنف نے پچاس سال کے انگریزی اخباروں میں شائع شدہ اقبالیاتی مضامین، خبروں، تجزیوں، مراسلوں اور مباحث کی نشان دہی کردی ہے۔ تحقیق اقبالیات کے لیے یہ حوالے کی ایک نہایت قیمتی دستاویز ہے۔ مقالہ چھپ جائے تو اس سے استفادہ کا دائرہ وسیع ہوجائے گا۔

۱۰۔ اِسی زمانے (۲۰۰۲) میں مسز اختر النّساء نے ''شروحِ کلام اقبال تحقیق و تنقیدی جائزہ'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ، مکمل کر کے (شعبہ اردو) پنجاب یونیورسٹی میں داخل کیا ہے۔ نگران:۔ رفیع الدین ہاشمی

۱۱۔ سجاد حسین شاہ نے ۲۰۰۰ء میں بہاول پور یونیورسٹی سے ''علامہ اقبال کی سوانح عمریوں کا تحقیقی جائزہ'' کے موضوع پر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے مقالہ میں نے نہیں دیکھا: تاہم اس کا ذکر اخبار اردو اکتوبر ۲۰۰۰ء ص ۸۴ پر ہوا ہے۔

--2--

متذکرہ بالا مقالات کے علاوہ بھی، بعض جامعات میں مختلف اقبالیاتی موضوعات پر تحقیق جاری ہے۔ سب سے زیادہ اوپن یونیورسٹی میں۔ نصف صدی میں ہونے والی اقبالیاتی تحقیق کی رفتار اور معیار اطمینان بخش نہیں ہے۔ علامہ اقبال، مملکت خداداد پاکستان کے نظریاتی بانی ہیں۔ مزید برآں وہ عصرِ حاضر کے بلند پایہ مفکّر اور اردو کے سب سے بڑے شاعر بھی ہیں۔ ان حیثیتوں کے پیشِ نظر اُن پر اس سے بھی زیادہ تحقیق ہونی چاہیے تھی، مگر ہماری جامعات نے اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی ہے۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں ''شعبۂ اقبالیات'' کا قیام، پاکستان میں اقبالیاتی مطالعہ و تحقیق کے ضمن میں ایک اہم

واقعہ، بلکہ ایک اہم پیشِ رفت ہے۔ شعبۂ مذکورہ کے تحت ایم فل کی سطح کے ڈیڑھ سو سے زائد تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں۔ گذشتہ ماہ لاہور میں منعقدہ علامہ اقبال بین الاقوامی کانفرنس (۲۱۔۲۴ اپریل ۲۰۰۳ء) کے موقع پر، ایک علمی نشست میں، اوپن یونیورسٹی کے تحقیقی مقالوں کا ذکر آیا تو اقبالیات کے ایک فاضل ماہر، ڈاکٹر صدیق جاوید نے، ایم۔فل اقبالیات (اوپن یونیورسٹی) کے مقالوں کو ''شرم ناک'' قرار دیا۔ راقم نے اس کا دفاع کرتے ہوئے وضاحت کی کہ اگر 100 مقالے لکھوائے گئے تو اُن میں، ممکن ہے دس خراب ہوں مگر بیس اچھے اور دس بہت ہی اچھے بھی ہوں گے۔ کسی کلاس کے 100 طالب علم تو سب کے سب فسٹ ڈویژن یا اے گریڈ نہیں لا سکتے۔ اوپن یونیورسٹی کے مقالات کا معیار واقعی لائق توجہ ہے اور اُسے بلند ہونا چاہیے، لیکن یہ اعتراف ضروری ہے کہ ان میں سے بعض، بہت اعلیٰ معیار کے مقالات ہیں اور کئی ایک اشاعت پذیر بھی ہو سکتے ہیں۔

اوپن یونیورسٹی کا شعبۂ اقبالیات، پاکستان کی کسی جامعہ کا واحد شعبہ ہے جو اقبالیاتی تعلیم و تحقیق کے لیے قائم ہے، مگر اس کے نتائج ابھی تک، توقعات سے نیچے ہیں۔ شاید اس لیے کہ تحقیق کے نگران کار مناسب تعداد میں میسر نہیں یا اس لیے کہ شعبے کی تنظیم میں کچھ کمی ہے اور ہر سال تحقیق کاروں کی ایک بڑی تعداد کو کام پر لگانا، ان کی تربیت راہنمائی کرنا اور انہیں بروقت ساحلِ مراد تک پہنچانا۔ آسان کام نہیں، اس کے لیے ایک ولولہ و لگن کی اور بڑی جانفشانی کے ساتھ مسلسل کاوش کی ضرورت ہے۔

--3--

پاکستانی جامعات میں ایم۔اے کی سطح پر بھی اقبالیات کے مختلف مقالات لکھوائے گئے ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں شعبہ اردو ،اورینٹل کالج جامعہ پنجاب کی ایک طالبہ حمیرا ظفر نے جامعہ پنجاب کے، ایم۔اے سطح کے تحقیقی مقالوں پر ایک تحقیقی جائزہ پیش کیا تھا، جس کے مطابق اس وقت تک پنجاب یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں 183 مقالے لکھوائے جا چکے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ (92) شعبۂ اردو میں لکھے گئے۔ گذشتہ ۷، ۸ برسوں میں جامعہ پنجاب میں ایسے بیسیوں مقالے اور لکھے گئے ہوں گے۔ اس سلسلے کی تفصیلی فہرست، راقم کی زیرِ ترتیب ''کتابیاتِ اقبال'' میں شامل ہے۔

ایم۔اے کے تحقیقی مقالے۔ کم و بیش معیار کے ہیں۔ ان میں سے بعض اطمینان بخش ہیں اور بعض کا معیار ایسا عمدہ ہے کہ وہ بیسیوں ایم۔فل کے مقالوں سے بھی بہتر و برتر ہوں گے۔ ان میں سے کئی ایک چھپ چکے ہیں، اور حوالے کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں، مثلاً:۔

۱۔ جگن ناتھ آزاد بطور اقبال شناس ——— یاسمین کوثر

۲۔ اقبال کی اردو نثر ——— زیب النّساء

۳۔ موضوع وار اشاریہ مضامین اقبال شناسی ——— قمر عباس

۴۔ اشاریہ کلام اقبال، اردو (مصرع وار) ——— یاسمین رفیق

یہ چاروں مقالے، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ اردو میں لکھے گئے۔ ان کے علاوہ اور بھی ایسے مقالے ہوں گے جو قابلِ اشاعت ہیں، مگر کسی وجہ سے شائع ہو کر، منظرِ عام پر نہیں آ سکے۔

یہ وضاحت ضروری ہے کہ کسی مقالے کا محض شائع ہو جانا اس کے معیاری ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اتفاق سے میرے سامنے ایم۔ اے اردو (شعبہ اردو، یونیورسٹی اورینٹل کالج) کا ایک مطبوعہ مقالہ موجود ہے۔ ''اقبال کی قومی شاعری'' یہ مقبول اکیڈمی لاہور سے (۱۹۸۴ء) میں دوسری بار چھپا۔ میں نے آج سے کئی برس پہلے اسے دیکھا تو سخت مایوسی ہوئی تھی اور میں نے آخری صفحے پر، اپنے تاثرات لکھ دیئے تھے۔ ذیل میں اس پر تاثرات کا ایک حصّہ جوں کا توں درج کرتا ہوں۔

''پہلے تین ابواب پس منظر کے نام پر لکھے گئے ہیں۔ 150 صفحات ''تمنا مختصری ہے، مگر تمہید طولانی'' باب چہارم میں اقبال کے ہاں وطنیت کے تاریخی ارتقا سے صرف نظر کر کے، مختلف نظموں کا، بلا تاریخی ترتیب کے ذکر کر دیا گیا ہے۔ اقبال کی شاعری کے دورِ اوّل کے رجحانات کیا ہیں؟ اس کا سراغ لگانے کی کوئی کوشش نہیں ملتی۔ بس چند منظومات کا ذکر اور ذکر سے زیادہ اشعار (کی بھرمار) ہے۔ باب پنجم: اقبال کی شاعری کا دوسرا اور تیسرا دور اور اس کے موضوعات، یہ کتاب کے موضوع سے بالکل غیر متعلق ہے۔ ایک بے حد مایوس کن کتاب۔ بالکل پوچ اور ٹریش کاش ہمارے ملک میں ایسا ضابطہ ہوتا کہ لغو کتابیں چھاپ کر کاغذ ضائع کرنے کے جُرم میں ناشر پر مقدمہ چلایا جا سکتا۔ آخری باب تو بالکل پوچ ہے، ۲۵ جنوری ۱۹۸۵ء''

اس مطبوعہ مقالے کا دیباچہ، ایک بہت نامور نقّاد نے تحریر کیا تھا جس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ مقالہ، جو گذشتہ دس، بارہ سال تک گوشۂ گم نامی میں رہا، اب شائع ہو کر، اقبال دوستوں تک پہنچ رہا ہے'' میں نے اس پر اپنا یہ تاثر رقم کیا تھا۔

''حالانکہ اس مقالے کی اشاعت مقامِ ماتم ہے۔ کاش یہ ہمیشہ کے لیے گوشۂ گم نامی میں رہتا۔ اس سے مصنفہ کا پردہ بھی رہ جاتا، اور مقدمہ نگاری کی سطحیت بھی چھپی رہتی۔ افسوس ہے، ہمارے بزرگ اس طرح کے مقدمے اور

تقریظیں لکھتے ہوئے، اپنے مقام و مرتبے کا بھی خیال نہیں کرتے۔ مگر شاید اُن کا مقام و مرتبہ ایسی ہی چیزوں سے متعین ہوتا ہے"

ممکن ہے، بعض قارئین کو، میرے ان تاثرات میں تلخی محسوس ہو، لیکن اس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس طرح کے بے رتبہ و بے حیثیت مقالے لکھنے، لکھوانا بالکل عبث ہے۔ جنھیں پڑھ کر قاری کو ایسا صدمہ ہو، جیسا مجھے ہوا۔ (اگر مجبوراً لکھوائے گئے تو چھاپنا کیا ضروری ہے)

یہ صورت صرف ایم۔اے کے مقالوں ہی کی نہیں، ایم فل اور پی۔ایچ ڈی کے بعض مقالے بھی بہت پست درجے کے ہیں۔ یہ امر، اُن اساتذہ کے لیے لمحہ فکریہ ہے جن کی نگرانی میں اس طرح کی مقالہ نویسی کا سلسلہ جاری ہے۔ اور اسے جامعات میں قابلِ فخر علمی پیش رفت خیال کیا جاتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ بعض اساتذہ زیادہ سے زیادہ مقالوں کے نگران بننا چاہتے ہیں اور معیار کی پستی کا ایک بڑا سبب "سکور بڑھانے" کی یہی طفلانہ خواہش ہے۔ اورینٹل کالج کے شعبہ عربی کے ایک استاد (جو چند برس پہلے ریٹائر ہوگئے) کی نگرانی میں ڈیڑھ سو پی۔ایچ ڈی کے مقالے تحریر کیے گئے اور ان پر ڈگری ملی۔

چند برس پہلے، پنجاب یونیورسٹی کے اردو بورڈ آف سٹڈیز میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ ایک استاد کو، ایک وقت میں پی۔ایچ ڈی کے کتنے مقالوں کی نگرانی سونپنی چاہیے؟ عام رائے یہ تھی کہ پانچ مقالوں کی تحدید مناسب رہے گی مگر سینیر اساتذہ کی نگرانی میں اس سے زیادہ مقالے لکھے جا رہے تھے اور وہ اپنا سکور کم کرنے پر رضامند نہ تھے اس لیے انھوں نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔

بات دور نکل گئی، معذرت چاہتا ہوں۔ علامہ کا شعر ہے۔

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

--4--

جامعات میں اقبالیاتی تحقیق کے ضمن میں مختلف جامعات کی ترجیح اور رجحان کا بھی اندازہ ہوتا ہے، مثلاً بہاء الدین ذکریا یونیورسٹی میں اقبالیات پر تا حال ایم۔اے کے مقالے لکھوائے گئے اور ڈاکٹریٹ کے کراچی اور بہاول پور کی جامعات میں چند مقالات تحریر ہوئے۔ البتہ پشاور میں اقبالیات کی طرف زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔ تازہ ترین اطلاعات

کے مطابق پشاور یونیورسٹی میں اقبال پر دو اور ایم۔اے کے پانچ مقالات لکھے جا چکے ہیں جبکہ پی۔ایچ ڈی کا ایک مقالہ زیرِ تحقیق ہے(۸) سب سے زیادہ کام بہر حال جامعہ پنجاب کے اردو، فارسی، فلسفہ، تعلیم اور سیاسیات کے شعبوں میں ہوا۔ اردو والوں پر اقبال کا حق سب سے زیادہ بنتا ہے۔ مگر یہ دلچسپ بات ہے کہ جامعہ پنجاب کے شعبہ اردو میں تین دہائیوں تک اقبال پر کوئی پی۔ایچ ڈی نہیں ہوا۔ شعبہ اردو میں اقبال پر پہلا پی۔ایچ ڈی، قیام پاکستان کے ۳۳ سال بعد تکمیل پزیر ہوا۔ (یہ راقم کا مقالہ تھا)۔ مستقل ایک اور الجھن یا مشکل: اوپن یونیورسٹی میں اقبالیات کا ایک شعبہ قائم ہونے سے تحقیقی مقالات نہایت کثیر تعداد میں لکھے لکھوائے جانے لگے ہیں اس لیے قابلِ تحقیق موضوعات کا ''توڑا'' پڑ گیا ہے۔ چنانچہ جن موضوعات پر ایم۔اے کے مقالے لکھے جا چکے ہیں، اُنہی پر ایم۔فل کے مقالے لکھوائے جا رہے ہیں۔ ایک جیسے موضوع ایم۔اے، ایم۔فل اور ڈاکٹریٹ کے لے تجویز کیے جا رہے ہیں۔

راقم کا خیال ہے کہ اب تک کے تجربات کی روشنی میں جامعات میں اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والے اساتذہ، اقبالیاتی اداروں اور اوپن یونیورسٹی کے شعبہ اقبالیات کو مل بیٹھ کر، اقبالیاتی تحقیق کے ضمن میں ایک لائحہ عمل اور بہتر طریقِ کار مرتب کرنا چاہیے

رفیع الدین ہاشمی۔ ۲۴ مئی ۲۰۰۳ء

حوالے اور حواشی:۔

۱۔ یہ مقالہ پہلی بار نسخ کمپوزنگ میں اقبال اکادمی پاکستان کراچی نے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ (۳۸۱ صفحات)۔ دیباچے میں مولف لکھتے ہیں۔:۔
''میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی نگرانی میں یہ کام کرایا اور اپنے گراں بہا مشوروں سے میری مدد فرمائی'' ص:۔الف، ب) رسالہ ''دانش'' اسلام آباد (شمارہ ۵ تا ۷، ص ۱۷) میں اس ''راہنمائی'' کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے ''دکتر ابوسعید نورالدین (داکا) رسالۂ دکتری خود را بہ عنوان:۔''اسلامی تصوف اور اقبال'' (عرفانِ اسلامی و اقبال (بہ راہنمائی دکتر غلام سرور بہ تکمیل رسانیدہ است''۔ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید مقالہ مذکورہ کے نگرانِ کار (Supervisor) ڈاکٹر غلام حسین سرور، صاحب تھے مگر یہ تاثر درست نہیں اگر چہ ڈاکٹر غلام سرور صاحب کی ''رہنمائی'' کا اعتراف کیا ہے (دیباچہ، ص:۔ب) مگر مقالے کے نگران (جیسا کہ محولہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے) بابائے اردو ہی تھے۔

۲۔ یہ جو مسوّدہ بار بار گم ہوتا رہا اور مصنف کو ہر بار از سرِ نو محنت و مشقت اٹھانی پڑی، اس میں ایک کوتاہی مصنف کی بھی ہے کہ انہوں نے کیوں نہ مسوّدے کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھی۔ میں اپنے متعدد مسوّدے ضائع کرنے کے بعد، اب اپنے ہر مضمون، مسوّدے کی نقل رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری تجویز ہے کہ یہ تردّد، ہر لکھنے والے کو کرنا چاہیے۔ فوٹو کاپی کی سہولت میسّر آجانے سے یہ مشکل نہیں ہے۔

۳۔ پہلے یہ مقالہ ۹ نومبر ۱۹۸۲ء کو اقبال اکادمی نے شائع کیا تھا۔ ۲۰۰۱ء میں اس کی دوسری عکسی اشاعت عمل میں آئی، جس میں طبع اوّل کی اغلاط کی درستی کے ساتھ، دیباچہ طبع دوم کا اضافہ شامل ہے۔

۴۔ یہ مقالہ بھی ۱۹۸۹ء میں اقبال اکادمی لاہور سے چھپ چکا ہے۔ (۳۷۶ صفحات)

۵۔ راقم نے شاہین صاحب کو بارہا توجہ دلائی کہ وہ مقالے پر نظرِ ثانی کر کے، اسے شائع کر دیں۔ وہ اس پر تیار تھے اور کئی بار انہوں نے کہا: ''بس، ذرا سی فرصت ملتی ہے تو دیکھتا ہوں'' مگر اجل نے مہلت نہ دی۔ وہ منصبی ذمہ داریوں اور مصروفیات میں اتنے الجھے رہے کہ نظرِ ثانی نہ کر سکے۔ ۱۸ جولائی ۱۹۹۸ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

۶۔ یہ مقالہ ۱۹۹۶ء میں اقبال اکادمی پاکستان سے شائع ہو چکا ہے۔ (۳۳۶ صفحات۔ قیمت: ۲۰۰ روپے) مصنف نے اس کے بیشتر اجزا اب اپنے اقبالیاتی کلیات (اقبال: نئی تفہیم۔ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء، ۸۲۸ صفحات۔ قیمت ۹۰۰ روپے) میں شامل کر لیے ہیں۔

۷۔ اپنی اسی تحقیق کی بنیاد پر صابر کلوروی نے ''کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال'' مرتب کیا ہے، جو اقبال اکادمی لاہور سے زیرِ اشاعت ہے۔ انہیں اپنا تحقیقی مقالہ بھی شائع کرنا چاہیے تھا، لیکن انہوں نے ساری توجہ کلیات کی ترتیب و تدوین پر مرکوز رکھی۔

۸۔ پشاور یونیورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی کی سطح کے دو مقالوں پر ڈگری دی جا چکی ہے۔ پہلا مقالہ ''اقبال کے ذوقِ جمال کے موضوع پر ہے جبکہ دوسرا مقالہ اقبال کے پشتو تراجم پر ہے جسے زینت الرحمٰن نے تحریر کیا ہے۔

صوبہ سرحد میں اقبال شناسی کی روایت

ڈاکٹر صابر کلوروی

اقبال کو صوبہ سرحد اور افغانوں سے جو محبت تھی وہ اب سربستہ راز نہیں۔ گول میز کانفرنس اور اپنے مشہور خطبہ الہ آباد میں وہ صوبہ سرحد کو آئینی اصلاحات دینے کا مطالبہ کرتے رہے۔ ملتِ اسلامیہ کے احیاء کے جو خواب وہ دیکھ رہے تھے اُس میں صوبہ سرحد، افغانستان اور وسطی ایشیاء کی مسلمان ریاستیں ان کی توجہّ کا خاص مرکز تھیں۔ ان علاقوں میں جو شخصیات بھی سیاسی افق پر نمودار ہوتیں علامہ ان سے احیائے اسلامی کی اُمیدیں وابستہ کر لیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کے خیال میں وہی قوم اِسلامی نقلاب کی نقیب ہوسکتی ہے جو قومی غیرت کا احساس رکھنے کے ساتھ ساتھ موت کے خوف سے بے نیاز ہو۔ اقبال کی شاعری میں شیر شاہ سوری، جمال الدین افغانی، امان اللہ خان اور نادر شاہ کا ذکر جس انداز سے ملتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پٹھانوں کی نسلی تاریخ اور ان کی روایات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ پٹھانوں کی دلیری، مروّت، مہمان نوازی، جفاکشی، روایات کی پاسداری تہذیب فرنگی سے دوری بلکہ نفرت، حرّیت پسندی اور انگریزوں کے خلاف جنگ اور سب سے زیادہ مذہب اسلام سے گہرا لگاؤ انہیں بہت پسند تھا اس کا ذکر اقبال کی شاعری اور نثر میں کئی موقعوں پر ہوا ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ پٹھانوں کی خامیوں سے بھی کماحقہ آگاہ تھے۔ چنانچہ وہ اپنی مشہور نظم "محراب گل افغان کے افکار" میں پٹھانوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گُم
کہ ہو نام افغانیوں کا بلند

پٹھانوں کی نسلی اور جبلّی خصوصیات میں مساوات کا اصول علامہ کو بے حد پسند تھا۔ اس ضمن میں ایک واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس کے راوی وقار انبالوی ہیں۔ لاہور ریلوے اسٹیشن پر عید کے موقع پر ایک پٹھان چلتی ہوئی گاڑی میں سوار ہونے لگا تو گارڈ

نے اُسے ایسا کرنے سے منع کیا اور بتایا کہ

"چلتی گاڑی پر سوار ہونا جرم ہے لیکن جب وہی گارڈ چلتی گاڑی میں سوار ہونے لگا تو پٹھان نے اُسے کھینچ کر نیچے اُتار لیا اور کہا جب ہم چلتی گاڑی میں سوار نہیں ہوسکتا تو تم بھی نہیں ہوسکتا"

اس جُرم پر پٹھان کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا گیا۔ مجسٹریٹ کے سامنے اُس نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں تو چلتی گاڑی میں سوار نہ ہوسکوں لیکن گارڈ صاحب خود چھلانگ لگا کر سوار ہو جائیں۔ مجسٹریٹ پٹھان کی سادہ بیانی سے بہت متاثر ہوا اور صرف ایک روپیہ جرمانہ کیا جو عدالت میں موجود کسی نے ادا کر کے پٹھان کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔ علامہ نے جب یہ قصہ سُنا تو وہ آب دیدہ ہوگئے اور راوی سے کہا کہ پٹھان کے مزاج میں انصاف، اور مساوات کا تصوّر، جبلّی طور پر موجود تھا جس نے اسے انتہائی قدم اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔

اقبال نے افغانوں اور افغان معاشرے کی روایات کا علم کتابوں سے حاصل نہیں کیا تھا بلکہ ان کے روابط صوبہ سرحد اور افغانستان کے کئی لوگوں سے تھے افغانستان کے بادشاہ امان اللہ خان، نادر شاہ، سردار صلاح الدین سلجوما لیر کوٹلہ کے نواب ذوالفقار علی خان بھوپال کے نواب حمید اللہ خان، کوہاٹ کے رسالدار بجید گل، حاجی صاحب ترنگ زئی اور اس طرح کی کئی نامور شخصیتوں سے اقبال کے روابط تھے۔ نادر شاہ کی دعوت پر وہ پشاور کے راستے افغانستان کا سفر بھی کر چکے تھے۔ اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے مقدمے کے سلسلے میں ڈیرہ اسماعیل خان کے راستے بلوچستان سے بھی ہوآئے تھے۔ ایبٹ آباد میں دو دفعہ تشریف لا چکے تھے۔ ایبٹ آباد کے دوسرے سفر (اگست ۱۹۰۴ میں تو وہ ایک ماہ ایبٹ آباد میں مقیم بھی رہے۔ علاوہ ازیں صوبہ سرحد کی درجنوں علمی، ادبی مذہبی اور سیاسی شخصیات سے ان کے دوستانہ تعلقات اور علمی روابط بھی قائم تھے۔

انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں کوہاٹ، ہزارہ اور پشاور کے متعدد اہل علم سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ بعض حضرات سے تو باقاعدہ خط کتابت تھی اقبال پشاور کی ادبی تنظیم "دائرہ ادبیہ" کے باقاعدہ سر پرستوں میں شامل تھے اور اس انجمن کے پیڈ پر علامہ کا نام اس حیثیت میں شائع بھی ہوتا تھا۔

خوشحال خان خٹک کی شاعری علامہ کو بے حد پسند تھی۔ ۱۹۲۸ء میں میجر راورٹی کی کتاب "**Selections from Pushto Poetry**" سے متاثر ہو کر انہوں نے رسالہ ''اسلامک کلچر'' حیدر آباد دکن میں ایک مضمون لکھا۔ جس میں خوشحال خان خٹک کی شاعری کے بعض نمونے بھی پیش کیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو دان طبقے میں خوشحال خان خٹک کو

متعارف کروانے والے علامہ اقبال ہی تھے۔ ''خوشحال خان خٹک کی وصیت'' کے عنوان سے بالِ جبریل کی نظم نے خوشحال خان خٹک کی قومی غیرت اور جرأت کو پورے ہندوستان میں متعارف کرادیا ہندوستان کے دونوں عظیم شاعروں کے افکار اور موضوعات میں بعض حیرت انگیز مماثلتوں کی بدولت بعض لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ اقبال خوشحال خان خٹک کے خوشہ چین تھے حالانکہ دونوں کے افکار میں مماثلت کی بڑی وجہ مخصوص ذہنی پسِ منظر اور مآخذ کا اشتراک ہے۔ دونوں مسلمان شاعر تھے۔ حریت پسند تھے، غلامی سے نفرت کرتے تھے، ظلم، جبر اور ناانصافی کو ناپسند کرتے تھے، غیرت مند تھے۔ اسلامی نظام کے علمبردار تھے۔ دونوں کے افکار کا سرچشمہ قرآن مجید اور مولانا روم کے افکار تھے۔ دونوں عاشق رسولؐ تھے اور محکومی کی زنجیریں توڑنے کے لیے قوت اور غلبہ حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔

اقبال ۱۹۲۸ء سے قبل خوشحال خان خٹک کے افکار سے قطعاً بے خبر تھے اور انہیں پشتو بھی نہیں آتی تھی، اقبال نے جن خیالات کا اظہار ۱۹۲۸ء کے بعد کی شاعری میں کیا وہ ان کی ۱۹۲۸ء سے پہلے کی شاعری میں پہلے سے موجود تھے۔ مثلاً شاہین اور اسکی صفات کے بارے میں تو وہ ۱۹۰۴ء میں واقفیت رکھتے تھے اور اپنی شاعری میں شاہین کا ذکر کر چکے تھے۔ ویسے بھی چند نظموں کے مطالعے سے افکار کی سطح پر اتنا بڑا انقلاب برپا نہیں ہوا کرتا۔ اسے اقبال کی مردم شناسی کہیے کہ انہوں نے چند اشعار کے مطالعے کے بعد خوشحال خان خٹک کی عظمت کا ادراک کرلیا۔

اقبال کو افغانوں کی اسلام پسندی کا بھرپور احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خالد خلیل کے نام ایک خط میں حکومت ترکی کے ادارے اسلامک سٹڈیز کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ افغانوں کی نسل، تاریخ اور ان کے حال و مستقبل پر چھے لیکچروں کا اہتمام کرے ان خطبات کا مفصّل خاکہ بھی علامہ اقبال نے بنا کر بھیجا لیکن یہ تجویز بار آور نہ ہو سکی

اقبال ملتِ افغانیہ کو پیکر ایشیا کا دل کہتے تھے۔ افغانوں کے مزاج اور ان کے نسلی اوصاف کا ذکر اقبال کی کئی نظموں میں ہوا ہے۔ پیام مشرق کی نظم "پیش کش" جاوید نامہ کا حصہ فلک عطارد اور نظم حرکت بہ کاخِ سلاطین مشرق، مثنوی مسافر، بالِ جبریل کی نظمیں نادر شاہ افغان اور خوشحال خان خٹک کی وصیت اور محراب گل افغان کے افکار جیسی نظموں سے اقبال کی پشتونوں سے محبت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس نظم میں اقبال کی افغان شناسی کا وافر شعور موجود ہے۔ اقبال نے ایک فرضی کردار تراشا ہے۔ اس خیالی کردار کے ذریعے اقبال نے افغانوں کے اوصاف گنواتے ہوئے ان کی خامیوں سے باخبر کیا ہے اور انہیں اسلامی دنیا میں اپنا کلیدی کردار ادا کرنے کے لیے تیار کیا ہے۔ افغانستان میں روس کی پسپائی کے تاریخی واقعے کے تناظر میں دیکھیں تو اقبال کا یہ شعر ایک پیشن گوئی کا درجہ رکھتا ہے۔

اس دور میں بھی مردِ خدا کو ہے میسّر

جو معجزہ پر بت کو بنا سکتا ہے رائی

اس مقالے میں ہم پر بت کو رائی بنانے والوں کی ان مساعی کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے اپنے اس محسن کے حضور قلمی نذرانہ پیش کر کے ادا کیا ہے۔ صوبہ سرحد میں اقبال کی چار بار آمد اور ان اسفار کی دلچسپ روداد، صوبہ سرحد کی تین درجن سے زائد اصحابِ علم و ادب سے اقبال کی ملاقاتیں، روابط اور خط کتابت کا ذکر، نیز اقبال کی شاعری اور نثر میں صوبہ سرحد اور اہلِ سرحد کے بارے میں جن خیالات کا اظہار ہوا وہ میری نئی کتاب "اقبال اور صوبہ سرحد" کا موضوع ہوگا۔ یہاں سرسری طور پر اُس علمی سرمائے پر نظر ڈالنا مقصود ہے جو اقبالیات کے عنوان سے صوبہ سرحد میں وجود میں آیا ہے ،اختصار کے پیشِ نظر اس علمی سرمائے کا تنقیدی جائزہ کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

صوبہ سرحد میں اقبال شناسی کی روایت، اردو، پشتو اور ہندکو تینوں زبانوں تک محدود رہی ہے۔ اس حوالے سے پشتو زبان کو ایک ایسا امتیاز حاصل ہے۔ جسے دنیا کی کوئی زبان چھین نہیں سکتی وہ یہ کہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کا مکمل ترجمہ پشتو میں ہو چکا ہے اور شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی کا ذکر ضروری ہے۔ جس نے اقبال اکیڈیمی کے تعاون سے تراجم مکمل کیے۔ بعض تراجم اس کے علاوہ بھی ہوئے ان تراجم کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ امیر حمزہ شنواری	ارمغانِ حجاز	۱۹۶۴ء
	جاوید نامہ	۱۹۶۷ء
۲۔ راحت زاخیلی	بانگِ درا	۱۹۶۳ء
۳۔ سمندر خان سمندر	رموزِ بےخودی	۱۹۵۲ء
۴۔	اسرارِ خودی	۱۹۵۴ء
۵۔ شیر محمد مینوش	ضربِ کلیم	۱۹۷۲ء
	پیامِ مشرق	۱۹۶۳ء
۶۔ صاحب گل حکیم جی	گلہ جواب دگلہ	۱۳۶۵ھ
۷۔ عبداللہ جان اسیر	پلوشے (بالِ جبریل)	۱۹۵۹ء
۸۔ عبدالحلیم اثر افغانی	بالِ جبریل	۱۹۶۷ء

۹۔ عبدالمنان اپیل نویس	شکوہ جواب شکوہ	۱۹۴۵ء
۱۰۔ محمد تقویم الحق کاکاخیل	زبورِ عجم	۱۹۶۱ء
	ضربِ کلیم	۱۹۶۷ء
	مثنوری پس چہ باید کرد	۱۹۶۹ء

علاوہ ازیں پروفیسر سید الابرار نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کا پشتو ترجمہ کیا جو اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ اس ضمن میں پشتو اکیڈیمی کے بانی مولانا عبدالقادر کی مساعی کا اعتراف کرنا بھی ضروری ہے جن کی بدولت یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اقبال سے متعلق پشتو میں پہلی کتاب صوبہ سرحد سے نہیں افغانستان سے شائع ہوئی۔ مصنف عبداللہ بختانی اور کتاب کا نام "   " ہے

صوبہ سرحد میں اقبال پر پہلی کتاب عبدالرحمن بے تاب کی ہے جس کا نام "علامہ اقبال حالات او خیالات" ہے جسے تجارت پبلی کیشنز نوشہرہ نے ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔ دیگر کتب کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ مولانا عبدالقادر	پہ جاوید نامہ یونظر	پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی	۱۹۶۷ء
۲، سید رسول رسا	شاعر اسلام علامہ اقبال	اقبال اکیڈیمی لاہور	۱۹۷۷ء
۳۔ محمد رفیق شاہ رفیق کاکاخیل	اقبال او د رفیق خیال	اکبر پریس نوشہرہ	۱۹۹۱ء

اس اثنا میں پشتو اکیڈیمی نے اپنے رسالے پشتو کا اقبال نمبر ۱۹۷۷ء میں شائع کیا جو ایک حوالے کی چیز ہے۔ ابھی حال ہی میں اس کا دوسرا نمبر شائع ہوا ہے۔ جو ۲۰۰۲ء کے سال اقبال کی مناسبت سے شائع ہوا ہے۔ ان اقبال نمبروں کے علاوہ پشتو میں دو کتابوں کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ سیف الرحمن سید	علامہ اقبال از احمد ندیم قاسمی	پشتو اکیڈیمی	۱۹۷۷ء
۲۔ وقار علی شاہ کاکاخیل	اقبال او افغانستان	پروفیسر فتح محمد ملک	ایضاً س۔ن

یوں پشتو میں اقبالیات کا کل سرمایہ ۲۴ کتب اور رسائل پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر اعظم اعظم کا ترجمہ "زندہ رود" اگر چہ مکمل ہو چکا ہے لیکن شائع نہیں ہوا۔ اقبال کی وفات پر پہلا پشتو مرثیہ سمندر خان سمندر کا ہے جو ۲۷ جون ۱۹۳۸ء کے

احسان اخبار میں شائع ہوا۔

رسالہ پشتو، اباسین، اولس اور جمہور اسلام میں اقبال کے فکروفن پر پشتو مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ سرحد کے پشتو اخبارات بانگِ حرم، وحدت سرحد اور شہباز اخبار میں بھی اقبال کے بارے میں مواد شائع ہوتا رہا ہے۔ پشتو میں لکھے گئے مقالات کی تعداد ۲۰۰ سے اوپر ہے۔ اہم پشتون اقبال شناسوں کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

"پریشان خٹک، ڈاکٹر محمد نواز طاہر، بہادر شاہ ظفر کاکاخیل، پروفیسر جہان زیب نیاز، فصل حق شیدا، مولانا فضل معبود، سید رسول رسا، ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک، محمد پردیش شاہین، پیر محمد شارق، صاحبزادہ حمید اللہ، سلطان محمد صابر، عبدالاکبر خان اکبر، پروفیسر محمد الرؤف نوشہروی، فضل احمد غازی، فقیر حسین مسرور، ڈاکٹر اعظم اعظم، ڈاکٹر سید قیوم، طاہر کلاچوی، اور پروفیسر عارف نسیم شامل ہیں"

منظومات کی تعداد بھی نثر کے مقالات سے کم نہیں۔ پشتو کی درسی کتابوں میں بھی اقبال کی سوانح اور افکار سے متعلق مواد شائع ہو چکا ہے۔ صوبہ سرحد کے کالجوں کے میگزین میں پشتو میں اقبال پر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جس میں اسلامیہ کالج کے میگزین "خیبر" کا ذکر ضروری ہے۔ ریڈیو پاکستان پشاور اور پشاور ٹیلی ویژن نے بھی اس سلسلے میں مثبت کردار ادا کیا ہے۔

اقبال شناسی کے موضوع سے ایم فل پر ایک نوجوان محقق پروفیسر زیت الرحمٰن نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی ہے اور ابھی حال ہی میں انہوں نے اقبال کے پشتو تراجم پر شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لے اپنا مقالہ داخل کرادیا ہے۔

پشتو کے مقابلے میں ہندکو کا دامن زیادہ وسیع نہیں رہا۔ اس میں اقبال پر اب تک صرف ایک ہی کتاب شائع ہوئی ہے۔ کتاب کا نام "حُرداقبال" (سن اشاعت ۱۹۹۸ء) اس کے مصنف حسام حر ہیں جن کا اصل نام اورنگ زیب ہے جو گورنمنٹ کالج پشاور میں اردو کے لیکچرار ہیں۔ ہندکو زبان میں اقبال کے کچھ تراجم بھی ہوئے ہیں جنہیں بشیر احمد سوز نے اپنی کتاب "اقبال اور ہزارہ" میں جمع کر دیا ہے۔ ان مترجمین میں پروفیسر محمد زمان مضطر، اسلم ناز خواجگانی، پروفیسر صوفی عبدالرشید اور یحییٰ خالد شامل ہیں۔

صوبہ سرحد میں پشتو اور ہندکو میں اقبال شناسی کی روایت کے مقابلے میں اردو زبان میں اقبال پر زیادہ کام ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان میں مطالعہ نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ تمام تر تعصّبات کے باوجود اردو نے یہاں اپنا وجود منوالیا ہے اور اب تو وہ عوام کی نہیں حاکموں کی زبان بن چکی ہے۔ اردو میں اقبال پر لکھی جانے والی کتب پشتو اور ہندکو میں لکھی

جانے والی کتب سے دوگنا ہیں۔

صوبہ سرحد میں اقبال پر اردو میں لکھی جانے والی پہلی کتاب مولانا سعید الدین شیر کوٹی کی ہے جو "شاعر مشرق " کے نام سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ سیرت اقبال (سن اشاعت ۱۹۳۹ء) اور بزم اقبال (سن اشاعت ۱۹۴۴ء) کو ہم نے اس جائزے میں اس لیے شامل نہیں کیا کہ طاہر فاروقی صاحب اُس وقت صوبہ سرحد میں ہجرت کر کے نہیں آئے تھے۔ ۱۹۷۷ء سے قبل اقبال پر لکھی جانے والی کتب کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ درس اقبال	محمد اشرف	۱۹۵۷ء
۲۔ خوشحال و اقبال	میر عبدالصمد	۱۹۶۰ء
۳۔ ترجمہ و شرح مثنوی پس چہ باید کرد	الٰہی بخش اعوان	۱۹۶۰ء
۴۔ اقبال گہوارہ تربیت میں	فقیر حسین ساحر	۱۹۶۴ء
۵۔ مردِ کامل	سید مظہر گیلانی	۱۹۶۴ء
۶۔ فکر اقبال کی تہذیبی قدریں (پمفلٹ)	موسیٰ خان کلیم	۱۹۶۴ء
۷۔ نوائے خودی	شیریں تاج	۱۹۶۴ء
۸۔ خیابان اقبال مرتبہ	طاہر فاروقی / خاطر غزنوی	۱۹۶۶ء
۹۔ دانائے راز	سید واجد رضوی	۱۹۶۷ء
۱۰۔ اقبال اور تہذیب عصر حاضر	سید واجد رضوی	۱۹۶۹ء
۱۱۔ چراغ لالہ	سید واجد رضوی	۱۹۷۵ء
۱۲۔ حکیم الامت علامہ اقبال کی نظر میں		
۱۳۔ سورہ اخلاص کی تفسیر	غلام ربانی	۱۹۷۶ء

سال اقبال ۱۹۷۷ء اور اس کے بعد درج ذیل کتب شائع ہوئیں۔

۱۔ یادِ اقبال	صابر کلوروی	۱۹۷۷ء
۲۔ دیدہ ور	پروفیسر متو رروف	۱۹۷۷ء
۳۔ پاکستان کا ڈکٹیٹر (قرآن اور اقبال کی نظر میں)	واجد رضوی	۱۹۷۷ء

۴۔ انتخاب کلام اقبال	حشمت جہاں ناز	۱۹۷۷ء
۵۔ اقبال کے ممدوح علما	افضل حق قرشی	۱۹۷۷ء
۶۔ اقبال کا فکر و فن	افضل حق قرشی	۱۹۷۷ء
۷۔ Iqbal the Universal Poet	افضل حق قرشی	۱۹۷۷ء
۸۔ اقبال کی مابعد الطبیعات	ڈاکٹر شمس الدین صدیقی	۱۹۷۷ء
۹۔ اقبال اور محبت رسولؐ	پروفیسر طاہر فاروقی	۱۹۷۷ء
۱۰۔ اقبال اور مدحت مصطفیٰ	سید محمود شاہ محدث ہزاروی	۱۹۷۹ء
۱۱۔ اسلامی مملکت کا نظام اقبال کی نظر میں	ایم غلام مصطفیٰ ثاقب حزیں	۱۹۸۲ء
۱۲۔ اشاریہ مکاتب اقبال	صابر کلوروی	۱۹۸۴ء
۱۳۔ تاریخ تصوف (اقبال کی نو دریافت کتاب حواشی تعلیقات)	صابر کلوروی	۱۹۸۵ء
۱۴۔ اقبال کے ہم نشین	صابر کلوروی	۱۹۸۵ء
۱۵۔ اقبالیات	محمد خالد جاوید	۱۹۸۸ء
۱۶۔ اقبال اور افغان	میر عبدالصمد مرحوم	۱۹۹۰ء
۱۷۔ معمار خودی	خانہ فرہنگ ایران	۱۹۹۱ء
۱۸۔ معاصرین اقبال	قاری فیوض الرحمان	۱۹۹۳ء
۱۹۔ اقبال دشمنی ایک مطالعہ	پروفیسر ایوب صابر	۱۹۹۳ء
۲۰۔ اقبال مسلم فکر کا ارتقاء	عطیہ سید	۱۹۹۴ء
۲۱۔ علی شریعتی اور اقبال	ڈاکٹر ظہور اعوان	۱۹۹۴ء

اس فہرست میں ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی کتب کے نام شامل نہیں۔ ڈاکٹر موصوف تحصیل مانسہرہ کے ایک گاؤں منگلور میں پیدا ہوئے لیکن ملازمت کے سلسلے میں لاہور میں مقیم رہے۔ صوبہ سرحد میں اقبال شناسی کی روایت میں ان کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ سید صاحب کے کام پر نظر دوڑائی جائے تو یہ بات پورے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کا کام صوبہ سرحد کے پورے ذخیرہ اقبالیات پر بھاری ہے۔ اقبال سے متعلق ان کی کتابوں کی تعداد بارہ ہے۔ ان کی کتب کے

نام یہ ہے۔

۱۔ اقبال اور قومیّت	سن۔ن
۲۔ کیا اقبال اشتراکی تھے	سن۔ن
۳۔ مقاماتِ اقبال	۱۹۵۹ء
۴۔ طیف اقبال مرتبہ ممتار منگلوری	۱۹۶۴ء
۵۔ سہل اقبال	۱۹۶۹ء
۶۔ مسائل اقبال	۱۹۷۴ء
۷۔ متعلقاتِ خطبات اقبال	۱۹۷۷ء
۸۔ ولی سے اقبال تک	۱۹۷۹ء
۹۔ ابنِ عربی اور اقبال	۱۹۷۹ء
۱۰۔ مقاصد اقبال	۱۹۸۱ء
۱۱۔ اقبال اور صوفی اتفاق واختلاف کی کہانی	۱۹۸۲ء
۱۲۔ مطالعہ اقبال کے نئے رخ	۱۹۸۴ء

۱۹۹۵ء کے بعد اقبال کے موضوع پر درج ذیل کتب سامنے آئی ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر فیوض الرحمان	معاضرین اقبال۔۔۔۔	۱۹۹۳ء
۲۔ ڈاکٹر ظہور اعوان	دو اقبال۔۔۔۔۔۔۔۔	۱۹۹۵ء
۳۔ ارشاد سواتی	اقبال کا اسلوبِ فکر۔۔۔	۲۰۰۲ء
۴۔ بشیر احمد سوز	اقبال اور ہزارہ۔۔۔۔۔	۲۰۰۲ء

صوبہ سرحد میں اردو زبان میں اقبال شناسی کی روایت پر ایک نوجوان محقق منصف خان سحاب نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔ مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق ڈاکٹر سید عبداللہ نے سب سے زیادہ اقبال پر مضامین لکھے۔ ان کے مضامین کی تعداد ۱۷۴ ہے۔ اردو زبان میں اقبال پر لکھے جانے والے مضامین کی یہ غالباً سب سے بڑی تعداد ہے۔ ڈاکٹر محمد ریاض مرحوم کے علاوہ شاید ہی اس ضمن میں کوئی محقق ڈاکٹر صاحب کے معیار یا مقدار کو پہنچ سکے۔

صوبہ سرحد میں کتب کے علاوہ بعض رسائل کے اقبال نمبر قابلِ ذکر ہیں۔ شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی نے اب تک دو اقبال نمبر شائع کیئے ہیں۔ پہلا نمبر "خیابانِ اقبال نمبر" کے نام سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا جبکہ دوسرا اقبال نمبر "خیابان دانائے راز" کے نام سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ پہلا نمبر کچھ اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں بھی شائع ہوا جسے خاطر غزنوی نے مرتب کیا۔ رسالہ احساس نے خاطر غزنوی کی ادارت میں ۱۹۶۶ء میں ایک وقیع اقبال نمبر شائع کیا۔۔ اس رسالے نے بعد میں ڈمی کی شکل میں اقبال نمبر بھی شائع کیا جواب ناپید ہے۔ اس سلسلہ میں تازہ اضافہ "نوادرِ اقبال نمبر" ہے جس میں بیشتر نوادر رقم الحروف نے اپنے ذخیرے سے فراہم کئے ہیں

یونیورسٹی پبلک سکول کے رسالے دامنِ سرحد نے بھی ۱۹۷۷ء میں اپنا اقبال نمبر شائع کیا۔ اس ضمن میں آخری قابلِ ذکر اقبال نمبر پی اے ایف پشاور بیس کا رسالہ "شاہین" ہے جس میں بعض اہم مضامین شائع ہوئے۔

اوپر جس تحقیقی مقالے کا ذکر کیا گیا ہے اس کے مطابق صوبہ سرحد میں اقبال پر لکھے جانے والے مقالات کی تعداد ۷۹۱ ہے لیکن یہ صورتِ حال ۱۹۹۴ء تک کی ہے اس کے بعد بھی اس موضوع پر کافی لکھا گیا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اردو میں اب تک کم از کم دو ہزار کے قریب اقبال پر مضامین لکھے جا چکے ہیں اہم مقالہ نگاروں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ	۴۷ مقالات
۲۔ پروفیسر طاہر فاروقی	۲۸ مقالات
۳۔ ڈاکٹر صابر کلوروی	۲۷ مقالات
۴۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی	۲۵ مقالات
۵۔ منصف خان سحاب	۲۳ مقالات

اقبال پر دیگر قابلِ ذکر مقالہ نگاروں میں پروفیسر منور روف، پروفیسر پریشان خٹک، پرورفیسر خاطر غزنوی، پروفیسر افضل حسین اظہر، پروفیسر ایوب صابر، محمد سرور پروفیسر صوفی عبدالرشید، سید یونس شاہ، ڈاکٹر عبدالستار جوھر پراچہ، محمد پرویش شاہین۔ سید واحد رضوی اور پروفیسر ارشاد احمد شاکر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر بھی صوبہ سرحد میں خاصا کام ہوا۔ ڈاکٹر ظہور اعوان کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے ۱۹۸۸ء میں ایریا سٹڈی سنٹر پشاور یونیورسٹی سے "اقبال اور افغانستان" پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ راقم

الحروف نے ۱۹۸۹ء میں "باقیات شعر اقبال کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے پنجاب یونیورسٹی میں مقالہ جمع کرایا جس پر ۱۹۹۰ء میں ڈگری دی گئی پی ایچ ڈی کی ڈگری پانے والے دیگر اصحاب کے نام یہ ہیں۔

۱۔	ڈاکٹر محمد خورشید	اقبال کی علمیات	(انگریزی) ۱۹۹۱ء
۲۔	ڈاکٹر ارشاد احمد شاکر	جاوید نامہ حواشی و تعلیمات	اوپن یونیورسٹی (۲۰۰۰)
۳۔	فقیرا خان فقری	اقبال کی جمالیات	پشاور یونیورسٹی ۲۰۰۳ء

زیت الرحمٰن نے اقبال کے پشتو تراجم پر ایک مقالہ شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی میں جمع کرادیا ہے جو پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے ہے۔ مردان کے اکرام اللہ شاہد "اقبال اور افغانستان" شخصیات پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے میں مصروف ہیں جبکہ محمد سفیان صفی اقبال کے خطوط پر۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے اپنی تحقیق میں مصروف ہیں۔

ایم فل کی سطح پر درج ذیل اصحاب نے اقبالیات میں ایم فل کی ڈگری حاصل کرلی ہے۔

۱۔	پروفیسر ایوب صابر	اقبال پر معاندانہ کتب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ
۲۔	پروفیسر ارشاد احمد شاکر	اقبال اور دوقومی نظریہ
۳۔	طالب حسین اشرف	ملفوظات اقبال کا تحقیقی جائزہ
۴۔	حمید کھوکھر	مثنوی پس چہ باید کرد ایک مطالعہ
۵۔	پروفیسر سراج الدین	اقبال اور ابن خلدون
۶۔	منصف خان سحاب	صوبہ سرحد میں اقبال شناسی کی روایت (اردو)
۷۔	زیت الرحمٰن	صوبہ سرحد میں اقبال شناسی کی روایت (پشتو)
۸۔	سفیان صفی	بانگ درا کے تیسرے دور کی نظموں کا جائزہ
۹۔	محمد المختار	اقبال اور فوق

یہاں اقبال شناسی کے فروغ میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ اقبالیات کی کارکردگی کو نہ سراہنا ناانصافی ہوگی جس نے ملک بھر میں ۲۰۰ سے زائد اسکالرز کو تحقیق میں مصروف رکھا۔

ایم اے کی سطح پر صوبہ سرحد میں اقبال پر لکھنے جانے والے مقالات کی تعداد بہت کم ہے اس کی وجہ یہ ہے پشاور یونیورسٹی میں ایم اے کی سطح پر مقالہ لکھنے کا آغاز ۱۹۹۵ء میں ہوا۔ اب تو ہر سال زیادہ سے زیادہ پانچ طلبہ کو مقالہ دیا جاتا ہے اب تک ایم اے کی سطح پر اقبال کے حوالے سے درج ذیل کام ہوئے ہیں۔

۱۔ سلمان علی ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کی اقبال شناسی

واضح ہو اس سے پہلے منظور اسلام پنجاب یونیورسٹی سے "اقبال کے معاشی نظریات" پر اپنا ایم۔اے کا مقالہ لکھ چکے ہیں اقبال کے نام پر اردو کی کئی ادبی تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ بزم اقبال کے نام سے ۱۹۳۴ء میں ایبٹ آباد میں ایک تنظیم قائم ہوئی۔ ۱۹۴۴ء میں اسی نام کی ایک تنظیم ہری پور میں قائم ہوئی۔ کوہاٹ میں ۱۹۴۹ء میں اقبال اکیڈیمی کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے روح رواں جمیل راز بنگش تھے۔ بعد میں اس تنظیم کو انجمن ترقی اردو کوہاٹ میں ضم کر دیا گیا۔ ۱۹۴۹ء میں ڈیرہ میں موسیٰ خان کلیم نے بھی "بزم اقبال" قائم کی۔ پشاور میں ثاقب حزیں مرحوم نے بھی اقبال کے نام پر ایک مجلس قائم کی جو زیادہ دیر نہ چل سکی۔ ۱۹۹۰ء میں سرحد اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام "علامہ اقبال یادگار لائبریری" کا قیام عمل میں لایا گیا جو بڑی کامیابی سے اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کوشاں ہے۔

ہر سال یوم اقبال جوش و خروش سے منایا جاتا ہے اخبارات اقبال سے متعلق خصوصی ایڈیشن شائع کرتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی سے بھی اقبال کے بارے میں پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ادبی میگزین اقبال کے لیے ایک گوشہ مخصوص کرتے ہیں۔ پشاور یونیورسٹی کا شعبہ اردو ہر سال صوبہ کی سطح پر اقبال پر مضمون نویسی کا ایک مقابلہ منعقد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بالعموم خانہ فرہنگِ ایران کے تعاون سے یوم اقبال کا انعقاد بھی کرتا ہے۔ اردو، فلسفہ اور فارسی کے شعبوں میں اقبال بطور ایک پرچے کے شامل ہے۔ سیاسیات اور اسلامیات میں بھی اقبال سے متعلق مواد شامل ہے۔ اقبال چونکہ افغانوں سے محبت کرتے تھے لہذا یہاں کے لوگوں نے بھی اقبال کی دوستی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال شناسی کا یہ سفر ابھی جاری ہے امید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ برسوں میں اس میں معتدبہ اضافہ ہوگا اقبال کو اردو اور اسلام سے بے حد محبت تھی۔ اس وقت صوبہ سرحد میں اقبال، اردو اور اسلام کے احیاء کے حوالے سے جتنے حالات سازگار ہیں اتنے کبھی پہلے نہیں تھے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ یہاں کے لوگ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقبال کے پیغام کو صوبہ سرحد کے گوشے گوشے میں پہنچائیں گے۔

اقبال اور فلسفہ عجم

اقبال کے پی۔ایچ ڈی مقالے
فلسفہ عجم کی تلخیص و ترجمہ

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

اقبال کے خیال میں ایرانی ذہن تفصیلات میں جانے سے گریز کرتا ہے۔ وہ اس صلاحیت سے بھی بہرہ مند نہیں جو تصورات کے کسی نظام کو ایک تسلسل کے ساتھ منظم کر سکے۔ نہ وہ بنیادی اصولوں کو زندگی کے تمام حقائق و مشاہدات کی روشنی میں دیکھنے کی تاب رکھتا ہے۔ وہ اشیاء کی داخلی وحدت کو دیکھ لیتا ہے اور صرف بنیادی عمومیت پر ہی قانع ہو جاتا ہے۔ اس کا تخیل نشے میں جھومتا تتلی کی مانند کلی کلی پر منڈلاتا ہے مگر پورے باغ کی ماہیت کو گرفت میں لانے سے قاصر رہتا ہے۔ درحقیقت اہل ایران مابعد الطبعیاتی نظام سے پوری آگہی نہیں رکھتے۔ اس لیے اسلامی تصوف کے طالب علموں کو تصوف کی جامعیت تک پہنچنے کے لیے ابن عربی سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ایران میں شاید بنی اسرائیلی اثرات کے تحت تفکر کا رشتہ زیادہ تر مذہب سے جڑا رہتا ہے یوں ایرانی مفکرین اکثر و بیشتر نئی مذہبی تحریکات کے بانیوں کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

ایران میں اسلام کی آمد کے بعد ارسطو کی نو افلاطونیت نے رواج پایا۔ جس نے عارضی طور پر ایرانی تفکر کے مذہبی رشتوں کو کمزور کیا لیکن بعد میں مذہبیت ایرانی فکر کا لازمی حصہ بن گئی۔ اس طرح ایرانی تصوف بڑی حد تک روح کو رفعتوں سے ہم کنار کرنے کی ذہنی کیفیتوں سے ہی عبارت رہا۔

قبل از اسلام کے دور میں زرتشت کے اخلاقی جوش نے اشیاء کی حقیقت کے تصور کو روحانی رنگ میں رنگا۔ اس کے باوجود اس عہد کے ایرانی تصورات کا ماحصل خیر و شر کی مادی ثنویت کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس تصور کو ان کے ہاں یزداں و اہرمن کے ناموں سے پکارا گیا۔ ایرانی فکر دنیا و موجودات کے حوالے سے ایک فلسفیانہ وحدت کو فکری ارتقاء کے اس مرحلے پر پوری طرح دیکھنے سے محروم ہے۔ زرتشت کے پیروکاروں کے

درمیان ہونے والی بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بات بے خدا تصور حیات وکائنات کی طرف تو بڑھ رہی تھی مگر قبل از اسلام کی تاریخ کے اس مرحلے پر کسی مکمل وحدت الوجودی تصورات کا سراغ لگانا مشکل ہے۔ اتنا معلوم ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں افلاطون کے نظریات کے حامل فلسفی ڈایاجینز (Diogenes) اور سیمپلیکس (Simplicus) رومن بادشاہ جسٹینین کے ظلم وتشدد کے دور سے تنگ آکر نوشیروان عادل کے دربار میں پہنچے تھے۔ لیکن یہ بات پایہ ثبوت تک نہیں پہنچ سکی کہ اس سے ایرانی فکر کس حد تک متاثر ہوئی۔

زرتشت کو اپنے سے ماقبل کی آریائی فکر سے دو تصورات ورثے میں ملے تھے۔ وہ یہ کہ فطرت ایک قانون کے تابع ہے اور یہ کہ فطرت کے اندر ایک آویزش پائی جاتی ہے۔ زرتشت کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ شر کے وجود کو کس طرح خدا کے دائمی خیر کے تصور سے ہم آہنگ کرے۔ اس سے قبل کے فلاسفہ خیر کی کئی قوتوں کی پرستش کرتے تھے جنہیں اس نے ایک وحدت میں ڈھال کر اسے اہورامزدا کا نام دیا۔ اسی طرح شر کی قوتیں مجتمع ہو کر اہرمن کہلائیں۔ وہ ان دونوں کو ایک ہی سکے کے دورخ قرار دیتا ہے درحقیقت وہ مذہبی اعتبار سے وحدت الوجود اور فلسفیانہ اعتبار سے ثنویت پسند (Dualist) تھا۔ لیکن ایک وجود میں دو قوتوں کے اجتماع سے مراد یہ ہے کہ خدا خود اپنے ہی خلاف نبرد آزما ہے۔ زرتشت کے حامیوں میں ایک طبقہ یعنی زندقہ دونوں کے تصادم کا اور ماگیان (Magi) فرقہ دونوں کی وحدت کا قائل تھا۔

مانی جسے عیسائی بے خدا تصور کا خالق قرار دیتے ہیں زرتشت کے بعض تصورات سے متفق ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دنیا بنیادی طور پر شر کی آماجگاہ ہے۔ الحاد کے اس پرچارک کا خیال ہے۔ تمام اشیاء نور اور اندھیرے دو اصولوں کے تحت وجود پاتی ہیں۔ نور پانچ تصورات سے وابستہ ہے۔ یعنی محبت، علم، عقیدہ، ایمان، فراست جبکہ اس کی مخالف پانچ قوتیں اندھیرے کی ترجمانی کرتی ہیں۔ یہ محبت، اندھیرا، زہر، آگ اور دھند سے عبارت ہیں۔ یہ قوتیں متنوع امتزاج پا کر حیات وکائنات کی تشکیل کرتی ہیں تمام اشیاء آخر میں جنت کے بادشاہ کے دائمی مقام کی طرف لوٹتی ہیں مانی پہلا مفکر ہے جس نے کائنات کی تخلیق میں شیطان کے تصور کو تسلیم کیا۔ بعد میں شوپن ہار بھی اسی نظریے کا حامل ہوا۔

قدیم فارس کے فلسفیوں میں زرتشت اور مانی کے ساتھ مزدک کا نام بھی لیا جاتا ہے اسے ایران قدیم کے ایک قابل ذکر سوشلسٹ مفکر کا درجہ حاصل ہے۔ مانی کی طرح وہ بھی سمجھتا تھا کہ کائنات اشیاء کی کثرت روشنی اور تاریکی کے دو دائمی و خود مختار اصولوں کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا تصور خدا رحمت، علم، یادداشت اور امتیاز کی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ تمام انسان مساوی ہیں اور انفرادی ملکیت کا تصور شیطانی قوتوں کی پیداوار ہے جو خدا کی کائنات کو مصائب

میں گرفتار کرنا چاہتی ہوں۔

بہرکیف آمد اسلام نے پرانے تصورات کو منہدم کر دیا اور نا قابل تغیر وحدت الوجود تصورات کو جنم دینے کے ساتھ خدا اور شیطان کی ایرانی ثنویت کے مقابل خدا اور مادے کی یونانی ثنویت کے تصور کو متعارف کروایا۔ لیکن عرب فتوحات نے ایران میں موجود روایتی زرتشتی اثرات کو بالکل ختم نہیں کیا۔ ایرانی فکر نے رفتہ رفتہ اسلام کو بھی اپنے آریائی مزاج میں ڈھال لیا۔ ایرانی ذہن جس نے یونانی فکر کے اثرات کے تحت ٹھوس معروضیت سے رابطہ توڑ لیا تھا دوبارہ ایسی عرضیت سے اپنے آپ کو مربوط کرا لیا جو منطق، تشکیک، تصور اور ابہام پر محیط تھی اور صداقت کے خارجی معیار کو مسترد کرتی تھی۔

آٹھویں صدی کے وسط میں حسن بصری کے ایرانی مقلد واصل بن عطا معتزلہ فکر کو آشکارا کرتے نظر آتے ہیں۔ معتزلہ (Rationalist) تحریک نے کافی عرصے تک ایرانی ذہن کو اپنی گرفت میں لئے رکھا۔ ان کے نزدیک خدا کی ذات کا تصور ایک کامل وحدت ہے جو کسی قسم کی کثرت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کائنات و موجودات کے بغیر موجود ہوسکتا ہے۔ خدا ذرات کو منظر عام پر لاسکتا ہے مگر کیسے یہ نہیں بتایا جاتا۔ اگر ذرات (Atom) موجود ہیں تو پھر ان کا خالق کون ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ معتزلہ فلسفیانہ طور پر مادہ پرست اور مذہبی حوالے سے خدا پرست ہیں۔

معتزلہ کا ردعمل العشری ۸۷۳ء کی زبردست تحریک کے ذریعے ہوا۔ العشری نے معتزلہ فکر کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد انہی کے ہتھیاروں سے اس کے خاتمے کی کوشش کی۔ اس نے اسلام کو ان تمام غیر اسلامی عناصر سے پاک کرنے کی سعی کی جو رفتہ رفتہ اس میں داخل ہوگئے تھے۔ بلکہ اس کے ساتھ اس نے دینی شعور کو اسلامی فکر سے ہم آہنگ بھی کیا۔ معتزلہ نے انسانی فطرت کے حقائق کو فراموش کر دیا تھا اور اسلامی عقائد کی سالمیت کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا۔

العشری کے نزدیک خدا مکمل اور لازمی آخری حقیقت ہے جس کے وجود کے اندر اس کے تمام اوصاف پائے جاتے ہیں جس کا وجود اور جوہر ایک ہی چیز ہے۔ معتزلہ نے خدا کے وجود کی حقیقت کو منہدم کر دیا تھا اور تقدیس خداوندی کو نا قابل وضاحت عمومیت بنا دیا تھا اس کے مقابل معتزلہ مخالف فکر نے فطرت کی خارجی حقیقت کو ہی ختم کر دیا تھا۔ یعنی اگر معتزلہ نے فطرت کو محفوظ کرتے ہوئے مذہب کے خدا کو قربان کر دیا تو العشریوں نے خدا کو بچاتے ہوئے فطرت کو ہی ختم کر دیا۔ معتزلہ کی ایک ترجمانی تشکک پسند امام غزالی کے ذریعے بھی ہوئی جس نے حکمت دانش کی خشکی و بے رنگی کو محسوس کرتے ہوئے انسانی جذبات کو ایک عافیت گاہ کے طور پر پیش کیا۔ غزالی کی تشکیک کا بنیادی مقصد اسلامی عقائد کا دفاع نہ تھا بلکہ علم کی کوئی رفیع تر بنیاد کو تلاش کر کے اسے استحکام بخشنا تھا۔ غزالی نے قرآن سے ہم آہنگ روشنی اور نور کے تصور کو متعارف

کروایا جس سے الاشراق نے مزید آگے بڑھایا۔

معتزلہ کے خلاف اف الاشراقیوں کی کھلی جنگ نے یونانی فلسفے کی تنقید کا راستہ کھولا جسکے اندر سے ایرانی اثاتیت (Positivism) کا رجحان برآمد ہو۔ معتزلہ کے مخالفین کا خیال ہے کہ وجود کے اندر ہی جو ہر موجود ہے۔ اس کا الگ سے کوئی وجود نہیں ہے۔ رازی کا کہنا ہے کہ وجود کا تصور خودی ہے۔ ابن مبارک کا کہنا ہے کہ جو ہر وجود سے ما قبل ہوئے بغیر وجود کی علت ہے۔ ارسطو کا بھی خیال ہے کہ اشیاء کے جو ہر کی کوئی علت نہیں ہوتی۔ یہ ممکن ہے کہ ایسی چیز کا تصور کر لیا جائے جو حقیقت میں وجود نہیں رکھتی مگر اس کے ساتھ اوصاف کو منسلک کر دیا جائے۔ لیکن جب ہم کسی چیز کے ساتھ اوصاف (Attributes) جوڑ دیتے ہیں تو پھر اس کا وجود ضروری ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف جو چیز وجود ہی نہ رکھتی ہو اس کا ذہنی یا تصوراتی طور پر کس طرح ادراک کیا جا سکتا ہے۔

ایرانی تصوف:۔

وان کریمر کا خیال ہے کہ ایرانی تصوف کا ماخذ ہندوستانی ویدانیت ہے جبکہ نکلسن اور مرکس (Merx) اسے نوافلاطونیت کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر براؤن اسے غیر جذباتی بنی اسرائیلی مذہب کے خلاف ردعمل بتاتا ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں بنوامیہ کا خاتمہ ہوا اور بنوعباس برسر اقتدار آئے اس عہد میں طبقہ زندقہ کے خلاف کاروائی ہوئی اور ایرانی ملحدین سند باد اور استادان جنہیں خراسان کے نقاب پوش پیغمبر بھی کہا جاتا ہے کی بغاوت بھی دیکھنے میں آئی۔ مامون الرشید کے ابتدائی دور ۸۱۵ء اور سامانوی ۸۷۴ء کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ نابینا ایرانی مفکر بشر بن برد نے آتش پرستی کو فروغ دیا اور تمام غیر ایرانی تصورات کو ناپسندیدہ قرار دیا۔

ایرانی تصوف کا بنیادی عنصر بہر کیف محبت اور سلوک ہے اس میں بنی اسرائیلی اور آریائی تصورات کے ساتھ بدھ مت کا تصور نجات Nirvana کا امتزاج شامل ہو کر قرآن اور اسلام سے ہم آہنگ ہوتا نظر آتا ہے۔ با ایں ہمہ اس کا بنیادی ڈھانچہ بنی اسرائیلی سے زیادہ آریائی ہی رہتا ہے۔ جو تمام مزاحمتیں گزارا آیا ہے کیونکہ یہ بنیادی طور پر انسانی فطرت کو اس کی پوری کلیت کے ساتھ اپیل کرتا ہے یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ قرآن و احادیث کے خاص قسم کے متصوفانہ تصورات عرب مزاج کی عملیت پسندی کی وجہ سے عرب دنیا میں پوری طرح پروان نہیں چڑھ سکے اور ایران میں آ کر انہیں مخصوص ارتقائی فضا میسر آئی۔ اسلام کی رو سے حقیقت ازلی و ابدی نور اور روشنی ہے (خدا زمین اور آسمانوں کی روشنی ہے اس لیے تصوف روحانی تربیت کی چار منازل بیان کرتا ہے جس کے توسط سے روشنی یا نور کا وصال میسر آ سکتا ہے۔ درج ذیل ہیں۔

۱۔ ایمان بالغیب ۲۔ تلاش غیب

۳۔ علم الغیب ۴۔ تحقیق وحصول وصال غیب

یہ بھی یادر ہے کہ بعض صوفی فرقوں ونقشبندیہ حصول ووصال غیب کے کچھ دوسرے یعنی ویدانتی ذرائع کو بھی کام میں لائے ہیں ان کے خیال میں مراقبے کے ذریعے چھ متنوع روشنیوں سے گزر کر اصلی وحقیقی روشنی تک رسائی ممکن ہے۔ یہ تراکیب بہر کیف غیر اسلامی ہیں اور بڑے صوفیاء ان کو اہمیت نہیں دیتے۔ صوفیاء ازلی حقیقت وصداقت کو تین اطراف سے دیکھتے ہیں۔

۱۔ شعور وارادہ ۲۔ حسن وجمال ۳۔ فکر، نور، علم

پہلا گروہ شقیق بلخی اور ابراہم ادھم جیسے صوفیاء پر مشتمل ہے جو کائنات کو ارادے کی محدود سرگرمی سمجھتا ہے۔ یہ گروہ احدیت (Monotheism) کا قائل ہے اور بنیادی طور پر بنی اسرائیلی ہے۔ نویں صدی عیسوی میں معروف کرخی آتے ہیں جو بوعلی سینا کی طرح حقیقت ازلی کو ایک دائمی جمال کی صورت میں دیکھتے ہیں ایک پر جمال ہستی کائنات میں اپنی صورت میں جلوہ گری دیکھنا چاہتی ہے اس تخلیق کائنات کا مقصد اولیٰ اظہار جمال اور محبت وعشق ہے۔ ایرانی ذہن کے زرتشتی عناصر اس خوبصورتی کو آگ کی صورت میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ آگ جو خدا کے سوا سب اشیاء کو جلا ڈالتی ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما

اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما

اے تو افلاطون و جالینوس ما

(رومی)

اس سے وہ غیر ذاتی انجذاب کا تصور ابھرا جو بایزید بسطامی سے ہوتا ہوا منصور حلاج تک پہنچتا ہے جو ہندوستان کی ویدانی رو میں ''ان الحق'' کا نعرہ لگا اٹھتا ہے۔ (اہم براہما سامی) اس طرز فکر میں مولانا روم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کا ردعمل تیرھویں صدی میں واحد محمود کے تکثیری تصور (Pluralistic) کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس نے ہم عصر احدیت کے تصور کی صداقت سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ حقیقت واحد نہیں کثرت کی حامل ہے۔ اس نے ایک فرقے کی تشکیل بھی کی مگر جلد ہی شاہ عباس کے ہاتھوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ حافظ شیرازی بھی اس فرقے کے بعض تصورات کا قائل تھا۔ تیسرا اہم دبستان فکر حقیقت ازلی کو روشنی یا فکر سے مربوط سمجھتا تھا۔ اس کے دو

عناصر میں ایک ایرانی اور دوسری عیسائی، یونانی جدلیت اور اسلامی تصورات سے مل کر غزالی کی تشکیک کا روپ دھارا۔ ابن تیمیہ بھی یونانی منطق کی کمزوریوں کو ظاہر کرتے رہے جسے الاشعری اور اسلامی نظریات (Dogmas) کے مدافعین نے بالآخر منہدم کیا۔

الاشراقی:۔

الاشراقی نے ایک نیا نظام فکر تراشا، اس کا اصل شہاب الدین سہروردی تھا جو شیخ اشراق مقتل کے نام سے بھی مشہور تھا۔ وہ ایک حقیقی ایرانی ذہن تھا اس کے توسط سے قدیم ایرانی روایات جن کا اظہار کی حد تک رازی، غزالی اور اسماعیلہ فرقے کی تحریروں میں ہوا تھا اسلامی عقائد سے مربوط ہو کر تکمیل کی راہ پاتی ہیں۔ اس کی آزاد سوچ نے سلطان صلاح الدین کو اس کے خلاف کر دیا تھا جسکی وجہ سے وہ ۳۶ برس کی عمر میں قتل کر دیا گیا۔ اشراقی کے فکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) علت و معلول (Ontology) (۲) کونیات (Cosmology) (۳) نفسیات (Psychology)

1۔ علت و معلول:۔

تمام کائنات کا وجود ازلی روشنی (نور قاہر) کا مرہون منت ہے جو تمام اشیاء کو منور کرتی ہے روشنی سے زیادہ نظر آنے والی کوئی چیز نہیں ہے اس کے اظہار کے لیے کسی اور واسطے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ماگیان (زرتشتی) کی طرح یہ سوچنا کہ نور اور تاریکی دو الگ حقیقتیں ہیں درست نہیں۔ نور کی موجودگی یا حقیقت کا مطلب ہے اندھیرے کی موجودگی جسے وہ ختم کرتا ہے یعنی ایک ہوگا تو دوسرا نہیں ہوگا۔ نور کی بھی دو قسمیں ہیں۔ مجرد اور ثانوی۔ یعنی اصلی اور کسی دوسرے وجود کے سہارے پیدا ہونے والی روشنی شیخ اشراق کا العشر یوں کی طرح خیال ہے کہ خدا سے قبل یا اس سے الگ و آزاد کوئی ذراتی دنیا۔ (Prima Materia atoms) موجود نہیں ہے جیسا کہ ارسطو کا خیال تھا۔ اگرچہ وہ نور و تاریکی کی دوئی کو مانتا تھا۔ انسانی روح جو بجائے خود ایک محدود روشنی کی حامل ہوتی ہے علم کے ذریعے اشیاء کو منور کر سکتی ہے اس خیال کے حوالے سے شیخ اشراق جدید انسان دوستی کے تصورات کے کافی قریب تھا۔

۲۔ کونیات:۔

جو اشیاء نور نہیں ہیں یعنی مادہ وغیرہ ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا

۱۔ وہ جو کچھ مکان سے باہر ہے (العشر یہ اسے جوہر کہتے ہیں)

۲۔ وہ جو کچھ مکان کے اندر (وزن، حجم، خوشبو، ذائقہ وغیرہ)

ایک مادی وجود اندھیرے کی ایک شکل ہے جسے مجرد روشنی منور کرتی ہے۔ مجردکمیت اور مادہ ایک ہی چیز ہیں لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تمام شکلیں اور اشیاء مادے کے اندر جوہر کی صورت میں موجود ہیں تو پھر تمام موجودات ہم شکل ہوں گی۔ مادی وجود کا تیسرا عنصر یعنی جوہر روشنی کے مقابل اندھیرے کا وجود ہے جو کچھ نور نہیں ہے اسے مزید دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ دائمی (ذہن، روح، آسمانی اشیاء، وقت، حرکت وغیرہ)

ب۔ عارضی (مختلف اشیاء کی امتزاجی کیفیتیں)

ماضی حال اور مستقبل کی تقسیم ہم نے اپنی آسانی کے لیے کر رکھی ہے۔ تین عناصر بنیادی ہیں یعنی پانی، مٹی اور ہوا۔ اشراقیوں کے مطابق آگ صرف جلنے والی ہوا کا دوسرا نام ہے ان عناصر کا امتزاج مختلف صورتوں کو جنم دیتا ہے جیسے ٹھوس مائع اور گیس وغیرہ۔ دراصل کائنات یک سوز دروں کا نام ہے ایک مجسم خواہش جو نور کی تلاش میں پھر رہی ہے۔

۳۔ نفسیات:۔

روشنی اور حرکت کی نچلی سطح کی اشیاء جیسے پتھر وغیرہ میں اپنا اظہار نہیں کرتیں مجردنور انسان اور خاص طور پر اس کی روح میں ظاہر ہوتا ہے۔ مرد اور مادی وجود کا رشتہ جڑتا ہے تو وہ محبت کی سریش (Bond) سے ہے۔ روح انسانی روشنی اور جسم کے مابین درمیانی واسطہ ہے روح صرف دل یا قلب کا نام نہیں بلکہ یہ سارے وجود میں متحرک رہنے والی چیز ہے۔ جس طرح رات کو جانور روشنی اور مچھلی چاند کی طرف بھاگتے ہیں اسی طرح انسان اپنی روح کے ذریعے بلندیوں کی طرف اٹھنا اور روشنی سے ہم کنار ہونا چاہتا ہے۔ یہ روشنی انسانی روح میں دس ذرائع سے ورود حاصل کرتی ہے۔ پانچ خارجی اور پانچ داخلی مثلاً حسیات، تصورات، تخیلات، عقلیات اور یادداشت وغیرہ لیکن یہ سب روح کے بندھن سے بندھی ہوئی چیزیں ہیں۔

انسان کے اندر مندرجہ ذیل قوتیں تحریک پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں

۱۔ عقل و دانش (ربانی) تمام علم و حکمت کا منبع (Angelic)

۲۔ بہیمانہ جذبات (بہیمی) خواہش، غصے اور جرات کا منبع (Beastly)

۳۔ حیوانی جذبات (حیوانی بھوک اور جنس کا منبع) (Animal)

ان سب کے متوازن امتزاج سے انصاف وعدل کی قدر وجود میں آتی ہے۔ دانش اور خیر کے ملاپ سے روح کو یہ قدرت حاصل ہوتی ہے کہ وہ تاریکیوں سے اپنے آپ کو آزاد کروا لے۔ روحانی ارتقاء کی مندرجہ ذیل لامحدود منازل ہوتی ہیں۔

۱۔ میں کی منزل .... اثبات انا

۲۔ تم نہیں ہو کی منزل .... نفی دنیا

۳۔ میں بھی نہیں ہوں .... نفی ذات

۴۔ تم ہو میں نہیں ہوں .... اللہ۔ الا اللہ

۵۔ میں نہیں ہوں۔ تم بھی نہیں ہو .... لا کی منزل

ہر منزل کی اپنی تجلیات ہیں جس کے ساتھ کچھ ماورائی اصوات (Sounds) وابستہ ہوتے ہیں شیخ اشراقی کا خیال ہے کہ بعض ارواح کائنات کو واپس لوٹتی ہیں تاکہ وہ اپنی کمزوریاں دور کر سکیں۔ وہ پہلا ایرانی فلسفی ہے جو ایرانی تصورات میں صداقت کے تمام زاویوں پر نگاہ رکھتا ہے اور بڑی مہارت کے ساتھ ان سب کو اپنے سسٹم سے مربوط کرتا ہے۔ وہ ان معنوں میں وحدت الوجودی ہے کہ وہ خدا کو تمام حسیاتی وتصوراتی موجودات کا منبع وکل قرار دیتا ہے۔ وہ روایتی نوافلاطونیت کو ایک مکمل ایرانی فکری نظام میں ڈھال لیتا ہے جو بڑی حد تک افلاطون کے تصورات کے قریب ہو جاتا ہے بلکہ قدیم ایرانی ثنویت کو بھی ایک روحانی درجے پر پہنچا دیتا ہے۔

الجیلی (۷۶۷۔۸۱۱):۔

اس کی دو تصنیفات اہم ہیں ایک انسان اور دوسری ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی شرح۔ اس کا کہنا ہے کہ وجود حقیقی جب لامتناسب کو چھوڑتا ہے تو تین منازل سے گزرتا ہے۔ ۱) احدیت (Oneness) ۲) غیریت (He-ness) اور خودی (I-ness) دراصل خودی غیریت کی خارجی شکل ہے۔ تیسری سطح اللہ کے اسم کی ہے یہاں نور تاریکیوں پر غالب آجاتا ہے فطرت اپنے اصلی روپ میں آجاتی ہے اور ذات حقیقی شعور سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اسم خداوند ایک آئینہ بن جاتا ہے جس کے اندر خدا کا وجود منعکس ہو جاتا ہے۔ اس کے متوازی تین سطحوں پہ انسان اسم اور فطرت کے بارے میں تفکر و مراقبہ (Meditation) کرتا ہے۔ فطرت اسماء کی خصوصیات میں داخل ہو جاتی ہے اور وہاں سے جوہر کی حدود

میں پہنچ جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے اسم فطرت اور اوصاف Attribute کے ساتھ مل کو جوہر سے ہوتا ہوا اور انسانِ کامل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے پھر اس کی آنکھیں اللہ کی آنکھیں اور اس کے الفاظ اللہ کے الفاظ بن جاتے ہیں۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

الجیلی کا خیال ہے کہ مادی دنیا حقیقت رکھتی ہے یہ حقیقت ازلی کا خارجی چھلکا یا خول ہے اس طرح یہ کم حقیقت (Unreal) نہیں ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ خیال سے ہی دنیا کی تشکیل و تخلیق ہوتی ہے اور یہی تصور / Idea) (Notion فطرت کا مادی ڈھانچہ ہے۔ حقیقی دنیا نور ازلی کی معروضی صورت ہے یعنی نور اعلیٰ کی دوسری سمت Other-self ہے۔ فطرت خدا کا وہ تصور (Idea) ہے جو آنکھوں کو نظر آتا ہے۔ ذات باری (Divinity) ایک احدیت ہے لیکن اس کے اسماء اور اوصاف ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں جیسے کہ بخشش اور انتقام ایک ہی سکے کے دورخ ہیں۔ الجیلی کہتا ہے کہ فطرت منجمد پانی ہے اور خدا خود پانی ہے فطرت اصلی نام اللہ، برف وغیرہ مستعار نام ہیں۔ مادی حقیقت اور وجود خدا کی دوسری سمت ہے جس میں وہ اپنا عکس دیکھتا ہے۔

تمام اشیاء سے قبل کیا موجود تھا؟

پیغمبر اسلام ﷺ سے پوچھا گیا کہ تخلیق کائنات سے پہلے مقام خداوندی کیا تھا۔ انہوں نے جواب دیا یعنی اندھیرا اور کائناتی لاشعور۔ یہ ازلی تاریکی/ خلا/Primal darkness خدا کے اوصاف Attributes سے ماورئی اور بے نیاز ہیں اسے ان کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ مطلق احدیث سے بھی جدا ہے کیونکہ مؤخر الذکر کا اطلاق ذات مطلق پر اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے وجود کا اظہار کرنے لگتی ہے۔ خدا اول اور تخلیق بعد کے تصورات پر وقت کا تصور لاگو ہوتا ہے جو انسانی ذہن کی گرفت سے باہر ہے مادی اور اوصاف کی کوئی حقیقت اس پر لاگو نہیں ہوسکتی۔ انسان جب تکمیل کی طرف بڑھتا ہے تو تین منازل سے گزرتا ہے۔

۱۔ اسمائے خداوندی کا تفکر (Meditation) اسے مرحلہ تنویر Illumination بھی کہا جاتا ہے۔ جب خدا اپنے اسماء کے نور سے کسی شخص کو منور کرتا ہے تو وہ اس نور کے شعلوں میں بھسم ہو جاتا ہے۔ (انا الحق)

۲۔ دوسری سطح وہ ہے جہاں روحانی تربیت کے دوران اپنے وجود اور ظرف کے مطابق اپنی اوصاف کو منور کرتا ہے یعنی خدائی اوصاف کا حامل ہو جاتا ہے مثلاً پانی اور ہوا پر چل سکتا ہے اور جوہر کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسی

تکمیل کی منزل پالیتا ہے جس میں آدمیت اور خدائی کا ملاپ ہو جاتا ہے اور ایک ربانی انسان (God-man) عالم وجود میں آجاتا ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہوتا ہے یہ بیان نہیں ہوا ہے تاہم قلب کو اس کام میں استعمال کیا جا سکتا ہے جو الجیلی کے خیال میں ایک ایسی آنکھ ہے جس کے ذریعے اسماء اور اوصاف اور ذات خداوندی کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

ایسے مابعد الاطبعیاتی لمحے جن میں جذب و کیف کی یہ لذتیں میسر ہوں عارضی ہوتے ہیں اور دھوپ چھاؤں کی طرح آمد و رفت جاری رکھتے ہیں ان کے گزر جانے کے بعد بندہ بندہ اور خدا خدا ہوتا ہے۔ الجیلی کا خیال ہے کہ انسان کامل ہی کائنات کے وجود کو قائم رکھنے والا ہے اس لیے اس کا ظہور وورود فطرت اور کائنات کے تسلسل کے لیے لازمی ہے۔ وہ اس باب میں ایک قسم کی تنگڑم یا تثلیت کا بھی قائل نظر آتا ہے جسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

اگر تم کہتے ہو کہ خدا واحد ہے تو تم ٹھیک کہتے ہو۔

لیکن اگر تم کہتے ہو کہ وہ دو ہیں تو تب بھی تم درست ہو۔

پھر تم کہو کہ نہیں وہ تین ہیں۔ تب بھی تم غلط نہیں ہو۔

کیونکہ یہی انسان کی اصل فطرت ہے۔ (انسان کامل جلد اول صفحہ نمبر ۸)

انسان کامل ایک واسطہ ہے وہ نور ازلی سے تنویر میں حاصل کرتا ہے۔ اوصاف کو اپنے اندر جذب کرتا ہے پھر یہ اوصاف اس کے اندر ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ حیات، وجود
۲۔ علم و دانش (علم حیات و کائنات)
۲۔ ارادہ (ظہور ذات باری تعالیٰ)
۴۔ قوت (تخلیق، سمت، جہت)
۵۔ دنیا (فطرت الفاظ خداوندی کا مادی لبادہ ہے)
۶۔ حسن و جمال
۷۔ تکمیل و اکملیت

ملا صدرا اور ملا ہادی:۔

تاتاری یلغاریں ایرانی فکر کے لیے ایک بڑا دھچکا ثابت ہوئیں۔ قدیم فکر اور دبستانوں کے بہت سے فلاسفہ مثلاً (نوارسطائی) دستور اصفہانی، ہربود اور کامران وغیرہ ہجرت کر کے دور اکبری میں ہندوستان جا پہنچے۔ جو ایک نئے مسلک کی تشکیل کے سلسلے مین زرتشتی فکر سے استفادہ کر رہا تھا اسکے بعد سترھویں صدی عیسوی تک کوئی بڑا ایرانی مفکر ظاہر نہیں ہوا تا آنکہ شیراز میں ملا صدرا سامنے نہ آگئے۔

ملا صدرا کا کہنا ہے کہ حقیقت ہی اصلی ہے اور سچا علم موضوع اور معروض کی شناخت میں پایا جاتا ہے بعض لوگوں کے نزدیک اس کا فلسفہ در حقیقت بوعلی سینا کے علم وفکر کی بازگشت ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کا نظریہ عرض ومعروض ایرانی فلسفے کے احدیث Monism کی طرف بڑھا ہوا آخری قدم ہے اس کی فکر کو بابی ازم کی مابعد الطبعیات کی بنیاد بھی قرار دیا جاتا ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں ایرانی فکر کی افلاطونیت کی طرف سفر کو ملا ہادی سبزواری کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے ملا ہادی کو جدید ایرانی فلسفے کا ایک بڑا نام تصور کیا جاتا ہے اس کی تعلیمات کے تین بڑے عناصر ہیں۔

۱۔ حقیقت اولیٰ کا تصور (Idea) جو نور بھی ہے

۲۔ تصور ارتقاء (زرتشتی تصورات میں کسی حد تک موجود)

۳۔ اصل حقیقت اور غیر اصل حقیقت کے مابین واسطے (Medium) کا تصور یہ بات دلچسپ ہے کہ ایرانی ذہن نے نوفلاطونیت کے تصور صدور (Emanation) سے چھٹکارا پا کر اصلی افلاطونی ذہن تک رسائی حاصل کی جبکہ سپین کے عرب اسی راستے چل کر ارسطو تک پہنچے۔ یہ نکتہ بڑے واضح طور پر ملا ہادی کی فکر سے ظاہر ہوتا ہے جو صدور کو نہیں مانتا اور افلاطون کے تصور حقیقت مطلق تک جا پہنچتا ہے۔ یہ بھی طے ہے کہ مسلم دنیا اور ایران میں فلسفیانہ تفکر اکثر جا کر مذہب پہ ہی ختم ہوتا ہے۔

ملا ہادی کا خیال ہے کہ ادراک کے دو پہلو ہیں۔

۱۔ نظری (فلسفہ وریاضی)　　۲۔ عملی (اقتصادیات وسیاسیات)

اس تحلیل سے تین اصول برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ حقیقت مطلق (نور)　　۲۔ سایہ　　۳۔ غیر حقیقت (اندھیرا)

حقیقت تو مطلق ہے۔ سایہ روشنی پر منحصر (Contingent) ہے اور تاریکی دوسری سمت Other۔ دنیائی تمام اشیاء ارفع ترین صورتوں کی طرف سفر کرتی ہیں۔ یہ نور کو اپنے اندر جذب کرنے سے ممکن ہوسکتا ہے ملا کا یہ بھی خیال ہے کثرت Multiplicity بھی حقیقت ہے اور یہ سائے (Shadow) کی مختلف صورتیں جو حقیقت (نور) مطلق کے مختلف اسماء اور اوصاف ہیں۔

بابی یا بہائی مذہب:۔

جدید ایران کی بابی (بہائی) تحریک میں ایرانی مفکر کے مختلف دھارے آ کر مجتمع ہوتے ہیں۔ اس تحریک کا آغاز تو

ہاں نور کی قوت مجہول اور تاریکی کی قوت جارح ہے۔ان کے نظام فکر میں دو کمزور نکات ہیں۔

۱۔ خالص و برہنہ ثنویت ۲۔ تحلیل (Analysis) کی کمی

پہلی کئی اسلام نے پورا کر دیا جبکہ دوسری یعنی تحلیل کی کمی کو یونانی فکر نے اس طرح پورا کیا کہ خوابیدہ معروضیت کو پھر سے جگا دیا۔ جو بالآخر بعض صوفی مسلکوں کے ہاں اپنی انتہائی صورت یعنی وحدت الوجود تک جا پہنچی۔ فارابی نے خدا اور مادے کے درمیان کی ثنویت کے مسئلے کو اس طرح حل کیا کہ اس نے مادے کو روح کا ایک منتشر (Confused) احساس (Perception) قرار دے دیا جبکہ العشر ی فکر نے مادے کے وجود سے ہی انکار کر دیا اور صرف ایک مکمل عینیت کو حقیقت اولیٰ تسلیم کیا۔ ارسطو کے مقلدین اپنے استاد کے اس تصور کہ اصلی اور کل حقیقت (Prima- Materia) ہے پر قائم رہے جبکہ مسلمان صوفیا نے مادے کو محض نظر کا فریب (Illusion) یا خدا کے عرفان ذات کا لازمی دوسرا اجزو Other مانا۔ باایں ہمہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عشری عینیت کے ذریعے ایرانی مفکر غیر ایرانی ثنویت کے جال سے نکل کر نور اور تاریکی کی قدیم پارسی ثنویت کے تصور تک جا پہنچی۔

شیخ الشراق اپنے قریبی معاصرین کے معروضی نکتہ ہائے نظر کو یکجا کر کے زرتشتی ثنویت کو زیادہ فلسفیانہ اور روحانی انداز میں پیش کرتا ہے اس کا نظام فکر عرضی اور معروضی دونوں حقیقتوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے بعد احدیث (Monistic) پر مبنی سارے نظاموں کو سامنا واحد محمود کی تکثیریت کے تصور سے ہوتا ہے جس نے اعلان کیا کہ حقیقت اولیٰ واحد نہیں بلکہ لاتعداد ہیں جو درحقیقت بنیادی ازلی زندہ اجزاء (Units) ہیں جو مختلف و متنوع انداز میں یکجا ہو کر رفتہ رفتہ بلندیوں کی تکمیل کی طرف بڑھتے ہیں۔ واحد محمود کا یہ تصور ہر حال ایک عارضی درمیانی کڑی سے زیادہ وقعت نہ پا سکا بعد کے ایرانی صوفی فلاسفروں نے صدوری نو افلاطونیت کو سرے سے مسترد کر دیا اسے تبدیل کر دیا اور اس کے بعد ان میں نو افلاطونیت سے اصل افلاطونیت کی طرف قدم بڑھنے شروع ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد تصوراتی اور خواب و خیال پر مبنی ایرانی مابعد الاطبعیات کا تصادم انیسویں صدی کی بابی فکر اور تحریک سے ہوا۔ جو پہلے سے موجود ایرانی فکر کے وراثتی سرمائے کا اس طرح امتزاج کرتی ہے کہ اشیاء کی حقیقتوں کو ایک فرد Medium میں متجر Concretise کر دیتی ہے یہ تصور کافی حد تک آفاقی اور غیر ایرانی لگتا ہے مگر اس کا ایرانی فکر پر گہرا اثر ہوا اس نے ایرانی فکر میں غیر اسلامی عناصر کو شامل کر دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

علامہ اقبال کی ابتدائی فارسی شاعری

پروفیسر ڈاکٹر صابر آفاقی
ایم۔اے
پی۔ایچ ڈی۔تہران

علامہ اقبالؒ فارسی اور اُردو کے مسلم شاعر تھے۔ فارسی میں اُن کے سات اور اُردو میں تین شعری مجموعے ہیں۔ ارمغانِ حجاز میں کچھ فارسی اور کچھ اُردو کلام جمع کر دیا گیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اُردو کے بھی قادرالکلام شاعر تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے شہرہ آفاق شاعر بنانے والا یہی فارسی کلام ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے فارسی میں شاعری کیوں شروع کی، بظاہر اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ اقبال پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور بقیہ زندگی لاہور میں گزاری یہ دونوں شہر پنجابی زبان وثقافت کے مرکز ہیں۔ مضمون انہوں نے عربی کا پڑھا تھا۔ فارسی زبان آپ نے مضمون کے طور پر سکول اور کالج میں ہرگز نہیں پڑھی۔ لیکن جب ہم علامہ کے آبائی وطن کشمیر میں فارسی زبان وادب اور شعر وشاعری کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ علامہ نے فارسی کو ذریعہ اظہار کیوں بنایا۔

محمود غزنوی (وفات۔۴۲۱ھ) نے تین مرتبہ کشمیر پر حملہ کیا تھا لیکن وہ اس سرزمین پر کوئی پائیدار انسانی اثر نہ چھوڑ سکا۔ وادیٔ کشمیر میں دین اسلام اور فارسی زبان ۷۲۵ھ میں ایک ترکستانی مبلغ وصوفی سیّد شرف الدین بلبل شاہ (وفات ۷۲۷ھ) کے ذریعے پہنچی۔ آپ جن احباب کے ہمراہ کشمیر گئے وہ فارسی بولتے تھے اور بعض ان میں فارسی کے شاعر تھے۔

اس واقعہ کے کوئی اٹھہتر ۷۸ سال بعد سیّد علی ہمدانی (وفات۔۷۸۶ھ) تقریباً سات سو ایرانی صوفیائ علماء اور اہل حرفہ کے ہمراہ ۷۷۴ میں وادیٔ کشمیر میں داخل ہوئے سیّد صاحب کے سوا باقی مہاجرین یہیں بس گئے۔ آپ تین مرتبہ کشمیر وادی میں تشریف لے گئے اور ہر بار مختصر مدت کے لیے قیام فرماتے رہے، ان ایرانیوں کی آمد سے سنسکرت کی جگہ فارسی سرکاری زبان ہوگئی اور کشمیر کو ایرانِ صغیر کہا جائے گا۔

شاہمیری سلاطین کے عہد میں فارسی شعروادب کو اور فروغ حاصل ہوا اس دور میں مسلمانوں کے علاوہ کشمیری پنڈت بھی فارسی سیکھ کر حکومت کے مناصبِ جلیلہ پر فائز رہے ان میں سے اکثر سرکاری و نیم سرکاری دفاتر میں منشی مقرر ہوئے اور کارکن کہلائے ، ان میں سینکڑوں فارسی کے مشہور شاعر ہو گزرے ہیں۔

چک اور مغل عہد حکومت میں فارسی کے کشمیری شعراء کی شہرت ایران اور ایشیائے کوچک تک پہنچ گئی ، صائب کلیم ، سلیم طہرانی ، عرفی ، ملا ، طغرا مشہدی جیسے عظیم ایرانی شعراء کشمیر پہنچے۔ خود کشمیر نے سینکڑوں علماء اور شعراء اسی دور میں پیدا کیے جن کی عالمانہ تصانیف اور فارسی کلام کا شہرہ دُور دور تک پہنچا۔ یہ وہ مذہبی علمی اور ادبی ماحول تھا جب فرزند کشمیری علامہ اقبال کے پردادا شیخ جمال دین کشمیر سے ترک وطن کر کے سیالکوٹ پہنچے۔ اس لیے نئے ماحول میں علامہ کے بزرگوں نے اپنی قدیم مذہبی اور لسانی روایات کو محفوظ رکھا اور ان کو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کرتے رہے قدیم ایام سے ہی سرزمینِ کشمیر فلسفہ ، تصوّف اور شاعری کا مرکز رہی ہے اور اس مثلث کے تینوں زاویے علامہ کو کشمیری ہونے کے ناطے ورثہ میں ملے فارسی زبان اور اہلِ کشمیر کی ذہانت بھی آپ کو اپنے بزرگوں سے ملی۔

علامہ کے والد شیخ نور محمد (وفات ۔ ۱۹۳۰) ایک پرہیزگار ، صوفی منشی اور قلم دوست بزرگ تھے ، ان کے گھر بعض عربی و فارسی کتبِ پڑھی جاتی تھیں گھریلو ماحول مذہبی و علمی تھا اور مشرقی تہذیب کا نمونہ ، ایسے ماحول میں فرزندِ کشمیر علامہ محمد اقبال نے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو آنکھ کھولی۔ اس زمانے میں سکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسجد و مکتب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اسلامی مدارس و مکاتب میں عربی کے بعد فارسی سب سے بڑی مذہبی علمی اور ادبی زبان تسلیم کی جاتی تھی۔

علامہ کو بھی سکول کے دنوں میں سیالکوٹ کے ممتاز عالم مولانا سیّد میر حسن (وفات ۔ ۱۹۲۹ء) کے مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ سیّد صاحب اُردو فارسی اور عربی کے جید عالم تھے عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔ مولوی صاحب موصوف کی زندگی خالص علمی زندگی تھی اور ان کو شعرائے عرب ، شعرائے ایران اور شعرائے اُردو کے بے شمار اشعار زبانی یاد تھے اور ان کی تعلیم کا یہ خاصہ تھا کہ جو شخص ان سے عربی اور فارسی زبان کی تعلیم حاصل کرتا تھا اس کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے تھے۔ (۱)

فارسی زبان میں علامہ نے کس طرح حیرت انگیز مہارت پیدا کی اس بارے میں آپ (اقبال) ایک خط میں سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں۔ لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ اقبال کو فارسی کیونکر آ گئی ، جب کہ اس نے سکول یا کالج میں زبان نہیں پڑھی ، انہیں یہ معلوم نہیں کہ میں نے فارسی زبان کی تحصیل کے لیے سکول ہی کے زمانے میں کس قدر محنت اٹھائی اور کتنے ،

اساتذہ سے استفادہ کیا۔(۲)

علامہ نے سید صاحب سے گلستان، بوستان، سکندر نامہ دیوانِ غنی، انور سہیلی اور سہ نثر ظہوری کا درس لیا تھا، اس طرح ان کو فارسی کا کلاسک شاعری اور نثر پر عبور حاصل ہو گیا تھا۔ علامہ کی سعدی اور حافظ سے اسی زمانہ میں عقیدت پیدا ہوئی جس خط کا حوالہ ہم نے بھی دیا ہے اس سے یہ بھی متبادر ہوتا ہے کہ آپ نے سید مرحوم کے علاوہ دوسرے اساتذہ سے بھی فارسی زبان کی تعلیم پائی تھی۔

شعر گوئی اور شعر فہمی کی صحیح مذاق بھی علامہ میں اسی لائق استاد نے پیدا کیا تھا۔ بقول خلیفہ عبدالحکیم معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اقبال نے اُردو اور فارسی اساتذہ کا کلام کثرت سے مطالعہ کیا اور مولانا میر حسن شعر کا صحیح ذوق پیدا کرنے میں اس نوخیز شاعر کے معاون ہوئے۔(۳)

ایف اے کرنے کے بعد علامہ ۱۸۹۶ء میں مسعود سعد سلیمان ابوالفرج رونی، عُرفی اور حضرت ہجویری کے شہر لاہور پہنچے اور گورنمنٹ کالج میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔ لاہور کی مسلم کشمیری براری نے ایک اصلاحی انجمن "انجمن کشمیری مسلمانان" لاہور کے نام سے فروری ۱۸۹۶ء میں قائم کی تو علامہ اس کے پہلے اجلاس میں شریک ہوئے اور اس موقع پر ستائیس اشعار کی ایک نظم پڑھی نظم کا پہلا شعر یہ ہے۔

کیا تھا گردشِ ایام نے مجھے محزون!

بدن میں جان تھی جیسے قفس میں صیدِ زبوں

یہ نظم "کشمیری میگزین کے شمارہ مارچ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی نظم کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر کو مشکل اور متروک لغات فارسی پر کامل عبور حاصل ہے اس نظم میں برتے گئے چند لغات وتراکیب فارسی یہ ہیں۔ گردشِ ایام، صیدِ زبون، اشکِ صد کانون، راہ نموں، ہلال وار، شکرِ خدائے کُن فیکون، مثالِ گردوں، شکرِ از دبچوں، نارِ سوزِ دروں، مثالِ تموّجِ جیحون، گنبدِ گردوں، چراغ عقل، درِ مکنون، آشنائے سکون۔

۱۹۰۱ء کے "کشمیر گزٹ" لاہور میں علامہ کے جو قطعات شائع ہوئے ان کی زبان بھی اُردو سے زیادہ فارسی کے نزدیک ہے مثال کے طور پر یہ تراکیب ملاحظہ فرمائیے۔

جیبِ خجلت، سرِ طور، تجلی گہ، مولائے جلیل، نافۂ غزال، پنجۂ ظلم وجہالت، بے پرو بے بال، روحِ آزادیٔ کشمیر، یادِ ایامِ گزشتہ، چشمِ اغیار، دُرِ مطلب، مثلِ حروفِ کشمیر۔

ان قطعات میں ایک قطعہ وہ ہے جن میں غنی کاشمیری کے اس شعر پر گرہ لگائی گئی ہے۔

ہر کہ پابندِ چمن شدمی گشد آزا رہا
پائے گل اندر چمن دائم پُراست ا زخا ر ہا

علامہ کا قطعہ یوں ہے۔

ظلم سہتے ہیں وطن اپنا نہ جن سے چُھٹ سکا
شکوۂ حکام پھر اے دل نہیں تیرا بجا
کیا عجب کشمیر میں رہ کر جو ہے ان پر جفا
پائے گل اند رچمن دائم پُراست ازخا رہا

"نالۂ یتیم" علامہ نے ۱۹۰۰ء میں کہی، اس میں ان کا یہ فارسی شعر ملتا ہے

دوستی از کس نمی بینم ویاراں راچہ شُد
دوستی کو آخر آمد دوست داراں چہ شُد

۱۹۰۱ء میں علامہ کے دوست اور مشہور صحافی محمد دین فوق نے کتاب "شالا مار باغ" مرتب کی تو علامہ نے اس کا فارسی میں جو مادۂ تاریخ تالیف کہا وہ یہ ہے۔

حُسنِ سعئی را صد مرحبا
ہمست ہر سطرِ کتابش دل رُبا!
از سر نازشِ پئے تاریخ او
می سزد تصویر با غ جا نفز ا (۵)

علامہ نے مشہور نظم "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے" انجمن حمایتِ اسلام کے اجلاس میں فروری ۱۹۰۲ء کو سنائی تھی۔ نظم کے نو بند ہیں اور اس میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ ہر بند کا آخری شعر فارسی میں ہے اور گیارہ شعروں کا آخری بند سارے کا سارا فارسی میں ہے بندِ اول کا آخری شعر یہ ہے

صبرؔ را از منزلِ دل پابجولاں کردہ ام
گیسوئے مقصود را آخر پریشاں کردہ ام

دسواں بند جو سارے کا سارا فارسی میں ہے نعتیہ ہے۔ فرماتے ہیں

اے کہ برد دلہا رموزِ عشق آساں کردہ ای

سینہ ہارا از تجلی یوسفستاں کردہ ای(۶)

منشی سراج الدین نے کشمیر سے علامہ کو تحفہ کے طور پر چار انگشتریاں ۱۹۰۲ء میں بھجوائی تھیں۔ علامہ نے یہ پُر خلوص تحفہ قبول کرنے کے بعد منشی صاحب مرحوم کو ایک نظم بعنوان "شکریہ انگشتری" بھیجی۔ شروع کے اشعار ہیں تو اُردو میں لیکن اس کے کئی مصرعے غالباً غیر شعوری طور پر فارسی بن گئے مثلاً۔

تو سراپا آیتی ازسورهٔ قرآنِ فیض

یہ مصرعہ ہوئی کہ جگہ شُد است لگانے سے فارسی بن جاتا ہے

زینتِ دستِ حنا مالیدہ ُ جاناں ہوئی

معلوم ہوتا ہے کہ اُردو شعر کہتے کہتے علامہ کو فوراً خیال آ گیا کہ وہ نظم ایک ایسے دوست کو بھیجنے والے ہیں جو برعظیم کے اصفہان یعنی سرینگر میں مقیم ہیں لہذا انہوں نے گریز کے بعد سولہ شعر فارسی میں کہیے۔ گریز یہ ہے

ہون بہ تبدیلی قوافی فارسی میں نغمہ خواں

ہند سے جاتی ہے سوئے اصفہان انگشتری

فارسی کے چند اشعار یہ ہیں۔

یارم از کشمیر فرستادست چہار انگشتری

چار در صورت ، بمعنی صد ہزار انگشتری

چار را گرصد ہزار آوردہ ام اینک دلیل

شد قبولِ دست یارم ہر چہار انگشتری

داغ داغ ازموج مینا کاریش جوشِ بہار

می دہد چوں غنچۂ گل بوئے یار انگشتری

در لہا و ر آمدو چشم تماشا شدہ تمام

بور در کشمِ چشمِ انتظار انگشتری (۷)

۱۹۰۳ء میں علامہ نے دوستوں کو محفل میں ارتجالاً ایک نظم کہی تھی جو "اہلِ درد" کے عنوان سے باقیات اقبال میں شامل ہے اس موقع پر دو شعر علامہ نے فارسی میں بھی کہے تھے۔

صبرِ ایوب و فاخو، جزوِ جانِ اہل درد
گریہ ٔ آدم، سرشت ِ دود ماں اہلِ درد
اوج ، یک مشتِ غبارِ آستانِ اہلِ درد
جوہرِ رفعت ، بلاگرداں، شانِ اہل درد(۸)

علامہ اقبال کے شفیق استاد ارنلڈ (وفات۔ ۱۹۳۰ء جب انگلستان واپس چلے گئے تو استاد کے فراق میں شاگرد نے ایک رقت آمیز نظم "نالہ فراق" کے عنوان سے کہی جو بانگِ درا کے حصہ وال میں شامل ہے۔ اس نظم میں جہاں علامہ نے دو شعر دوسرے فارسی شاعروں کے نقل کئے ہیں وہاں تیسرے بند کا تیسرا فارسی شعر خود کہا ہے۔

ابرِ رحمت ، دامن از گلزارِ من بر چید و رفت
اند کے بر غنچہ ٔ ہائے آرزو بار ید و رفت

علامہ کی ۳۴ اشعار کی ایک فارسی نظم جنوری ۱۹۰۵ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ نظم کا عنوان ہے "سپاس جناب امیر" کلام میں پختگی ہے اور انداز نظامی گنجوی کا ہے۔ نظم کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں۔

اے محوِ ثنائے تو زماں ہازائے یوسفِ کاروانِ جانہا
اے بابِ مدینۂ محبت اے نوحِ سفینۂ محبت

بانگِ درا کے حصہ اول میں ایک نظم "صدائے درد" کے عنوان سے درج ہے اس کے جو اشعار قلمزد کو دیئے گئے تھے۔ ان میں سے دو فارسی کے تھے فرماتے ہیں۔

الوداع اے سیر گاہ شیخ شیراز الوداع
اے دیا ربا لمیکِ نکتہ پر داز الوداع
الوداع اے مد فنِ ہجویریِ اعجازِ دم
رخصتِ اے آرام گاہِ شنکر جادُو رقم

شروع سے ۱۹۰۵ء تک کا علامہ کا اُردو کلام بانگِ درا کے حصہ اول میں شامل کیا گیا ہے۔ اس حصہ کے کلام میں علامہ

نے کثرت سے فارسی تراکیب برتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے اندر کا بڑا اور قادر الکلام فارسی گو شاعر کس طرح بتدریج جوان ہوتا گیا بالکل ایک بچے کی طرح جو پہلے پہل رُک رُک کر ایک ایک لفظ سیکھتا ہے پھر وہ الفاظ کو جوڑ کر جملے بناتا ہے اور جب جوان ہو جاتا ہے تو ایک خطیبِ شعلہ بیان اور ایک ادیب فصیح اللسان بن جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے فارسی شاعری کا سفر الفاظ سے شروع کیا اور پھر وہ تراکیب اور مصرعوں کی گھاٹیوں سے گزر کر شعرِ ناب کی منزل پر پہنچے تھے۔

بانگِ درا کے حصہ اول میں ۴۹ منظومات اور بارہ غزلیات ہیں اس کلام میں فارسی تراکیب کی ایک مختصر سی فہرست یہ ہے۔

ھمالیہ:۔

فصیلِ کشورِ ہندوستان، سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں، (کلاہِ مہرِ عالم تاب) آئینہ سیال، برقِ کوہسار، فیلِ بے زنجیر (جنبشِ موجِ نسیمِ صبح) کنجِ خلوت خانۂ قدرت، شاہدِ قدرت، سنگ رہ، مسکنِ آبائے انسان، غازۂ رنگ، شفق۔

گل رنگین:۔

شریکِ شورشِ محفل، بے گدازِ آرزو، غیر از نگاہ چشم دیدۂ حکمت، برگِ ریاضِ طور، زخمی شمشیرِ ذوقِ جستجو، چراغ خانۂ حکمت، سرمایۂ قوتِ خرام آموز

عہدِ طفلی:۔

شورشِ زنجیرِ در، وقفِ دید، مائلِ گفتار، ذوقِ استفسار

مرزا غالب:۔

پرِ مرغِ تخیّل، سوزِ زندگی، سکوتِ کوہسار، فردوسِ تخیّل، کشتِ فکر، لبِ تصویر، گلِ شیراز، گیسوئے اُردو، منت پذیرِ شانہ، دل سوزیِ پروانہ، نالۂ خاموش۔

ابرِ کوہستار:۔

گل پاش، سبزۂ کوہ۔ ناقۂ شاہدِ رحمت، شانہ موجۂ صرصر (سبزۂ مزرعِ نوخیز، زادۂ بحر، پروردۂ خورشید، شورشِ

قلزم، ذوق تبسم۔

خفتگانِ خاک سے استفسار:۔

نقابِ روئے شام، شانۂ ہستی، گیسوئے شام، ساحرِ شب، منظر حرماں نصیبی، حیرت خانۂ امروز وفردا، پیکارِ عناصر ،حصارِ غم منزلِ آرام، مقصدِ تادیب، قتیلِ ذوقِ استفہام۔

شمع و پروانہ:۔

خُم خانہ جہاں، نخلِ تمنا، جوشِ عاشقِ حسن قدیم، ذوق تماشائے روشنی، تمنائے روشنی۔

عقل ودل:۔

خضرِ خجستہ پا، مظہر شانِ کبریا،غیرتِ لعلِ بے بہا، طائرِ سدرہ آشنا۔

صدائے درد:۔

محیط آبِ گنگا، نفاق انگیز، قربِ فراق آمیز، لطفِ نغمہ پیرائی، لذتِ قربِ حقیقی، اختلاطِ موجہ وساحل، دانۂ خرمن نما، آتشِ پیکار۔

آفتاب:۔

روحِ دروان جہاں، شہرازہ بند دفترِ کون ومکاں، ضیائے شعور ساکنانِ نشیب وفراز، زائیدگانِ نور، آزادِ قیداول وآخر

شمع:۔

فریاد درگرہ، صفتِ دانہ سپند، حرارتِ سوز دردن، گل فروش اشک شفق گوں، شمع بزم عیش، شمع مزار، ماہ آشوب امتیاز، دہد حرم، دورِسیاہ، جوشِ اضطراب، آگاہِ اضطراب، دلِ بیقرار، امتیازِ رفعت دپستی، اصلِ کشاکشِ من وتو، تپش آموزِ جاں عشق، زیب درخت طور، فسردگئی ئے سبب، مسجود ساکنانِ فلک، آہنگ طبعِ ناظم کون ومکاں، سرِ دیوان ہست وبود، چشم غلط نگر، ظہور جلوہ ذوق شعور، طوقِ گلوئے حسن، اسیرِ فریب نگاہ، حلقۂ دامِ ستم۔ طائرِ بامِ حرم، آشنائے لب قصہ دارورسن۔

آفتابِ صبح:۔

سورشِ میخانۂ انساں۔ زینتِ بزمِ فلک۔ گوشِ عروسِ صبح۔ سیمائے افق۔ صفحۂ ایام۔ داغِ مدارِ شب۔ قیدِ زنجیرِ تعلق۔ بستۂ رنگِ خصوصیت۔ عقدۂ اضداد۔ حسنِ عشق انگیز۔ جز ہمدردی انسان۔ زحمتِ کش ہنگامہ۔ عالمِ نورِ مسجودِ ملک۔ گرمِ تماشا۔ منت پذیرِ صبح فردا۔ لیلیٰ ذوقِ طلب۔ کشودِ عقدہ مشکل۔ لطف صد ساحل۔ سعئ بے حاصل۔ دردِ استفہام۔ جستجوئے رازِ قدرت۔

دردِ عشق:۔

تہیۂ نقاب، پنہاں درون سینہ، اشک جگر گداز، حیرت علم آفریدہ، نگہ نارسیدہ خیال بلند، دیدہ حکمت پسند، کشتہ نظارہ مجاز، خلوت، سرائے راز، مئے خیال۔

گل پژمردہ:۔

موجِ صبا، گہوراہ جنساں، صحنِ گلستان

سید کی لوحِ تربت:۔

مرغ جاں تارِ نفس، سنگ تربت، ہنگامہ محشر، دست ارباب سیاست، خامۂ معجز رقم، تلمیذ رحمانی، شعلۂ آواز

ماہِ نو:۔

روئے آب نیل، طشت، گردوں، نشتر قدرت، فصد آفتاب، بے منت بانگ درا، سیارہ ثابت نما، طفلک سیماب پا، مکتب ہستی،

انسان اور بزمِ قدرت:۔

بزم معمورہ ہستی، پرتو مہر، سیم سیال، خم شام، پردہ نور، حلقہ دام تمنا، خرم نیاز

پیامِ صبح:۔

جبین شب، طلسم ظلمت شب، خوابیدگان دیر، سوئے گور غریباں

عشق اور موت:۔

تبسم فشان، تعلیم تابندگی، شاخ ہستی، تشنہ کام مئے بے خودی، پئے سیر رخت ہستی

زھد اور رندی:۔

مئے زہد، درد خیال ہمہ رانی، قمریِ شمشاد معانی، پابندی احکام شریعت، رشک کلیم ہمدانی، اثر فلسفہ دانی، مجموعۂ اضداد، قرب مکانی، سرِ راہ تصور ہمہ دانی

شاعر:۔

اعضائے قوم، منزل صنعت، دست و پائے قوم، دیدہ بینائے قوم

دل:۔

جادہ ملک بقا، خط پیمانہ دل، مزرعہ ہستی، دانہ دل، ویرانہ دل، رشک صد سجدہ، لغزش مستانہ دل، خاکسترِ پروانہ دل۔

موجِ دریا:۔

حلقہ گرداب، جذب مہ کامل، زحمت تنگئی دریا، وسعت بحر

رخصت اے بزمِ جہاں:۔

سوئے وطن، درخورِ محفل، دربار سلطان، شبستان وزیر، ہنگامہ عشرت، موسیقی گفتار، ہم نشین نرگس شہلا، ہمسایہ گل۔

طفلِ شیر خوار:۔

نو واردِ اقلیم غم، آزاد غبار آرزو، شرارِ آرزو۔

تصویرِ درد:۔

منت کش تاب شنیدن، مرگ ناگہاں، نا آشنائے بزم عشرت، حرفِ زیر لب، شرمندہ گوش سماعت، گردِ کدورت، مضمون سیر عرصہ ہستی، صورت آئینہ حیران، سراپا نالہ بیدار، سوز زندگی، سپند آسا، آرائش رنگ تعلق، کیف آئینہ، ہوس بالائے منبر، آزاد احسان رفو، آسیر امتیاز ما و تو، مثل حباب آبجو، علاج گردش چرغ کہن، طول داستان درد

نالہ فراق:۔

یارآیّام سلف، کلیم زروہ، سنیائے علم، بارِنشاط افزائے علم،

سرگذشت آدم:۔

قصہ پیمان اولین، اوجِ خیال، فلک نشیمن

صبح کا ستارہ:۔

لطف ہمسائگی شمس وقمر، خدمت پیغام سحر، دامن صد چاک، (خاتم دست سلیمان) گہر ہائے گرانمایہ، تقاضائے اجل، سوئے میدان وفا، ساغر دیدہ پرنم

داغ:۔

پیوندِ زمین، کتاب دِل، زمینِ شعر، بیدادِ اجل، صیادِ اجل

ابر:۔

رخِ مہر، زیرِ دامنِ ابر، سورتوسنِ ابر، میکدہ بے خروش، حکمِ نشاطِ مدام

بچہ اور شمع:۔

زیرِ نقاب آگہی، غبارِ دیدہ بینا، حجابِ آگہی، ضوگستری، طفلکِ نا آشنا، ساکنانِ صحنِ گلشن۔

کنارِ راوی:۔

محوسرود، سوادِ حرم، سرکنارہ، آبِ رواں دامن شام پیر فلک، دستِ رعشہ دار، عظمت فزائے تنہائی، گرم ستیز، جہازِ زندگی آدمی

غزلیات:۔

مثالِ شرار، ہستئ ناپائیدار، اسیر حلقہ دام ہوا، جائے حسرت زرآفرین جرمِ محبت، فراقِ ساقِ نامہرباں، چمن افروز، نالہ خوابیدہ، رحیل کارواں، سامان کشودکار، خاطر گرداب، پابندی رسم فغاں، شب آستان کعبہ، نوائے راز، غبارِرہ، حجاز وغیرہ

بانگ درا کے حصہ اول میں بعض مصرع اور شعر ایسے ہیں جن کو معمولی تصرف کے ساتھ فارسی بنایا جاسکتا ہے۔ مثلاً

سوئے خلوت گاہِ دل دامن کش انسان ہے تو (ہمالیہ)(توئی)

شیرازہ بند دفترِ کون و مکاں ہے تو (آفتاب)(توئی)

عالم ظہورِ جلوہ ذوق شعور ہے (شمع)(ہست)

سراپا نالۂ بیدادِ سوزِ زندگی ہو جا (تصویردرد)(باشی)

اب چند ایسے اشعار ہیں جن کو آسانی کے ساتھ فارسی کہا جا سکتا ہے۔

غم زدائے دل افسردہ دہقاں ہونا

رونق بزم جوانانِ گلستاں ہونا

یہ شعر ہونا کی جگہ بودن لگا دینے سے فارسی شعر ہو جائے گا۔ اس حصے میں بعض مصرعے اور شعر فارسی میں ہیں۔

آہ اے نظارہ آموز نگاہ نکتہ بیں (مرزا غالب)

یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو (آفتاب)

محفلِ نظمِ حکومت چہرہ زیبائے قوم (شاعر)

منارِ خوبگہہ شہسوارِ چغتائی (کنار راوی)

اور اب ملاحظہ ہوں علامہ کے وہ فارسی اشعار جو بانگ درا کے اس حصہ کی زینت ہیں۔

ہمچو نے از نیستان خود حکائت می کنم

بشنوائے گل از جدائی ہاشکائت می کنم (گل پژمردہ)

قصہ دارو رسن بازی طفلانہ دل

التجائے ارنی سرخئی افسانہ دل (دل)

ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من بر چیدو رفت

اند کے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت (نالہ فرقا)

تپش ز شعلہ گر فتد و بر دل تو زدند

چہ برق جلوہ بخاشاکِ حاصلِ تو زدند (بلال)

اگر سیاہ دم داغ لالہ زارِ توام

وگر کشادہ جبینم گل بہار توام (التجائے مسافر)

ابتدائی دور کے اس کلام میں علامہ اقبال نے چند نظموں میں دیگر فارسی گو شاعروں کے پسندیدہ اشعار بھی شامل کئے ہیں جس سے ان کے عمیق مطالعہ اور حافظہ کا پتہ چلتا ہے۔ تصویر درد میں یہ دو شعر شامل ہیں۔

دریں حسرت سرا عمریست افسون جرس دارم
زفیضِ دل طپیدن ہا خروش بے نفس دارم
نمی گردید کو تہ رشتہ معنی، رہا کردم
حکایت بود بے پایان بخاموشی ادا کردم

"نالہ فرق" میں مندرجہ ذیل دو شعر بالترتیب پہلے بند اور چوتھے بند میں شامل ہیں۔

تاز آغوش وداعش داغِ حیرت چیدہ است
ہمچو شمع کشتہ در چشم نگہ خوابیدہ است
شور لیلیٰ کو کہ باز آرائش سوداکنند
خاکِ مجنوں را غبارِ خاطر صحرا کنند

فارسی کی کلاسیک شاعری کا مطالعہ علامہ نے سیالکوٹ کے زمانہ طالب علمی میں کیا تھا۔ لاہور برعظیم کا مشہور اور قدیم مرکز علم و ادب رہا ہے۔ یہاں پہنچ کر آپ نے فارسی میں گفتگو کرنا سیکھا۔ آپ یہاں ایک ایرانی مبلغ ادیب اور شاعر مرزا محمود زرقانی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے جو "پیسہ اخبار" کے دفتر میں ۱۹۰۴ء تک سکونت پذیر رہے۔ ایک اور ایرانی عالم مرزا منیر بنیل زادہ سے بھی آپ کی ملاقاتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ستمبر ۱۹۰۵ء میں علامہ اقبال اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے رہسپار ولائت ہوئے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو عدن سے جو خط مولوی انشاء اللہ کے نام انہوں نے لکھا تھا۔ اس میں وہ بمبئی کے ایک ہوٹل میں ایک ترک نوجوان سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں لکھتے ہیں۔

"میں نے پوچھا فارسی جانتے ہو، بولا بہت کم، پھر میں نے فارسی میں اس سے گفتگو شروع کی لیکن وہ یہ نہ سمجھتا تھا۔ آخر بہ مجبوری ٹوٹی پھوٹی عرب میں اس سے باتیں کیں۔"

بمبئی کے پارسیوں کا ذکر کرتے ہوئے اسی خط میں آپ فرماتے ہیں

افسوس یہ لوگ فارسی لٹریچر سے غافل ہیں ۔ ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ ایرانی لٹریچر میں عربیت کا فی الحقیقت کوئی دخل نہیں ہے بلکہ زرتشتی رنگ اس کے رگ و ریشے میں ہے اور اس پر اس کے حسن کا دارومدار ہے۔ فارسی زبان وادب سے یہی محبت لئے علامہ انگلستان پہنچے ۔ یورپ میں قیام کے زمانے میں علامہ اقبال نے اُردو میں جو کلام کہا وہ "بانگ درا" کے حصہ دوم میں شامل ہے یہ سارا کلام ۲۴ نظموں اور سات غزلوں پر مشتمل ہے۔ کلام کا یہ مجموعہ پہلے سے کہیں زیادہ فارسی ہو گیا ہے۔

ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ اقبال کا بچپن سے ہی میلان طبع فارسی کی طرف تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اردو کلام میں بھی چند اور غزلوں کو چھوڑ کر فارسیت زیادہ ہے۔ غالب نے اپنے اُردو کلام کو " مجموعہ بے رنگ" اور فارسی کلام کو " نقش ہائے رنگ رنگ" کہا ہے۔ اقبال غالب کے مرثیہ میں اُردو کی کم مائگی پر آنسو بہاتے اور کہتے ہیں کہ گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے۔

علاوہ ازیں یورپ میں پہنچ کر ان کو یہ احساس ہوا کہ وہ خلیج فارس ایشائے کوچک، ایران، برعظیم پاک و ہند، افغانستان اور ترکستان تک اپنا پیغام فارسی کے ذریعہ ہی پہنچا سکتے ہیں کیونکہ فارسی اُردو سے قدیم تر اور وسیع تر زبان ہے۔ فرماتے ہیں

گر چہ ہندی در غدوبت شکراست

طرز گفتار دری شیریں تر است

پھر یورپ وغیرہ کے خاور شناسی بھی آسانی سے ان کے پیغام سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے علامہ نے باقاعدہ فارسی شاعری ۱۹۱۲ء میں شروع کی۔ اس پر طبعی مناسبت نورٌ علیٰ نور ہو گئی۔ فارسی زبان وتمدن اور فلسفہ وادیان سے علامہ کی محبت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آپ نے ڈائرکٹریٹ کے لیے جو مقالہ قلم بند کیا اس کا موضوع مابعد الطبیعات ایران" ہے۔ اس کے لیے آپ کو فارسی زبان اور ایران کی فکری و فلسفی تاریخ کا اور وسیع مطالعہ کرنا پڑا۔ جس کے سبب فارسی زبان پر ان کی گرفت اور مضبوط ہو گئی حصہ دوم کے کلام میں مندرجہ ذیل فارسی تراکیب مصرعے اور اشعار پائے جاتے ہیں۔

محبت:۔

عروسِ شب، لذتِ رم، پنہائے علام، کمالِ نظم ہستی ، چشمِ روحِ آدم

سوامی رام تورتھ:۔

قطرہ بیتاب، سورشِ محشر، آتش خانہ آرزو، معنیٔ انجام

طلبہ علی گڑھ کالج کے نام:۔

طائرِ زیر دام، نالہ طائرِ بام، لطفِ خرام، جذب حرم، گردشِ آدمی، غم کدہ نمود، خشتِ کلیسا

اختر صبح:۔

دام آفتاب۔تہہ دامنِ سحر، ریاضِ سخن

حسن و عشق:۔

کشتیٔ سیمینِ قمر، یدِ بیضائے کلیم، موجہ نکہتِ گلزار

عاشق ہرجائی:۔

رونقِ ہنگامہ محفل، دیوانہ رنگین نوا، حکمتِ آفریں، آزادِ دستورِ فرما

کوشش ناتمام:۔

چشمِ شفق، اخترِ شام، قیسِ روز، لیلیٔ شام، قافلہ نجوم خضرِ خجستہ گام

نوائے غم:۔

ربابِ خاموش، محشرستان نو۔منتِ کش ہنگامہ، نغمہ یاس

عشرتِ امروز:۔

طلب گار درد پہلو، شان سکندری، پیکار زندگی، وفور گل، آتش زدہ، طلسم مجاز

فراق:۔

دعائے طفلکِ گفتا آزما، بہشتِ دیدہ بینا، حسنِ منظرِ شام، سکوتِ شام جدائی، تختِ لعل شفق۔

عبدالقادر کے نام:۔

اثرِ صیقلِ عشق، سنگِ امروز، آئینہ فردا، جلوہ یوسفِ گم گشتہ، آئین نمو، قطرہ شبنم بے مایہ، محوِ رخ سعدی، آرزو ئے نمو، دیدہ اغیار،

صقلیہ:۔

جہانِ تازہ، عصر کہن، تیغ ناصبور، شورشِ قم، زنجیر تو ہم، موجِ رقصاں

غزلیات:۔

شیدائے بخیہ کاری، حصارِ ملتِ، صدف نشینی، سروِ کنار جو، جنس ثوابِ آخرت۔ پردہ انگور

حصہ زیر نظم میں مندرجہ ذیل مصرعے فارسی کے ہیں۔

جانبِ منزل رواں بے نقشِ پامانند موج (عاشق ہرجائی)

فیض ساقی شبنم آسا ظرفِ دل دریا طلب (عاشق ہرجائی)

دریا موئے بحر جادہ پیما (انسان)

خوابیدہ زمیں جہاں خاموش (تنہائی)

وہ اُردو مصرعے جو بادنیٰ تصرف فارسی بن جاتے ہیں۔

چشم نظارہ میں نہ تو سرمہ امتیاز دے (پیام) (را، رہ)

ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم عشق (سوامی رام تیرتھ) (را، دار دست)

تپش آمادہ تراز خون زلیخا کردیں (عبدالقادر کے نام) (بکنیم)

اس حصہ میں فارسی اشعار کی تفصیل یہ ہے۔

ازنفس درسینۂ خوں گشتہ نشتر داشتم

زیر خاموشی نہاں غوغائے محشر داشتم (وصال)

یک نظر کردی و آداب فنا آموختی!

اے خشک روزے کہ خاشاک مراوا سوختی (وصال)

موج بحریم و شکست خویش برد ویشم ما (عاشق ہرجائی)

لذت گیر، وجود ہرشی

سرمستِ مئے نمود ہرشی

زیر مطالعہ حصہ میں دوسرے شاعر کا صرف ایک فارسی شعر لایا گیا ہے۔

ہر چہ در دل گزرد وقف زباں دارد شمع

عبدالقادر کے نام سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

یورپ میں قیام کے عرصہ میں علامہ نے فارسی میں دوغزلیں تو وہ کہیں جن کا ذکر سر عبدالقادر نے ''بانگِ درا'' کے مقدمہ میں کیا ہے البتہ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کون سی غزلیں تھیں۔ (۱۰)

۲۴ اپریل ۱۹۰۷ء کو علامہ نے کیمبرج سے مس فیضی کو آٹھ اشعار کی ایک فارسی غزل بھیجی اور خط میں ان کو لکھا کہ دقتِ نظر سے مطالعہ کے بعد اپنی تنقید سے ممنون فرمائیے۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے۔

اے گل زخار آرزو آزار چوں رسیدہ

تو ہم زخاک ایں چمن مانند ما رمیدہ

''بانگِ درا'' کے حصہ سوم میں ستر منظومات آٹھ غزلیں اور ظریفانہ کلام شامل ہے۔ کلام کے اس حصہ میں بھی فارسی تراکیب کی بھرمار ہے اور مشہور فارسی شعراء کے اشعار پر خوبصورت تضمینین کی گئی ہیں۔ خود علامہ کا اپنا فارسی کلام اس حصہ میں پہلے دو حصوں کی نسبت زیادہ ہے۔ فارسی تراکب، مصرعوں اور شعروں کی تفصیل یہ ہے:۔

بلادِ اسلامیہ:۔

مسجودِ دلِ غم دیدہ۔ خانقاہِ عظمتِ اسلام۔ زیارت گاہِ مسلم

گورستان شاھی:۔

خرقہ دیرینہ۔ نظارہ خاموش۔ بربطِ قدرت۔ جولان گاہِ عالم گیر۔ مکانِ کہن، نجمِ سبز فامِ آسماں۔ خراج اشک گل گوں۔ آئینہ تحریر۔ غنیمِ موت۔ خسِ آتش سوار۔ رنگہائے رفتہ۔ بارِ دوشِ روزگار۔ ترکیبِ مزاجِ روزگار۔ آبستنِ اقوامِ نو۔ چشمِ کوہ نور۔ دستِ طفلِ خفتہ

نورِ صبح:۔

دخترِ دوشیزۂ لیل ونہار، درودِ فصلِ انجم، کشتِ خاور، محملِ پروازِ شب، شعلہ خورشید، دہقانِ گردوں، خلوت گاہ مینا، تہہ دامانِ بادِ اختلاط انگیز

فلفسہ غم:۔

کیفِ عشرت، سحابِ زندگی، چراغِ سینہ، جامِ دل، رُخسارِ حور۔

وطنیت:۔

روشِ لطف و ستم، تراشیدۂ تہذیبِ نوی، نظارہ دیرینہ

شکوہ:۔

زیاں کار، سود فراموش، محوِ غم دوش، جرات آموز، خوگرِ حمد پیکر محسوس، پابندی آئین وفا، دیوانہ نظارہ محفل، ذوقِ خود افروزی، فرمان جگرسوزی، قوم آوارہ عنان، جنسِ نایابِ محبت، پیرہن برگ، قیدِ موسم

نصیحت:۔

از راہِ نصیحت، شیوہ اربابِ وفا، اندازِ تجلی، موجدِ آئین نیاز، پیچیدہ تراز، زلفِ ایاز، دست پرورد، شریکِ تک و تاز،

غرہ شوال:۔

سرگذشتِ ملت بیضا، رہو درماندہ، شکستِ رشتہ تسبیح شیخ، پختہ زناری، بارش سنگِ حوادث، آئینہ دیواری، لطفِ تکلم

شمع:۔

درِ تابندہ، وعدہ دیدارِ عام، فکر فلکِ پیما، ناامیدِ نورِ ایمن، اسودۂ دامانِ خرمن، زہزنِ ہمت، شعلہ تحقیق، سرودِ بربطِ عالم، جوہر آئینہ ایام، گرفتارِ طلسم، ہیچ مقداری، سطوتِ رفتارِ دریا،

مسلم:۔

آواز سرورِ رفتہ، درائے کاروان خفتہ پا، عریان عالم، افسوں سحر شرمندہ، نومیدِ پیکارِ حیات

جواب شکوہ:۔

برق طبعی، شعلہ مقالی، زحمتِ کش تنہائی صحرا، نغمہ موج

شاعر:۔

جوئے سرور آفریں، دخترِ خوش خرام ابر

والدہ مرحومہ کی یاد میں:۔

زندانی تقدیر، انجمِ سیماب پا، ماہ دار اشکِ عنابی، قصہ نیرنگیِ دوراں، موج رودِ آہ، طِفلکِ بے دست و پا، دخترانِ مادرِ ایام، پسِ نہ پردہ گردوں۔ ذوق حفظِ زندگی، نقش ہوا پائے آب۔ آپ فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو، تخم

گل، تجدیدِ مذاقِ زندگی، جز سنجیدن پر، حلقۂ زنجیرِ صبح و شام، زخم تیغ فرقت،

عرفی:۔

فضائے عشق، ہنگامہ عالم، فغان شبِ آشنائے لطف بے خوابی، شعلہ فریاد، آسماں تابی

ایک خط کے جواب میں:۔

ہمتِ تگ و تاز، وابستہ مذاق تلاش، سحاب دریا پاش

مسلمان اور تعلیم جدید:۔

متاع کس مغر، معبودِ حاضر

تضمین بر شعر صائب:۔

تخمِ سینائی، محروم تقاضائے خود افزائی

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ:۔

سحاب بہار، جیبِ گل، زرِ کامل عیار، خلوتِ اوراق، شجر سایہ دار، شاخ بریدہ، قاعدۂ روزگار،

شیکسپیئر:۔

شفقِ صبح، دیدۂ دیدار طلب، تابِ خورشید، حفظِ اسرار

میں اور تو:۔

ہلاک جادوئے سامری، قتیل شیوہ آرزی، نوائے سوختہ درگلو، حکایت غم آرزو، حدیث ماتم دلبری، گلہ جفائے وفا نما ستیزہ گاہِ جہاں حریفِ پنجۂ فگن

ہمایوں:۔

چراغِ انجمن افروز، شعلہ گردوں نورد

خضرِ راہ شاعر:۔

محوِ نظر، سکوت افزا، گرم ناؤ نوش

صحرانوردی:۔

تگاپوئے دمادم، رہینِ خانہ، نمودِ اخترِ سیماب پا، سکوتِ شامِ صحرا، زنجیری گشت وتخیل

زندگی:۔

برتر از اندیشہ، سود وزیاں، پیمانۂ امروز وفرد، فردا سیر آدم، ضمیرِ کن فکاں، جوئے شیر وتیشہ سنگِ گراں، فروغ جاوداں سوئے گردوں

سرمایہ ومحنت:۔

غنچہ سال، نغمہ بیداری، جمہور، قصہ خواب آور اسکندر وجم، باغبان چارہ فرما

دنیائے اسلام:۔

مے فروشانِ فرنگستاں، حکمتِ مغرب، ربط وضبط ملتِ بیضا، حفظِ حرم، ترک خرگاہی، اعرابیِ ولا گہر، مانند خاکِ رہگذر

طلوع اسلام:۔

عروقِ مردہ مشرق، تلاطم ہائے دریا۔ چشم پاک ہیں، سرشک چشم مسلم کتابِ ملتِ بیضا، حنابند عروس لالہ، میان شاخ ماراں، ثبات زندگی، نگاہِ مردِ مومن، شرمندہِ ساحل، غبار آلودہ رنگ ونسب، حلقہ شام وسحر، مصافِ زندگی، جوئے نغمہ خواں، صید زبون شہریاری، تیغ لاخروش آموز بلبل، جولان گہہ اطلس قبایان تتازی

غزلیات:۔

موج پریشانِ خاطر، آوارگیِ فطرت، کشمکش دریا، سرورِ قمری وبلبل باطنِ ہنگامہ آباد چمن، پہلوئے انساں، سبک گام عمل، زناری بت خانہ ایام، ترازوئے کم وکیف حیات، بادگردان عجم، بیگانہ اندارِ کلیسائی، ہوس شوکت دارائی، طرفِ آشنائی خروش، سکوت پردہ ساز، حرم خانہ خراب، عفو بندہ نواز، شہید ذوق وفا۔

بانگ درا کے حصہ سوم میں علامہ اقبال نے فارسی اشعار پر تضمینیں زیادہ کی ہیں اور خود ان کے فارسی اشعار بھی زیادہ ہیں اس حصہ میں علامہ کے مندرجہ ذیل اُردو مصرعوں کو فارسی بنایا جاسکتا ہے۔

باطن ہر ذرہ عالم سراپا درد ہے (گورستان شاہی) (ہست)

مادر گیتی رہی آبستن اقوام نو (گورستانِ شاہی)(بماند)

غارت گر کا شانہ دین نبوی ہے (وطنیت)(ہست)

نقد خود داری بہائے بادۂ اغیار تھی (شمع)(بود)

شعلہ تحقیق کو غارت گر کاشانہ کر (شمع)(را، کن)

صرف تعمیر سحر خاکستر پروانہ کر (شمع)(کن)

علم و حکمت زہرزن سامان اشک و آہ ہے (والدہ مرحومہ کی یاد میں)(ہست)

اب ہم علامہ کے فارسی مصرعوں کی فہرست پیش کریں گے جو یا تو انھوں نے عمداً فارسی میں کہے ہوں گے، یا غیر ارادی طور پر اس زبان میں ڈھل گئے ہوں گے۔

خاموش صورت گل مانند بو پریشان (رات اور شاعر)

خاتم آر زوئے دیدۂ و گوش (سیر فلک)

بے حجابانہ شود جلوۂ فردش (سیر فلک)

ساقیان جمیل جام بدست (سیر فلک)

طالع قیس و گیسوئے لیلیٰ (سیر فلک)

سرمایہ دار گرمی آواز خامشی (موٹر)

غرہ شوال اے نور نگاہ روزہ دار (غرہ شوال)

اے دُر تابندۂ پروردہ آغوش موج (شمع)

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستان حجاز (شمع)

رضائے خواجہ طلب کن قبائے رنگیں پوش (قرب سلطان)

ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی (ارتقاء)

خفتگان لالہ زار و کوہسار و رود بار (والدہ مرحومہ کی یاد میں)

ہوائے بزم سلاطین دلیل مردہ دلی (ایک خط کے جواب میں)

برگ گل آئینۂ عارض زیبائے بہار (شیکسپیئر)

انجم کم ضو گرفتارِ طلسم ماہتاب (خضرِراہ)

کشتیِ مسکین و جاں پاک و دیوار یتیم (خضرِراہ)

مجلسِ آئین و اصلاح ورعایات حقوق (سلطنت)

گرمئ گفتگار اعضائے مجالس الاماں (سلطنت)

حق ترا چشمے عطا کر دست غافل درنگر (دنیائے اسلام)

مور بے پر حاجتے پیش سلیمانے مبر (دنیائے اسلام)

ربود آن ترک شیرازی دل تبریز وکابل را (طلوعِ اسلام)

حصہ سوم میں علامہ اقبال کے جو فارسی اشعار ملتے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

اے خوش آن روز کہ آئی وبعد بازآئی
بے حجابانہ سوئے محفل ما باز آئی (شکوہ)

"شمع وشاعر" میں شاعر سے علامہ نے پانچ اشعار کی یہ فارسی نظم کہلوائی ہے۔

دوش می گلفتم بہ شمع منزل ویرانِ خویش
گیسوئے تو از پرِ پروانہ دارد شانہ
درِ جہاں مثل چراغ لالہ صحرا ستم
نے نصیبے محفلے نے قسمتِ کا شانہ
مدتِ مانند تومن ہم نفس می سو ختم
در طواف شعلہ ام بالے نہ زد پروانۂ
می طپد صد جلوہ درجان اہلِ فرسودمن
برنمی خیزد ازیں محفل دل دیوانہ
از کجا ایں آتشِ عالم فروزاندوختی
کرمکِ بے مایہ را سوزِ کلیم آموختی
درغم دیگر بسوز و دیگراں راہم بسوز

گلتمت روشن حدیثے گرتوانی دار گوش (شمع)

خود گدازی دم کیفیتِ صہبائش بود

خالی از خویش شدن صورت مینائش بود (جوابِ شکوہ)

نخل شمع استی و در شعلہ دود ریشۂ تو

عاقبت موز بود سائۂ اندیشہ تو (جوابِ شکوہ)

ترمرغ سرائی خورش از خابجوئی سعادصدِ ردانہ بانجم زدہ منقار (ایک مقالہ)

قوی شدیم چہ شد

ناتواں شد یم چہ شد

چنیں شد یم چہ شد

یا چنان شد یم چہ شد

پہنچ گونہ دریں گلستان قرارے نیست

تو گربہار شدی ، ماخزاں شدیم چہ شد (میں اور تو)

کشاکش زم دگر ماتپ و تراش وخراش

ز خاک تیرہ دروں تابہ شیشہ جلی (ارتقاء)

ملک یمیں درہم و دینار و رخت و جنس

اسپ قمر سم و شتر وقاطر و خمار (صدیق)

اے آنکہ زنور گہر نظم فلک تاب

دامن بچراغ مہ و اخترز دہ بام (فردوس میں مکالمہ)

از غلامی فطرتِ آزاد رارسوا مکن

تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری (زندگی)

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا بادان کنند

می ندانی اول آن بنیادراویران کنند (دنیائے اسلام)

اے کہ شناسی خفی را از جلی ہشیار باش

اے گرفتار ابوبکر علی ہشیار باش — دنیائے اسلام

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار

ہر ز ماں پیش نظر لا یخلف المیعاد دار — دنیائے اسلام

چہ باید مرد راطبع بلندے مشرب نابے

دل گرمے نگہ پاک بینے جان بیتابے — طلوع اسلام

طلوع اسلام کے نو بند ہیں، آخری بند فارسی میں کہا گیا ہے۔

بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد

بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرا آمد

کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا

صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد

سرت گردم تو ہم قانون پیشین ساز دہ ساقی

کہ خیل نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد

کنا ر از زاہداں بر گیر و بیبا کانہ ساغر کش

پس ازمدت ازیں شاخ کہن بانگ ہزار آمد

بہ مشتاقاں حدیث خواجۂ بدر و حنین آور

تصرف ہائے پنہانش بہ چشمِ آشکار آمد

وگر شاخ خلیل از خون مانمناک می گردد

ببازار ار محبت نقدِ ما کامل عیار آمد

سرخاک شہیدے برگہائے لالہ می پاشم

کہ خونش بانہال ملتِ کا ساز گار آمد

فارسی اشعار پر تضمینیں اور گرہیں سب سے زیادہ حصہ سوم میں ہی ملتی ہیں۔ علامہ نے اس حصہ میں اکیس فارسی

شعروں پر تضمینیں کی ہیں۔ قلی بیگ ایسی شابور (وفات ۱۶۰۵) دکن کا مشہور فارسی گو شاعر تھا۔ علامہ نے اس کے اس شعر پر تضمین کی ہے۔

وفا آموختی از مابکادِ دیگراں کردی

ربودی گوہرے ازماشارِ دیگراں کردی

"نصیحت" کے عنوان سے جو نظم اس حصہ میں ملتی ہے وہ حافظ شیرازی کے اس شعر پر تضمین ہے

عاقبت منزل ماوادی خاموشاں است

حالیا غلغہ در گنبد افلاک انداز (۱۲)

"خطاب بہ جوانان اسلام" حضرت غنی کاشمیری کے مشہور و مقبول شعر پر تظمین ہے شعر یہ ہے۔

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تما شاکن

کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را (۱۳)

نظم "قرب سلطان" میں علامہ نے حافظ کی ایک غزل کے مندرجہ ذیل تین مصرے استعمال کیے ہیں۔

ہزار گونہ سخن دردھان و لب خاموش

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

بگیر بادہِ صافی بیا نگ چنگ بنوش (۱۴)

"تعلیم اوراس کے نتائج" علامہ عرشی کے اس شعر پر تظمین ہے

تخمِ دیگر بکف آدیم و بکاریم ز نو

کا نچہ کشتیم ز خجلت تو ان کرد درد

نظم "قرب سلطان" کی تضمین کے لیے حافظ کا یہ شعر چنا گیا

محل نورِ تجلّی است رائے نورِ شاہ

چو قرب او طلبی درصفائے نیت کوش (۱۵)

سرکشی باہر کہ کردی رام او باید شدن

شعلہ ساں از ہرکجابر خاستی آنجانشین

ابوطالب کلیم کے مندرجہ بالا شعر پر علامہ نے جو تضمین کی اس کا پہلا اور آخری شعر ی یہ ہے۔

خوب ہے تجھ کو اشعار صاحب یثرت کا پاس

کہ رہی ہے ، زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں

غافل اپنے آشیاں کو آ کے پھر آباد کر

نغمہ زن ہے طور معنی پر کلیم نکتہ بیں

"شبلی وحالی" کے عنوان سے فارسی کے اس شعر پر تضمین ہے

اکنوں کرادماغ کہ پرسدز باغباں

بلبل چہ گفت وگل چہ شنید و صبا چہ کرد

"ارتقاء" چھ اشعار کی خوبصورت نظم ہے اس کے آخر میں یہ فارسی شعر درج کیا گیا ہے۔

مغاں کہ دانہ انگور آب می سازند

سترہ می شکنند و آفتاب می سازند

"تہذیب حاضر" کے عنوان سے علامہ کی نظم فیضی کے ایک شعر پر تضمین ہے شعر یہ ہے۔

تو اے پروانہ ایں گرمی زشمع محفلے داریٰ

چومن در آتش خود سوزا گر سوزدلے واری

"عرفی " کے عنوان سے جو نظم علامہ نے کہی (وفات ۔۹۹۹ھ) کے ایک شعر پر تضمین ملاحظہ ہو۔

کسی کا شعلہ فریاد ہو ظلمت رہا کیونکر

گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

صدا تربت سے آئی ، شکوہ اہل جہاں کم گر

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی

حدی را تیز ترمی خواں پر محمل راگراں بینی

"ایک خط کے جواب میں" پانچ اشعار کی نظم ہے جو حافظ شیرازی کے شعر پر تضمین ہے فرماتے ہیں۔

ہوس بھی ہو تو نہیں مجھ میں ہمت تگ وتاز

حصول جاہ ہے وابستۂ مذاق تلاش

ہوائے بزم سلاطین دلیل مردہ دلی

کیا ہے حافظ رنگین و نوانے راز یہ پاش

گرت ہواست کہ باخضر ہم نشین باشی

نہاں ز چشم سکندر چو آب حیواں باش (۱۴)

علامہ نے میر رضی دانش کے شعر پر جو تضمین کی ہے اس کا نام "کفر اسلام" ہے۔

شعلہ نمرود ہے روشن زمانے میں تو کیا

شمع خود رامی گداز د درمیاں انجمن

نور ما چوں آتش سنگ از نظر پنہاں خوش است

"مسلمان اور تعلیم جدید" ملک قصی کے شعر پر تضمین ہے

رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے

واجب ہے صحرا گرد پر تعمیل فرمانِ خضر

لیکن نگاہ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی میری

رفتم کہ خار از پاکشم محل نہاں شداز نظر

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

صائب کے شعر پر علامہ نے چھ اشعار کی تضمین کی ہے صائب کا شعر اور اس پر تضمین کا آخری شعر یہ ہے۔

نہیں ضبط نوا ممکن تو اڑ جا اس گلستاں سے

کہ اس محفل سے خوشتر ہے کسی صحرا کی تنہائی

ہماں بہتر کہ لیلی در بیاباں جلوہ گر باشد

ندارد تنگنائے شہر تاب حسن صحرائی

علامہ نے حالی اور سعدی کے درمیان فردوس میں ایک مکالمہ کروایا ہے نظم کا آخری شعر سعدی کا ہے

خرمانتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں بافت ازاں پشم کہ ریشتم

مرزا عبدالقادر بیدل کے شعر پر علامہ نے جو تضمین کی اس کا نام "مذہب" رکھا گیا ہے۔

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش
کہتا مگر ہے فلسفہ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش
باہر کمال اند کے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدہ بے جنون مباش

تین اشعار کی ایک نظم اس شعر پر تضمین ہے۔

شہپرِ زاغ وزغن در بند قیدو صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند

نظم "دریوزہ خلافت" کی تضمین یوں ہے

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی
مرا از شکستن چناں عار نا ید
کہ از دیگر خواستن مومیائی

نظم "طلوع اسلام" میں ایک بند کے ٹیپ کا شعر یہ ہے۔

بیا پیدا خریدار است جان ناتوانے را
پس از مدت گزر افتاد برما کاروانے را

اس نظم میں آخری شعر حافظ شیرازی کا درج کیا گیا ہے۔

بیا تا گل بیفشانیم و مے درساغرا اندازیم

فلک راسقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

"ظریفانہ" حصہ میں علامہ کا مزاحیہ کلام ہے ایک نظم میں گائے اور اونٹ کی گفتگو نظم کی گئی ہے۔ اس کے آخر میں حافظ کا یہ شعر لایا گیا ہے۔

دلق حافظ بچہ ارزد بہ مے اش رنگین کن !

وانگہش مست و خراب ازرہ بازار بیار (۱۷)

۱۹۱۲ء کے بعد علامہ نے مستقلاً فارسی کو ہی ذریعہ اظہار بنالیا مثنوی رومی کے طرز پر آپ نے مثنوی اسرار خودی ۱۹۱۲ء میں کہنا شروع کی اور یہ ۱۹۱۵ء میں پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئی، اس کے بعد فارسی مجموعے رموز بے خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم،، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اور ارمغانِ حجاز کے ناموں سے چھپے، اس کے بعد علامہ کے صرف ڈھائی اردو مجموعے شائع ہوئے۔ جب کہ فارسی کے ارمغان حجاز سمیت سات دیوان طبع ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ کی شخصیت کی مثلث کا پہلا زاویہ کشمیری ذہین دوسرا زاویہ قلب مومن اور تیسرا زاویہ نوائے شیراز ہے۔

تنم گُلے ز خیابانِ جنتِ کشمیر (اقبال)

دل از حریم حجاز و نواز شیراز است

ماخذ جن سے مقالہ کی ترتیب میں استفادہ کیا گیا

۱۔	اقبال کامل	(عبدالسلام ندوی، طبع دوم)	اعظم گڑھ	۱۹۶۴ء
۲۔	اقبال نامہ	شیخ عطاءاللہ	لاہور	----
۳۔	اقبال نامہ	شیخ عطاءاللہ (ح ۲)	لاہور	----
۴۔	باقیات اقبال	عبدالواحد معینی	لاہور	۱۹۵۲ء
۵۔	دیوان حافظ	امیر کبیر	طہران	----
۶۔	دیوان غنی	سرینگر	ــــــ	جنوری ۱۹۶۴ء
۷۔	سرورِ رفتہ	غلام رسول مہر	لاہور	----

۸۔ فکرِ اقبال — خلیفہ عبدالحکیم (باردوم) — لاہور — ۱۹۶۱ء

۹۔ کلیات اقبال فارسی — شیخ غلام علی اینڈ سنز — لاہور — ۱۹۷۳ء

۱۰۔ کلیات اقبال اُردو — شیخ غلام علی اینڈ سنز — لاہور — ۱۹۷۷ء

۱۱۔ مقالات اقبال — عبدالواحد معینی — لاہور — ۱۹۶۳ء

حوالہ جات

۱۔ اقبال کامل صفحہ نمبر ۷

۲۔ اقبال نامہ صفحہ نمبر ۳۴۳

۳۔ فکر اقبال صفحہ نمبر ۱۳

۴۔ دیوان غنی صفحہ نمبر ۱۷

۵۔ سرودِ رفتہ صفحہ نمبر ۲۱۶

۶۔ ایضاً

۷۔ باقیات اقبال ص نمبر ۶۱

۸۔ ایضاً ص نمبر ۹۹

۹۔ ایضاً

۱۰۔ کلیات اقبال اردو ص نمبر ۱۶

۱۱۔ اقبال نامہ ج (۲) ص نمبر ۱۱۴

۱۲۔ دیوان حافظ ص ۱۹۳

۱۳۔ دیوانِ غنی ص نمبر ۸۵

۱۴۔ دیوان حافظ ص ۲۰۶۔۲۰۵

۱۵۔ دیوان حافظ ص نمبر ۲۰۵

۱۶۔ دیوانِ حافظ ص نمبر ۱۹۹

۱۷۔ دیوان حافظ ص نمبر ۱۸۳

نایاب مضامین و مقالات

''نوادرِ اقبال نمبر'' کے لئے بطور خاص

Lahore
5th Nov. 1916.

My dear Aziz,

I hear Mr. Girami is coming & it is hoped that he will reach Hosh. soon. Please persuade him to come over to Lahore. We are all very anxious to see him. Nawab Z. A. Khan who has not seen him before has more than once expressed a desire to make his acquaintance. So I hope that you will spare him for a few days & persuade him to come over to Lahore.

Yours Ever
Muhammad Iqbal

عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لا کے نام خط

افکارِ اقبال میں توحید کا ذکر

مقالہ محترمہ این میری شمل
ڈفل۔ڈی ایس سی پروفیسر
السنہ شرقیہ
یونیورسٹی آف بان (مغربی جرمنی)
(محترمہ نے یہ لیکچر شعبہ اُردو پشاور
یونیورسٹی میں دیا)

ایک امریکی مستشرق نے اقبال کی توصیف یوں کی ہے۔ ''وہ اس بات کی کوشش ہے کہ اسلامی عقائد کی بنیادی چیزوں ہی کو نئے سرے سے جدید (یعنی مغربی) افکار کی اصطلاحوں میں ملبوس کر کے پیش کیا جائے''۔

اور اس میں شک نہیں کہ اقبالی نظام۔ اگر ہم اسے ایک مکمل نظام شمار کریں تو۔ اصول توحید پر مبنی ہے۔ اس کا اعتراف کہ خدا ایک ہے جو انفرادی زندگیوں کی وحدت نیز نیم مذہبی نیم سیاسی معاشروں کی وحدت میں منعکس ہوتی ہے۔ اقبال نے اسے اس وقت سے ہی اپنا مطمح نظر بنا رکھا ہے جب سے کہ اس نے ''رموز'' لکھی۔ جس میں (ص ۱۹۵ اَپر) یہ معنی 'خیز' باب ہے۔

نصب العین امت محمد یہ حفظ و نشر توحید است

اگر ہم تاریخ مذاہب کے نقطۂ نظر سے مسئلہ توحید کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ توحید کا اعتراف مختلف مقدمات پر مبنی ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک ثانوی درجے کی توحید ہو سکتی ہے۔ جو تعدد آلہہ کے ایمان ہی سے رفتہ رفتہ ترقی پا کر برآمد ہوتی ہے جبکہ مفکر یہ خیال کرتے ہیں کہ جن مختلف و متعدد مظاہر کی تشریح کی گئی ہے۔ ان کے اندر ایک ہی حقیقت پائی جانی چاہیے اور یہ کہ وہ سارے مظاہر ایک ہی ربانی ذات کے وظائف ہیں۔ ایک اور توحید وہ ہے جب سالک اپنے عمیق ترین روحانی احوال میں یہ محسوس کرنے لگتا ہے وہ ساری چیزوں کے اصل اصول سے متحد ہو گیا ہے جس سے مختلف الوہیتیں نکلی ہیں۔ توحید کی ایک اور صورت وہ ہے جب دو قومیں اپنے معبودوں کو سیاسی اغراض سے ایک کر دیں۔ لیکن اس قسم کی توحید جو پرانے زمانے کے اکثر مذاہب کی، جو چاہے مصر کے ہوں یا ہندوستان کے، خصوصیت رہی ہے۔ ہمیشہ استنباط ہی کی جا سکتی ہے اور وحدت اور کثرت کے مابین صاف صاف امتیاز نہیں ہوتا۔ اور خدائے واحد کے علاوہ دیگر دیوتاؤں کا وجود بھی تسلیم ہوتا رہتا ہے۔ ورنہ یہ صرف انبیاء بنی اسرائیل اور مسیحیت

اور اسلام ہی کے افکار اور تعلیمات میں نظر آئے گا۔ کہ خدا کی وحدت مطلقہ کا ذہن میں تحقق ہو۔ یہ کہ اس ذات کے سوا انسان اب تک جتنی چیزوں کو پوجتا رہا ہے وہ سب باطل ہوں۔ اور یہ کہ اس خدا کے سوا۔ جس نے اپنے آپ کو افراد کی زندگی اور تاریخ میں ہویدا کیا ہے کسی اور کی عبادت نہ کی جانی چاہیے۔ تصوفی توحید میں ہر قسم کی حقیقت شامل ہوسکتی ہے کیونکہ خدا کے سوا کسی چیز کا وجود نہیں (لا موجود الا اللہ) اور یہ کہ ہر چیز اسی ذات پاک کی زندگی کا جز ہے لیکن نبوّی توحید ہمیشہ جامع و مانع ہوتی ہے۔ اور اس لئے (توریت میں) ''تو فلاں کام نہ کرے گا۔'' کی پر شکوہ نہی و ممانعت ملتی ہے، نیز اسی لئے اسلامی کلمۂ توحید کا آغاز منفی طور پر ''لا الہ'' کے ذریعے سے ہوتا ہے۔

اگر نقطہ نظر یہ رہے تو ہمیں معلوم ہوسکتا ہے کہ اقبال کے منظوم کلام میں کلمۂ توحید کو کیوں اتنی اہم جگہ دی گئی ہے۔ یہ کلمہ ہی اسلام کی قوت و طاقت کی علامت ہے اور اقبال کی رائے میں وہ اسلام کا خلاصہ بھی ہے۔ ''اسرار'' کی تالیف سے لیکر آخر تک ہمیشہ اور غیر منقطع طور وہ کلمہ توحید کے الفاظ کی تعریف و توصیف کے راگ گائے چلا جاتا ہے۔ (پس چہ باید کرصفحہ ۳۳) میں وہ اس کلمے کو ''مومن کے ہاتھ میں ایک تلوار'' قرار دیتا ہے لیکن لکیر کے فقیر اور متکلمیت پرست اربابِ سے مخاطب ہوکر وہ شکوہ بھی کرتے ہیں۔ کہ لفظ توحید کی علم کلام میں بال کی کھال نکالی جانے لگی ہے۔ یہ کہ عجلت پسند اسلام کہ جگہ تو یہ لاحاصل جدل کی طرف منعطف ہوگئی ہے، اور یہ کہ ''لا الـــہ۔۔۔'' کے حقیقی معنیٰ کم وبیش بے نتیجہ الہیاتی نازک مباحث کے انبار میں دفن ہوگئے ہیں۔ (بال جبریل ۵۰)

قلندر جز دو حرف لا الہٰ کچھ بھی نہیں رکھتا

فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

اقبال کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ لوگوں کو توحید کی تعمیری فہم پر مائل کرے۔

گر بگر د سوز و تاب از لا الہٰ

جز بکام او نہ گردد مہر و ماہ

یہ کہ ساری مخلوق اسی انسان کی اطاعت کرے گی۔ جو خدا اور صرف خدا کی اطاعت کرتا ہو۔

کلمہ توحید جس میں دو متقابل جملے ہیں نہ صرف اسلامی فنونِ لطیفہ کی ترقی میں ایک نہایت اہم حصہ لیتا اور اندلس سے انڈونیشیاء تک ایک مرکزی نقش کا کام دیتا ہے۔ بلکہ بہت ابتدائی زمانے ہی سے الہیات، تصوف نیز شاعری کا ذوق رکھنے والوں کو اس میں ایک بڑی کشش محسوس ہوئی۔ اور انہیں ''لا'' اور

''الا'' کے متضاد الفاظ کے اجتماع میں ایک عمیق روحانی معنے نظر آتا ہے جب وہ اس کلمہ توحید کو اپنی شاعری میں ایک خصوصی جگہ عطا کرتا ہے۔

لا و الا فتح باب کائنات　　　لا و الا احتساب کائنات

حرکت نہ لا زائد از الا سکون　　　ہر دو تقدیر جہان کاف ونون

ایک مرتبہ وہ ''اسرار'' میں (۸۶۹) صوفیانہ ''نفی'' کی اہمیت پر خاص زور دیتا ہے۔

فارغ از بند زن واولا دشد　　　ہر کہ در اقلیم لا آباد شد

می کند از ماسوا قطعِ نظر

خلوت میں ماسوا کو جگہ نہیں ملتی۔ بس خدا ہی خدا ہوتا ہے۔ صوفیوں کے مطابق یہ حال جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ کیونکہ آپ نے اپنی روحانی زندگی کے آغاز میں دنیا کی ہر چیز سے منہ موڑ کر غارِ حرا میں خلوت گزینی اختیار فرمائی تھی۔ بلکہ خود حضرت ابراہیمؑ کو بھی جو اس حال میں ہیں۔　　　می نہد ساطور بر حلق پسر

لیکن اقبال تصوفی نہیں، نبوتی ''لا'' کا قائل ہے جس کے متعلق تقابل ادیان کے ایک ممتاز یوروپی ماہر نے بیان کیا ہے۔ ''کسی نہیں (لا) کے بغیر کوئی صحیح ہاں (الا) ہو نہیں سکتا۔ ورنہ ہر وہ چیز جو راست وخوب سے انکار کرے، اس کو فنا کرے، ذلیل کرے۔ اور تاخیر میں ڈالے باقی رہ جائیگی۔ اور نہ کوئی اس پر وار کر سکے گا۔ اور نہ اسے منسوخ کر سکے گا۔ اسی لئے فرد کی اخلاقی بہبود، مذہب کے ارتقاء اور تاریخ نسلِ انسانی کے مفاد کی خاطر ایک نہیں (لا) کی ضرروت ہوتی ہے۔''

اقبال نے اپنے آپ کو اس حال میں پا کر کہا تھا۔

پیش غیر اللہ لا گفتن حیات

تازہ از ہنگامہ او کائنات

یہ ''نہیں'' ہی حرکت کی اصل ہے؟ جس طرح مثبت اور منفی قطبوں کے بغیر برقی رو وجود میں نہیں آسکتی اسی طرح حیات بخش طغیانیوں کے لئے ضروری ہے کہ نفی سے اثبات کی طرف جائیں۔ جیسا کہ عطار نے اپنی ایک نظم میں بیان کیا تھا۔ جیسا کہ (ضرب کلیم ۶۰ میں) بیان ہوا ہے۔

نہاد زندگی میں ابتدا لا انتہا الا

پیام موت ہے جب لا ہوا الا سے بیگانہ

یہ نکتہ ذہن میں رہے تو ہم جاوید نامے میں بیان شدہ لا اور الا کو سمجھ سکیں گے۔ جو جمال الدین افغانی کے روسیوں سے مخاطب پیام میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہی محاورہ نیطشے کے متعلق بھی برتا گیا ہے۔ یہ کوئی الفاظ کا کھیل نہیں ہے بلکہ شاعر اس محاورے کے استعمال سے اپنی اس عظیم ہمدردی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جو اسے ان لوگوں سے ہے۔ جن کے متعلق وہ خیال کرتا ہے۔ کہ وہ عیسائی مذہب اور مغربی تہذیت سے منکر ہو گئے ہیں۔ اور اسلام سے قریب تر ہو چلے تو ہیں۔ لیکن اس آخری حیات بخش اقدام سے قاصر رہے ہیں جو کہ خدا کے اعتراف پر مشتمل ہے اور اسی لئے روحانی ابدی موت کے مستحق ہو گئے ہیں۔

لیکن یہ کون خدا ہے جس کی وحدانیت کے اعتراف کی ضرورت ہے؟ اس کا تصور کس طرح کیا جائے جبکہ انسان کا تصور اس تک پہنچ نہیں سکتا؟ علم کلام نے اس کی کوشش کی کہ خدا اور اس کی تمام مختلف صفات کی تعریف وتحدید جہاں تک ممکن ہو معقول انداز میں کی جائے۔ صوفی اس کے حسن اور عظمت کا راگ الاپتے رہے۔ فلسفیوں نے خدا کو کم وبیش محض ایک سبب اول یا سلبی اصل قرار دیا۔ جس کے باعث خدا کا قرآنی تصور کہ وہ زندہ، فاعل، حی وقیوم ہے۔ بڑی حد تک بے اثر ہو گیا۔ اقبال نے عقل پرستوں کی تشریحوں، نیز صوفیوں کے خیال آرائیوں کو پس پشت ڈالکر براہِ راست قرآنی تعلیم سے سلسلہ جوڑا اور کہا۔ ''کہ خدا اول سے آخر تک ایک ''خودی'' ہے اس کا نام ''اللہ'' اس کی شخصی صفات کا مظاہرہ کرتا ہے۔ سورۂ اخلاص سے بھی یہ استدلال کیا جاسکتا ہے خدا ایک ''خودی'' ہے اقبال نے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ خدا نہ صرف ایک شخصیت ہے بلکہ سب سے زیادہ مکمل شخصیت ہے۔

اقبال کے لئے اصل مسئلہ یہ تھا کہ یہ بے نیاز حقیقت، یہ غنی، اور یہ غیر محدود عظیم ذات کس طرح ایک شخصیت کی حامل ہو سکتی ہے؟ اقبال پر الزام لگایا گیا ہے کہ اس سلسلے میں ایک غیر محدود شخصیت کا نام لینے کے باعث اس نے ایک غیر منطقی تصور کا استعمال کیا، کیونکہ یہ دونوں تصور باہمی متعارض ہیں۔ جو بھی ہو، جدید عیسائی یورپ کے بعض رہنما مفکر، جنہوں نے اقبال کی طرح یہ کوشش کی کہ خدا کے متعلق انبیاء کی تعلیم کو دوبارہ قابل قدر قرار دیں؟ وہ بھی بالکل اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ فریدرش فون ہیوگل لکھتا ہے۔'' یہ واقعہ ہے کہ ہم بغیر کسی جھجھک کے۔۔۔ بھی قول قبول کر سکتے ہیں کہ نہ صرف شخصیت اور غیر محدودیت میں تعرض نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ساری محدود اشیاء کی شخصیتوں کے متعلق ثابت کیا جا سکتا ہے۔ کہ ان کی شخصیت خاص اس وجہ سے ناقص ہے کہ وہ اشیاء محدود ہیں اور یہ کہ مکمل شخصیت صرف ایک غیر محدود ذات ہی کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔ نیز یہ کہ محدود اشیاء کو تقریبی طور ہی پر یہ بات حاصل ہوتی ہے۔

جس طرح اقبال نے خدا کی شخصیت سے متاصف ہونے کو خدا کے اس وعدے کے ذریعے سے ثابت کیا تھا کہ ''اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ' (مجھے پکارو، میں جواب دوں گا) اسی طرح جدید عیسائی الٰہیات اور فلسفے میں بھی یہی معنٰے اور اسی پر زور دیا ہے کہ یہ ربانی وصف ہی کے باعث ہے کہ اسے ''تو'' (اَنْتَ) سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ احمقانہ بات ہوگی کہ خدا کے ساتھ ایک واقعہ تماس پیدا ہو سکے۔ مکمل طور پر جو خالص اور صحیح مذہبی تعلیم یہ ہے کہ ملاقات شخص بہ شخص قسم کی ہو۔ اس طرح نظر آئیگا کہ اقبال نے ربانی شخصیت پر جو زور دیا ہے اسی کے متوازی خیالات ہم عصر مسیحی مذہب ایک مختلف میلانات میں بھی ملیں گے۔ نیز دیگر مذاہب میں بھی۔

البتہ فرق یہ ہے کہ قدیم زمانے کے اسلامی تصوف نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ حقیقی شخصیت صرف ایسے خدا کو حاصل ہوسکیتی ہے جو ایک ہو، اور جو میں (انا) کہ سکے۔ لیکن اقبال نے یہ تسلیم کیا ہے کہ دیگر انانیتیں بھی ہمہ گیر ربانی انا کے ساتھ ساتھ، بلکہ شاید اس کے اندر پائی جاسکتی ہیں۔ اسی بیان میں بھی ایک تضاد نظر آئیگا۔ لیکن ان چھوٹی انانیتوں کے متعلق اقبال کا تصور یہ ہے کہ زندگی کا نغمہ اساسی انہی کے مجموعے سے عبارت ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح جرمن فلسفی روڈولف آئی کن نے بیان کیا ہے۔ مطلب یہ کے کہ انفرادی انانیتوں کو شخصیت کا وصف کی ہمہ گیر اور شخصیت کی عامل زندگی ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

ربانی شخصیت کا جو تصور اقبال کے ذہن میں ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ بیک وقت ہر چیز پر محیط بھی ہے اور ماروا کے ادراک بھی ہے اور یہی وہ تصور ہے جو سارے مذاہب کے اعلٰے مفکروں نے بالآخر اختیار کیا ہے۔ وہ ہر چیز پر محیط ہے اس معنٰے میں کہ وہ انفرادی ''خودی'' کی اصل حقیقت ہے، اور وہ ماورائے ادراک اس معنے میں ہے کہ وہ ہمارے حواس کی رسائی سے باہر ہے، وہ مختلف حیثیتوں سے ہر موضوع و معروض میں موجود و کارفرما ہے۔ اور ساتھ ہی ان سب سے مکمل ممتاز اور مختلف بھی ہے۔ یہ خدا کے متعلق ایک اہم تصور ہے کہ اس کی لامحدودیت عمق میں ہے، عرض و وسعت میں نہیں۔ یہ تصور بھی مذکورہ بالا جرمن فاضل فون ہیوگل کے الٰہیاتی نظام سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ صوفی مولفوں سے خدا کی صفات کے حیران کن تنوع، و تعدد پر ایک انتھک جوش سے بحث کی ہے۔ لیکن اقبال کے ان کے برخلاف اس کی شاذ ہی کوشش کی ہے کہ اپنی شاعری میں خدا کی توصیف کرے صرف ''گلشن راز جدید'' میں ہمیں اس کی طرف ایک اشارہ ملتا ہے (گلشن راز ۲۱۶)

درونش خالی از بالا و زیر است

دلے بیرون او وسعت پذیر است

بظاہر اس نے مناسب یہ سمجھا کہ اپنی زوردار اور اکثر جذبات انگیز غنیائی نظموں میں انسان اور خدا کے انتہائی شخصی روابط کا اظہار کرے اگر وہ خدا کے تصور کی شاعرانہ وصف آرائی کی کوشش کرتا تو اُس کے مذہبی خیالات اس خوبی سے منعکس نہ ہو سکتے۔ چنانچہ اس کی نظر میں خدا ایک، ہر وقت کارفرما رہنے والی ذات ہے، جو ''کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ'' ہے اور جس طرح غیر محدود زندگی میں کائنات محض ایک گزرنے والا منظر، ایک ''شانُ'' کی حیثیت رکھتی ہے مگر پھر بھی بے نہایت ہے، کیونکہ خدا کی تخلیقی قوت عمیق طور پر غیر محدود ہے، جیسا کہ اقبال نے آئنسٹائم کے نظریوں کے متعلق رائے ظاہر کی ہے۔ اقبال کے مطابق تخلیق ہر لمحے نئی ہوتی ہے۔ اور اس طرح اقبال اشعریوں کے خیالات زیادہ منظم شکل میں پیش کرتا ہے۔ اور یہ کہ زندگی میں ہر وقت تازہ رہنے کی صلاحیتیں ہیں جو عمیق ربانی زندگی کی اتھاہ گہرائیوں سے دستیاب ہوتی ہیں اور اپنے آپ کا تسلسل پذیر وقت میں مظاہرہ کرتی رہتی ہیں۔

قرآن نے خدا کے متعلق ''نور'' کا جو رمز استعمال کیا ہے اس کو اقبال نے بھی بے جھجک برتا ہے۔ لیکن اس کی مراد اس سے یہ نہیں ہوتی کہ خدا کا ہمہ گیر وجود ہر جائی ہو، بلکہ اس معنے میں کہ وہ ایک ذات مطلق ہے (زبور عجم، گلشن راز)

مجو مطلق دریں دیر مکافات
کہ مطلق نیست جز نور سماوات

اس طرح وہ میر دردؔ کے تصورات سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ میر دردؔ دہلی جو اٹھارویں صدی عیسوی میں نقشبندی مجددی سلسلے کے ایک مشہور صوفی گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنی تالیف ''علم الکتاب'' کا ایک پورا باب اس استعارۂ نور سے مختص کیا ہے۔ اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس رمز سے خدا کی ذات کا مطلق تیز ہو جا ہونا مراد ہے، نیز یہ کہ وہ خدا کے ہر چیز پر محیط ہونے اور ساتھ ہی ماورائے ادراک ہونے ہر پر دال ہے۔

اگرچہ اقبال نے اپنے بعض شعروں میں لا موجود الا اللہ کا قدیم کلمہ شہادت استعمال کیا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس کی کوشش یہ رہی ہے کہ خدا ایک زندہ اور عامل ذات ہے لیکن ساتھ ہی اقبال کو عقیدہ ربانی کا خطرہ محسوس ہوا جو خدا کے متعلق ''زندگی'' کا لفظ استعمال کرنے سے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس کی رائے میں خدا کے سلسلے میں ''تا حال نشدہ'' کی صفت کے استعمال سے مراد یہ ہے ''اس کی ذات کی تخلیقی قوتیں تحقق پذیر ہونے سے کبھی قاصر نہیں رہتیں۔ اور یہ کہ اس ساری کار فرمائی میں اس کی ذات مکملیت کو برقرار رکھتی ہے''۔ گوئٹے کے مشہور بیت میں بھی؛ یہی بیان ہوا ہے۔

ہر چیز کی تلاش ، ہر چیز کی جو یائی

یہی مولا کے پاک میں دائمی سکون ہے

وہ ہیلینی یونانیوں کے تصور خدا پر احتجاج کرتا ہے کیونکہ انہوں نے انبیاء کے مذاہب میں بیان شدہ حی و قیوم خدا کی ایک متحرک سبب اول میں تبدیل کر دیا۔ اقبال کو ابتدا نیطشے سے جو ہمدردی ہوگی اس کی وجہ ایک حد تک یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس جرمن فلسفی نے بھی ہیلینی یونانیوں کے رنگ میں رنگے ہوئے مسیحیوں کے ہاں کے خدا پر اعتراض کیا تھا۔ اپنی نوبت پر اقبال نے یہ چاہا کہ اصلاحی تصور خدا کو ان بے حرکت بنانے والے اثرات سے بچائے۔ اس کی نظر میں خدا ایک قوت ہے۔ ۱۹۱۰ء میں اقبال نے لکھ دیا تھا کہ ''مجھے خدا کی محبت سے انکار نہیں، لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے تاریخی احساسات کے لحاظ سے خدا کی بہتر توصیف یہ ہے کہ وہ ایک قوت ہے''

یہ ربانی شخصیت جو قوت متعلقہ ہے، جو حسب خواہش کسی چیز کی تخلیق کر کے اسے عدم سے وجود میں لانے کی قدرت رکھتی ہے۔ جس کی زندگی تخلیق کاری ہے۔ جو اپنی غیر محدود توانائیوں کی فطرت اور تاریخ میں تحقق پذیر کرتی ہے۔ یہی وہ خدا ہے جو انبیاء کے لائے ہوئے مذہب میں بیان ہوا ہے۔ اور اس کو فلسفیوں کے ''حَیوِی'' مکتب میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ خدا کے ایک زندہ شخصیت کے حامل ہونے کا تصور ہی وہ چیز ہے جس سے اقبال کا سارا فلسفہ شروع ہوتا ہے۔ اور وہ اس کے نظریے کی بھی اساس ہے، کہ انسان بھی ایک واقع شخص ہے جس میں ترقی کی صلاحیتیں ہیں۔ جسے خدا نے ''اعلیٰ صورت'' خلق کیا ہے۔ جو خدا سے قریب ترین بھی ہے لیکن ساتھ ہی حد سے زیادہ خطرے میں گرفتار بھی ہے۔ اسی طرح خدا کا یہ تصور اس نمونے کا بھی کام دیتا ہے جس میں مسلمان قوم کو متشکل ہونا چاہیے، کیونکہ اس طرح سے ہی وہ خلیفۃ اللہ بھی بن سکتی ہے، اس کی روحانی وحدت بھی برقرار رہ سکتی ہے، اور نیند اور تھکن سے محفوظ بھی ہو سکتی ہے۔

نیا ساید ز کار آفرینش

کہ خواب و خستگی بر وے حرام است

یہ صاحب نصب العین فرد اور امت جو مسلسل اور دائمی طور پر زندہ اور تخلیق کار ربانی اصول حیات کے ساتھ تماس رکھ سکتے ہیں، صحیح نبوتی روایات کے مطابق ہر بت پرستی اور شرک سے انکار و اجتناب کرتے ہیں، اور حقیقی واحد خدا ہی کو انسان کے دل اور زندگی میں پوجنے کا موقع دیتے ہیں۔

علامہ اقبال کا ایک شعر

خودی کوکر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خُدا بندہ سے خود پوچھے بتا تری رضا کیا ہے

آغازِ سخن:۔

اس شعر کا مطلب سمجھنے میں جو دشواری لوگوں کو پیش آتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ عام طور سے لوگوں کو خودی کے فلسفہ سے واقفیت نہیں ہے۔ علامہؒ نے اس فلسفہ کو ۱۹۱۴ء میں پہلے پہل اپنی زندہ جاوید کتاب اسرارِ خودی میں پیش کیا تھا لیکن چوتھائی صدی گزر جانے کے بعد بھی بہت کم لوگ اس کی حقیقت سے آشنا ہو سکے ہیں اور اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں۔

پروفیسر محمد یوسف خان سلیم چشتی
بی۔اے آنرز

(ا) ہندوستان کے باشندوں کا علمی معیار بہت پست ہے۔ اس لیے دقیق فلسفیانہ امور کی طرف توجہ بہت مشکل سے ہوسکتی ہے۔

(ب) مسلمانوں کا علمی معیار اور ذوقِ تدبر و تفکر اور بھی پست ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ جوہر عظمیٰ ان میں مفقود ہو چکا ہے۔ چنانچہ خود علامہؒ نے بسبیل تذکرہ ایک مرتبہ راقم الحروف سے فرمایا تھا کہ Muslims of India have ceased to think. یعنی ہندی مسلمانوں نے غور و فکر کی عادت بالکل ترک کردی ہے۔

(ج) علامہؒ کا بیشتر کلام جس میں یہ مسئلہ بیان ہوا ہے مثلاً اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ یہ سب کتابیں فارسی میں ہیں اور ہندیوں کو اس زبان سے تعلق روز بروز کم ہوتا جاتا ہے۔ بالِ جبریل اور ضربِ کلیم اگرچہ اُردو میں ہیں۔ لیکن خیالات کی بلندی نے ان کتابوں کو بھی فارسی کا ہم پلہ بنا دیا ہے۔ اکثر لوگ زبان تو سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن خیالات کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

(د) بہت سے لوگ ابھی تک اقبالؒ کو ایک شاعر ہی سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ اُن کا کلام اُن کا فلسفہ سمجھنے کے لیے نہیں پڑھتے بلکہ اشعار سے لطف اندوز ہونے کے لیے پڑھتے ہیں۔

(ہ) سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ خودی کا علم ادراک پر منحصر نہیں۔ بلکہ وجدان سے حاصل ہوسکتا ہے خودی کیا ہے؟ یہ بات عقل یا ادراک سے معلوم نہیں ہوسکتی بلکہ خود شناسی سے معلوم ہوسکتی ہے اور خود شناسی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ علامہؒ فرماتے ہیں

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

خود شناسی کا ذریعہ عقل نہیں بلکہ خود اپنا دل ہے

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا ، نہ بن ، اپنا تو بن

یہی حال توحید کا ہے کہ محض زبان سے لا الہ الا اللہ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جب تک دل اس کی صداقت پر گواہی نہ دے۔

تو عرب ہو یا عجم ہو تر لا اِلٰہ اِلّا
لغتِ غریب ، جب تک ترا دل نہ دے گواہی

معارفِ قرآنی کا حصول بھی، اسی پر منحصر ہے۔ کہ دل بیدا ہو جائے ورنہ لاکھ تفسیریں پڑھو کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازیؒ ، نہ صاحبِ کشافؒ

خودی کیا ہے؟ یہ بات کسی کتاب کے مطالعہ سے، کسی لیکچر سے یا کسی منطقی استدلال سے معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے خود جدوجہد کرنی چاہیے۔ اور مسلسل جدوجہد

تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

خودشناسی کے باب میں تخمین وقیاس کو دخل نہیں ہے

مشام تیز سے صحرا میں ملتا ہے نشاں اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

خودشناسی کی دولت، بڑی کوشش سے، بلکہ جانکنی سے ہاتھ آتی ہے

ضربتے باید کہ جانِ خفتہ بر خیزد زخاک
نالہ کے بے زخمہ از تارِ رباب آید بروں

خودشناسی کے لیے سب سے کنارہ کشی کرنی پڑتی ہے

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب
ہم زخدا خودی طلب، ہم ز خودی خدا طلب

یہ کیوں؟ اس لیے کہ جو شخص خودشناس ہو جاتا ہے وہ خداشناس بھی ہو جاتا ہے۔

"مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ"

"جس کو خودی کی معرفت حاصل ہوگئی۔ اُسے خدا کی معرفت حاصل ہوگئی"

ان چند تمہیدی کلمات کے بعد اب ہم اس شعر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

خودی کی تعریف:۔

خودی، جیسا کہ تمہید میں لکھ آیا ہوں علامہؒ کے فلسفہ کا مرکزی نقطہ ہے اور اُن کے تمام افکار اسی نقطہ کے گرد گردش

کرتے رہتے ہیں۔ یہ شعر خودی کی معراج کی تصویر ہے اور اس کے سمجھنے سے پہلے خودی کو بقدرِ استطاعتِ فہم، بیان کرنا ضروری ہے۔

خودی کے متعلق، تمہید میں جو کچھ بیان کر چکا ہوں اُسے مدنظر رکھ کر، اس مضمون کو پڑھیے یعنی یہ تو میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ خودی کی حقیقت لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اس کا تعلق وجدان (Intuition) سے ہے نہ کہ ادراک سے۔ لیکن الفاظ کے ذریعہ سے جو کچھ سمجھایا جا سکتا ہے وہ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

خدا اور خودی تو برطرف، انسان بعض کیفیات کا اظہار بھی بذریعہ الفاظ نہیں کر سکتا۔ مثلاً آپ نظیریؔ، یا غالبؔ کے ایک شعر کو سن کر سر دھننے لگتے ہیں اور وجد میں آجاتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص آپ سے سوال کرے کہ اس وجدانی کیفیت کو لفظوں میں بیان کیجئے تو آپ ہرگز کامیاب نہ ہو سکیں گے بلکہ اس مصرع پر اکتفا کریں گے

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

خدا کیا ہے؟ خودی کیا ہے یہ سمجھنے سمجھانے کی باتیں نہیں ہیں کیونکہ علم کا مدار حواس خمسہ ظاہری پر ہے اور یہ دونوں حقائق، انسانی حواس کی دسترس سے بالاتر ہیں۔ یہ تو دریافت کرنے کی باتیں یعنی عرفان اور وجدان سے تعلق رکھتی ہیں۔ بہرحال بقدرِ ظرف لفظوں میں اس کا اظہار کرتا ہوں اور یہ صراحت اس لیے کر دی ہے کہ کوئی صاحب مجھ پر تناقض کا الزام عائد نہ کر دیں۔

خودی کی تعریف:۔

اس اصطلاح کو خود بینی، خود پرستی یا تکبر اور غرور سے کوئی نسبت یا علاقہ نہیں ہے جیسا کہ ابتدا میں علامہؒ کے بعض عجلت پسند معترضین کو مغالطہ ہو گیا تھا اور انہوں نے بلا تامل علامہؒ پر یہ اعتراض وارد کر دیا تھا کہ علامہؒ مسلمانوں کو خود بینی اور تکبر کی تعلیم دیتے ہیں۔ خودی سے علامہؒ کی مراد ہے نفسِ ناطقہ یا ذات یا جوہرِ انسانی یا شخصیت یا انا جسے انگریزی میں Self یا I-ness یا ego کہتے ہیں مغالطہ کی وجہ یہ ہوئی کہ اردو میں لفظ خودی بمعنی خود بینی، تکبر یا غرور مستعمل ہے چنانچہ ہم بولتے ہیں "اسکے دماغ میں بڑی خودی سمائی ہوئی ہے" یہاں خودی سے غرور یا گھمنڈ مراد ہے لیکن علامہؒ نے اس لفظ کو بطور اصطلاح استعمال کیا ہے اور وضاحت کے لیے اسرار خودی کے دیباچہ میں محسن تاثیرؔ کا ایک شعر بھی بطور سند پیش کیا ہے

غریق قلزم وحدت، دم از خودی نزند
بود محال، کشیدن میانِ آب نفس

خودی بقول علامہ اقبالؒ "شعورِ انسانی کا وہ نقطۂ روشن ہے جس سے تمام انسانی تخیلات، جذبات، احساسات اور

میلانات زندگی اور روشنی حاصل کرتے ہیں۔ خودی ایک مخفی بلکہ پر اسرار شے ہے لیکن اس کی بدولت فطرت انسانی کی گونا گوں اور غیر محدود کیفیات میں ربط و نظام پیدا ہوتا ہے۔ خودی ایک لطیفۂ ربانی ہے۔، اپنے عمل کے اعتبار سے ہویدا اور ظاہر ہے لیکن اپنی حقیقت کی رو سے مخفی اور پوشیدہ ہے۔ اسی کی بدولت، انسان مظاہر فطرت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ مگر خودی ، بذاتِ خود، غیر مشہور ہے یعنی، آنکھ سے نظر نہیں آسکتی۔ خودی ایک حقیقت Reality ہے اور اگرچہ مخلوق ہے مگر عمل کی بدولت، لازوال ہوسکتی ہے۔ چنانچہ علامہؒ فرماتے ہیں

ازاں مرگے کہ پیش آید چہ باک است
خودی چوں پختہ شد از مرگ پاک است

آنے والی موت سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خودی جب پختہ ہو جاتی ہے تو پھر غیر فانی اور لازوال بن جاتی ہے (اس لیے خودی کو پختہ کرلو)

"خودی، بقول علامہ مرحوم ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے اور کائنات کے ہر فرد میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے اس کے مدراج مختلف ہیں۔ مثلاً جمادات، نباتات اور حیوانات، چوتھے درجہ یعنی مرتبۂ انسانیت میں آکر، خودی صاحبِ شعور ہو جاتی ہے (Self Conscious) اور اب یہ کام انسان کا ہے کہ وہ اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچائے۔ حضور سرورِ کائنات ﷺ کی بعثت اور قرآن مجید کے نزول کا یہی مقصد ہے"

یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید نازل ہی اس لیے فرمایا تھا کہ انسان، اس کے اتباع سے اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچا سکے۔

اپنی تصانیف میں علامہؒ نے خودی کی حقیقت اور ماہیت کی توضیح میں جو کچھ لکھا ہے۔ اگر اس کو تمام وکمال اس جگہ نقل کیا جائے تو بلا مبالغہ ایک کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ اس لیے میں چند اشارات پر اکتفا کروں گا، اقبالؔ اور خودی کے موضوع پر میں ایک مستقل کتاب لکھنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے تیاری میں مصروف ہوں اگر خداوندِ تعالیٰ کو منظور ہے تو ایک نہ ایک دن یہ خدمت بھی انجام دے سکوں گا۔

(۱) خودی نظامِ کائنات کی اصل و بنیاد ہے۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہرچہ می بینی ز اسرارِ خودی است

ہر شے میں خودی پائی جاتی ہے اور جو کچھ نظر آتا ہے وہ خودی ہی کا کرشمہ ہے۔

صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او
غیر او پیدا ست از اثباتِ او

خودی میں صد ہا جہاں پوشیدہ ہیں اور اس کے اثبات سے اس کے غیر کا ثبوت ملتا ہے۔ یعنی جب، میں یہ کہتا ہوں کہ میں یوسفؔ ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں حفیظ اللہؔ یا محمد احسانؔ نہیں ہوں۔ یہ اور ہیں میں اور ہوں یعنی دونوں میرے غیر ہیں۔

می شود از بہرِ اغراضِ عمل
عامل و معمول و اسباب و علل

عمل اور فعل کی خاطر یہی خودی کبھی فاعل ہوتی ہے کبھی مفعول اور کبھی علت اور کبھی معلول، عرضیکہ مختلف حیثیات اختیار کرتی رہتی ہے۔

وانمودن خویش را خوئے خودی است
خفتہ در ہر ذرہ نیروے خودی است

اپنے آپ کو ظاہر کرنا، خودی کا خاصہ ذاتی ہے یعنی اس کی ذات کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے آپ کو ظاہر کرے اور ہر ذرہ میں خودی کی طاقت پوشیدہ ہے۔

چوں حیات عالم از زورِ خودی است
پس بقدرِ استواری زندگی است

دنیا میں ہر شے کی زندگی، خودی کی طاقت پر منحصر ہے۔ اس لیے جس چیز میں خودی زیادہ طاقتور ہوگی اس میں زندگی بھی زیادہ ہوگی۔

(ب) خودی نورانی اور غیر مادی شے ہے۔

درونِ سینۂ آدم چہ نور است
چہ نور است ایں کہ غیب او حضور است

انسان کے سینہ میں ایک نور ہے جو عجیب و غریب ہے کہ آنکھ سے نظر نہیں آتا مگر موجود ہے یعنی خودی ایک لطیفۂ نورانی ہے۔

چہ نورے جانفروزے سینہ تابے
نیرزد با شعاعش آفتابے

یہ نور جانفروز اور سینہ کو منور کرنے والا ہے۔ اور آفتاب کی شعاع سے زیادہ قیمتی ہے۔

بخاک آلودہ و پاک از مکان است
بہ بند روز و شب، پاک از زمان است

خودی اگرچہ جسم سے وابستہ ہے لیکن مادہ کی طرح کسی مکان میں نہیں ہے اور اگرچہ زمانہ اُس پر اثر انداز ہوتا ہے تاہم زمانہ کی قید سے آزاد ہے

زمین و آسمان اورا مقامے
میانِ کاروان تنہا خرامے

زمین و آسمان اس کے مقامات ہیں اور اگرچہ دنیا میں ہے لیکن سب سے جدا ہے۔

ازو ابلیس و آدم را نمودے
ازو ابلیس و آدم را کشودے

ابلیس اور آدم کی نمود اُسی پر موقوف ہے اور ان کی کارگزاری بھی۔

درون شیشہ او روزگار است
ولے برما بتدریج آشکار است

اس خودی میں تمام زمانہ پوشیدہ ہے لیکن ہم پر بتدریج آشکار ہوتا ہے۔

(ج) کمال خودی یہ ہے کہ وہ اپنے مرتبۂ ذات میں مستقل ہو۔

خودی اندر خودی گنجد محال است
خودی را عین خود بودن کمال است

یعنی ایک فرد کی خودی، دوسرے فرد کی خودی میں نہیں سما سکتی۔ ہر خودی بذات خود اپنا مستقل وجود رکھتی ہے اور یہی اس کا کمال ہے۔

(د) خودی ایک حقیقت ہے اور لازوال بن سکتی ہے۔

خودی را حق بداں باطل مپندار

خودی را کشتِ بے حاصل مپندار

خودی حق ہے، اس کو باطل مت سمجھو، اور نہ وہ کشتِ بے حاصل ہے۔ یعنی ویدانت کا یہ اصول کہ خودی باطل ہے، غلط ہے، خودی باطل نہیں۔ بلکہ حق ہے اور ایک مستقل وجود رکھتی ہے دھوکہ نہیں ہے۔

خودی چوں پختہ گرد و لازوال است

فراقِ عاشقاں عین وصال است

اگر کوئی شخص (قرآنی اصولوں کی اتباع کی بدولت) اپنی خودی کو پختہ کر لے تو پھر لازوال ہو جائے گا یعنی اس کی خودی غیر فانی ہو جائے گی۔ عاشقوں کے لیے فراق دراصل وصال کا حکم رکھتا ہے۔ یعنی فراق کی بدولت، عاشق اپنے اندر پختگی پیدا کر سکتا ہے اور یہ پختگی گویا وصال معشوق ہے۔ اسی دقیق مضمون کو علامہ نے اس طرح پیش کیا ہے۔

تُو نشناسی ہنوز ، شوق بمیرد ز وصل

چیست حیاتِ دوام ؟ سوختنِ ناتمام

یعنی اے انسان تو وصل کا جویا ہے لیکن وصل تیری جدوجہد کو ختم کر دے گا اور تیری زندگی بے کیف ہو جائے گی، حیات دوام (جس کا تو آرزومند ہے) دراصل وصل سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ہمیشہ فراق کی آگ میں جلتے رہنے سے۔ اسی مضمون کو ایک شاعر نے یوں باندھا ہے

اچھا ہے وہ نہیں ہیں جو آمادۂ وصال

پھر کیا رہے گا دل میں جو حسرت نکل گئی

وجود کوہسار و دشت و دریچ

جہاں فانی ، خودی باقی ، دگر ہیچ

کائنات کی ہر چیز فانی ہے دریا، پہاڑ، صحرا سب فانی ہیں، صرف خودی باقی رہنے والی چیز ہے۔

دگر از شنکر و منصور کم گوئے

خدا را ہم براہ خویشتن جوئے

شنکر اچاریہ اور منصور حلاج کے خیالات کی پیروی مت کر و یعنی اپنی خودی کو فنا کرنے کی کوشش مت کر۔ اسلام کی تعلیم

یہ نہیں کہ انسان فنا فی اللہ یا فنا فی الغیر ہو جائے۔ اگر خدا طلبی کا سودا ہے تو خودی کو استوار کرو اور اس کی مدد سے خدا کی معرفت حاصل کرو۔ کیونکہ مسلمان کا نصب العین لقائے رب ہے، نہ کہ ''فنائے ذات''

"فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحاً وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَداً ط"

یعنی جسے خدا سے ملنے کی آرزو ہوا سے لازم ہے کہ اعمالِ صالحہ بجالائے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

"(ہ) خودی کی معرفت سے خدا کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔

اگر زیری ، ز خود گیری زبر شو
خدا خواہی بخود نزدیک تر شو

اگر تو کمزور ہے تو اپنی خودی کی حفاظت کر، اس کی صحیح تربیت کر (قرآنی اصولوں کی پیروی کر) تو طاقتور ہو جائے گا۔ اور اگر تو خدا کی معرفت حاصل کرنی چاہتا ہے۔ تو تقرب خویش حاصل کر یعنی اپنی خودی کی معرفت حاصل کر۔ یہ گویا اس حدیث کا ترجمہ ہے

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ ط

جس نے اپنے نفس (خودی) کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا

"(و) خودی رازِ درونِ حیات ہے۔

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے
خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے؟ بیداریِ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
منِ و تو سے پیدا، منِ و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

خودی شیرِ مولا، جہاں اس کا صید زمیں اس کی صید، آسماں اس کا صید

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے نشیب و فراز و پس و پیش سے

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر

ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

(ز۔) خودی، سرِ توحید ہے اور اسی سے اس میں طاقت پیدا ہوتی ہے۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ

(ح۔) تربیت خودی۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز

یہی ہے سرِ کلیمی ہر اک زمانہ میں ہوائے دشت و شعیب و شبانی شب و روز

(ط۔) حیاتِ خودی۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی نہیں ہے طغرل و سنجر سے کم شکوہِ فقیر

خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب خودی ہو زندہ تو کہسار، پرنیاں و حریر

(ی۔) کیفیتِ خودی۔

خودی ہے زندہ تو موت ہے اک مقامِ حیات کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

خودی ہے زندہ تو دریائے بیکرانہ ترا ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل و فرات

خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہ پیشِ نسیم خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات

(ک) عارفانِ خودی کا مقام۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبحگاہی — کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام بادشاہی

تری آبرو اسی سے تری زندگی اسی سے — جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

(ل۔) خودی کی شان:۔

کسے کو بر خودی زو لا الہ را — ز خاک مردہ رویاند نگہ را

مدہ از دستِ دامانِ چنیں مرد — کہ دیدم در کمند ش مہر ومہ را

یعنی جو شخص اپنی خودی کو توحید کی سان پر چڑھا کر، تیز کر لیتا ہے تو اس میں ایسی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔اے مخاطب! اگر تجھے ایسا شخص مل جائے تو اس کی غلامی اختیار کر لے کیونکہ ایسا مرد با کمال کائنات پر حکمران ہوتا ہے۔

(م۔) صفتِ خودی:۔

خودی از وجودِ حق وجودے — خودی را از نمودِ حق نمودے

نمیدانم کہ ایں تابندہ گوہر — کجا بودے اگر دریا نبودے

خودی کا وجود، خدا کے وجود پر منحصر ہے اور اس کی نمود، خدا کی نمود پر موقوف ہے۔اگر خدا نہ ہوتا تو خودی بھی نہ ہوتی۔

ولے چوں صحبتِ گل مے پذیرو — ھماندم لذتِ خوابش بگیرو

شود بیدار چوں "من" آفرید — چو "من" محکوم تن گردد، بمیرد

خودی اگر جسمانیت کی طرف متوجہ ہو تو سو جاتی ہے اور جب اپنی ہستی کا شعور حاصل کرتی ہے۔تو بیدار ہو جاتی ہے اور جب محکومِ جسم ہو جاتی ہے تو مردہ ہو جاتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ان تصریحات سے خودی کا تصور دماغ میں کسی حد تک پیدا ہو سکے گا۔اب میں دوسری بحث شروع کرتا ہوں۔

بحث دوم

کیا خودی بلند ہو سکتی ہے.......................؟

ہاں ہو سکتی ہے، وگرنہ علامہؒ مسلمانوں کو، اس کے بلند کرنے کی تلقین کیونکر کر سکتے تھے؟ علامہؒ کا فلسفہ سرتاپا قرآنی تعلیمات پر مبنی ہے۔ انہوں نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی ہے جو قرآن وحدیث کے خلاف ہو۔ اللہ فرماتا ہے۔ "فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا" یعنی خودی کو فجور اور تقویٰ دونوں کا علم دیا گیا ہے۔ پس جس نے خودی کا تزکیہ کر لیا وہ کامیاب ہو گیا اور جس نے اُس کی استعدادوں کو فنا کر دیا وہ نامراد ہوا۔

علامہؒ بھی یہی فرماتے ہیں کہ خودی کوئی جامد شے نہیں ہے بلکہ ایک ترقی پزیر جوہر ہے۔ اگر اس میں بلندی کی صلاحیت نہ ہوتی تو علامہؒ کا فلسفہ نہیں، تمام سلسلۂ رشد وہدایت بیکار تھا۔

خودی کس طرح بلند ہو سکتی ہے.......................؟

بانگِ درا سے لے کر جو پہلی تصنیف ہے، ارمغانِ حجاز تک جو آخری تصنیف ہے ہر کتاب میں علامہؒ نے خودی کو بلند کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ یہ بحث بھی بہت تفصیل طلب ہے۔ میں بخوف طوالت، اس کو بھی اجمالی طور پر بیان کروں گا۔

(ا۔) پہلا طریقہ یقین ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ اصول خودی کی بلندی کے لیے سنگِ بنیاد ہے۔ اگر انسان کو یہ صفت حاصل نہ ہو تو بلندی" درکنار "خودی زندہ بھی نہں رہ سکتی۔

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند
آدم بمیرد از بے یقینی

اے مخاطب! اللہ تعالیٰ کسی انسان کو فنا کرنا نہیں چاہتا وہ تو حیات کا سرچشمہ ہے۔ حیاتِ ابدی دینے کو آمادہ ہے۔ انسان خود ہی بے یقینی کی بناء پر راہِ فنا اختیار کر لیتا ہے۔ علامہؒ غلامی کو سب سے بڑی لعنت قرار دیتے ہیں لیکن بے یقینی اس سے بھی بدتر خیال فرماتے ہیں۔

سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بدتر ہے بے یقینی

یقین سے مُراد یہ ہے کہ انسان اس حقیقت پر یقین لائے کہ میں اشرف المخلوقات ہوں خلیفۃ اللہ علی الارض ہوں،

میں ترقی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ مختصر یہ کہ اپنی ہستی کی اہمیت خودی کا یقین ہو۔ علامہؒ نے اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تا کجا طوفِ چراغِ محفلے
ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے

یعنی اے انسان! تو کب تک دوسروں کے بھروسہ پر زندگی بسر کرے گا؟ تو کب تک دوسروں کے دروازہ پر سجدہ کرے گا؟ تو کب تک اپنی حقیقت اور قدر و قیمت سے آگاہ نہ ہوگا؟ تو خود شمع ہے، پھر دوسروں کی شمع کا پروانہ کیوں بنتا ہے؟ تو خود سلطان ہے، پھر دوسروں کی غلامی کیوں کرتا ہے؟

اللہ اللہ! کیا علوِ نفس اور اعتماد علی النفس اور شرفِ انسانیت کی اس سے بہتر تصویر دنیا کے کسی لٹریچر میں مل سکتی ہے؟ چونکہ آجکل یقین کا فقدان ہے اسی لیے خودی کو موت کا دلخراش نظارہ ہر چہار طرف نظر آ رہا ہے۔

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور — خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے پیر حرم ہوا مجبور — کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامہ احرام
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری — جہاں میں عام ہے قلب ونظر کی رنجوری

ثانیاً اللہ تعالیٰ کی ہستی پر یقین رکھنا۔ بس اقبالؒ کے یہاں تو حقائق ہی دو ہیں۔ خودی اور خدا۔ خودی کی تربیت، انسان کی زندگی کا مقصد ہے اور سرور کائنات کی خودی ہمارے لیے ماڈل کا کام دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" ہر مسلمان کا فرض ہے کہ سرکار دو عالمؐ کے نقش قدم پر چلے، تا کہ

مرضیٔ او مرضیٔ حق مے شود — ماہ از انگشتِ او شق مے شود

یقین ہی انسان کو خودی کی حفاظت اور تربیت کی طرف مائل کرسکتا ہے۔ قدرتی بات ہے، آپ اسی شے کی حفاظت کریں گے جس کے قیمتی ہونے کا آپ کو یقین ہوگا۔ اگر میرے گھر میں آگ لگ جائے تو میں صرف اپنے مسودات (جو ہنوز طبع نہیں ہوئے ہیں) کا بنڈل لے کر نکلوں گا، بقیہ کتب کی پرواہ نہیں کروں گا۔

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ — گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

یقین ہی وہ طاقت ہے جو انسان کو اپنے جوہر کی نمود پر مائل کرسکتی ہے۔ اور یہ جذبہ ہی زندگی کی اصلی روح ہے۔ ہنی بال، سکندر، طارق، محمدؐ قاسم، محمود غزنوی، صلاح الدین ایوبی، محمد فاتح، نپولین، سلطان ٹیپو، انور پاشا، مصطفیٰ کمال اور

رضا شاہ کو جس چیز نے شانِ دوام عطا کی وہ کیا ہے؟ صرف جذبہ نمود خودی۔

اسی لیے علامہؒ آجکل کے مغرب زدہ، نیم ملحد، نیم انسان ہندی مسلمان نوجوان کو متنبہ فرماتے ہیں۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود — میری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

وجود کیا ہے ؟ فقط جوہر خودی کی نمود — کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

کاش ہندی مسلمان نوجوان، سینما کے شیدائی، مادیات کے متوالے، فیشن کے پرستار، آرٹ کے سودائی، مٹی کی فانی مورتوں کے تمنائی ۔۔۔۔اس شعر کو دل کی آنکھوں سے پڑھ سکیں! کاش ہندی مسلمان اپنے وجود کے قیام و دوام کی فکر کریں۔ کاش وہ اپنی خودی کے جوہر کی نمود کا مطلب سمجھ سکیں! سلطنت برطانیہ میں آفتاب غروب نہیں ہوتا۔ کیوں؟ کیا انگریزوں نے رگ وید سے تسخیر آفتاب کا کوئی منتر ڈھونڈ نکالا ہے۔؟ کیا انہوں نے کسی ملا یا سیانے سے اسمِ اعظم سیکھ لیا ہے؟ کیا انہیں کوئی تعویذ، جنتر، گنڈا، ٹونا، ٹوٹکہ ہاتھ لگ گیا ہے؟ کچھ بھی نہیں: صرف اس قوم کے ہر فرد میں اپنی خودی کے جوہر کو نمودار کرنے کا جذبہ بے اختیار پیدا ہو گیا ہے۔ اسی لیے علامہؒ مسلمانوں سے خاص طور پر درخواست کرتے ہیں کہ اپنے اندر یقین پیدا کریں۔

یقیں پیدا کر اے غافل یقیں سے ہاتھ آتی ہے — وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ شمشیریں — جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

یقین کے بعد دوسرا طریقہ خودی کو بلند کرنے کا یہ ہے کہ انسان عاشقی اختیار کرے، چونکہ جوہرِ خودی کی تابناکی، انسان کی کامیابی، اور نصب العین کا حصول یہ سب کچھ عاشقی پر منحصر ہے اس لیے علامہؒ کی نظر میں عشق ہی سب کچھ ہے اور سب سے بڑی طاقت ہے عشق کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ

طبع مسلم از محبت قاہر است — مسلم ار عاشق بناشد کافر است

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی — نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

علامہؒ کی نظر میں عشق، کفر و اسلام میں امتیاز کا ذریعہ ہے۔ مسلمان وہ ہے جو عاشق ہو، اگر کوئی مسلمان عاشق نہیں تو وہ مسلمان نہیں بلکہ کافر ہے۔

آپ اس بات کا زندہ ثبوت چاہتے ہیں تو دیکھ لیجئے ۲ھ میں جنگِ بدر کے موقع پر صرف ۳۱۳ عاشقوں نے باطل کو سرِ میدان شکست فاش دے دی تھی لیکن آج ہندوستان دوزخ نشان میں، نو ہزار نو لاکھ، بلکہ پورے نو کروڑ، اسمی اور رسمی

مسلمان یعنی غیر حقیقی اور جعلی مسلمان (جو عشق سے بیگانہ ہیں) آباد ہیں اور سب غلامی میں گرفتار ہیں برطانیہ اور ہنود دونوں سے لرزہ براندام ہیں! کیوں؟ اس لیے کہ

خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر — قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

از غلامے لذتِ ایماں مجو — گر چہ باشد حافظ قرآں مجو

چونکہ عشق ہی سب کچھ ہے اسی سے خودی زندہ اور پائندہ ہوتی ہے۔ اس لیے علامہؒ نے بانگِ درا سے ارمغان حجاز تک ہر کتاب میں مسلمانوں کو عاشقی اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

عشق کے ہیں معجزات سلطنت وفقر ودیں — عشق کے ادنے! غلام صاحب تاج ونگیں

عشق مکان ومکیں عشق زمان وزمیں — عشق سراپا یقیں ، اور یقیں فتح باب

چوتھے مصرع سے یہ بھی ظاہر ہوگیا۔ کہ عشق اور یقین میں روح یا معنی کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔

بس اتنا فرق ہے کہ جب انسان میں یقین کی کیفیت شدت کے ساتھ پیدا ہو جائے اور یہ کیفیت اس کے رگ وپے میں جاری وساری ہو جائے تو اس حالت کو عشق کہتے ہیں

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق

معرکۂ وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق

یعنی حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ، حسین اور علی مرتضیٰ ہر سہ اصحاب نے عشق ہی کی بدولت یہ عزت اور سعادت حاصل کی۔

دو شعر نقل کرتا ہوں جن سے ثابت ہوگا کہ عشق اور یقین میں کمیت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔

نقطۂ پرکارِ حق مرد خدا کا یقین

اور یہ عالم تمام وہم و طلسم ومجاز

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی

یقین ، اللہ مستی خود گزینی

یعنی جس چیز نے حضرت ابراہیم میں اسقدر طاقت پیدا کردی تھی کہ وہ بے خطر آگ میں کود پڑے وہ صرف یقین تھا ۔ پس یقین کیا ہے؟ اللہ کے عشق میں مست ہو جانا اور کائنات میں صرف اپنی ذات کو منتخب کرنا۔

سخن از بود ونا بود و جہاں با من چہ مے گوئی

من ایں دانم کہ من ہستم ندانم ایں چہ نیرنگ است

خدا کی نظر میں صرف وہ مسلمان، مسلمان ہے جو عاشق ہو۔

علم از تحقیق لذت مے برد

عشق از تخلیق لذت مے برد

ہر کہ اورا قوتِ تخلیق نیست

نزد ماجز کافر و زندیق نیست

علم کا کام تحقیق کرنا ہے اور عشق کا کام تخلیق کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس شخص میں قوتِ تخلیق (عشق) نہ ہو وہ ہماری نظر میں کافر ہے۔ خواہ وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتا ہو! (جس طرح ہم ہندی مسلمان اپنے آپ کو مردم شماری کے خانہ میں مسلمان لکھواتے ہیں مگر ہیں دراصل کافر)

اب سوال یہ ہے کہ عشق کس سے کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے

ہر کہ عشق مصطفیٰ سامانِ اوست

بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

جو شخص سرورِ کون ومکان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشق ہے وہ بحر وبر دونوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ یعنی غلامِ محمدؐ آقائے کائنات ہوتا ہے۔ حضرت محمدؐ کی شان کیا ہے؟

می توانی منکر یزداں شدن

منکرِ از شانِ نبیؐ نتواں شدن

علامہؒ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! یہ تو ممکن ہے کہ تو یزداں کا منکر ہو جائے لیکن یہ ممکن نہیں کہ آنحضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا انکار کر سکے۔

آنحضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ آپ کی اتباع" قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ط یعنی اے رسول! دنیا والوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ کو محبوب بنانا چاہتے ہو۔ تو میری اتباع کرو اللہ تمھارا عاشق ہو جائے گا۔ اس لیے علامہ فرماتے ہیں۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

اے مسلمان! مصطفیٰؐ کی پیروی کر کیونکہ آپ کی ذاتِ بابرکات سے وابستگی ہی تجھے مسلمان بنا سکتی ہے۔ اگر آپ کی اتباع سے بال بھر ہٹ جائے گا تو ابولہب اور ابوجہل کے زمرہ میں شامل ہو جائیگا۔

COLUMBIA GRAPHOPHONE COMPANY, LTD.

(Incorporated in England)

TELEGRAMS & CABLES
"COLGRAPH," CALCUTTA
CODES
WESTERN UNION (5-LETTER EDITION)
LIEBER'S, BENTLEY'S, A.B.C. (5TH EDITION)
PRIVATE CODE

TELEPHONE: CAL. 281

In Your Reply Please Quote
LAW/C.

POST BOX NO. 284,
CALCUTTA.

8th December 1933.

Dear Sh. Ramd. I'll come at 4.30 to talk this matter ... the letter ... [illegible] Yours Mohammad Iqbal

Dr. Sir Mohammed Iqbal,
Lahore.

Dear Sir Mohammed,

I understand from our Solicitors that there is some hold up in finalising the arrangements which were made between us during our interview recently in Lahore and I shall be grateful if you would be good enough to look into the matter personally since we are anxious to proceed with the sale of the records which comrpise your songs.

One question seems to be the computation of the royalty and I want to make it clear to you that we shall be happy to pay, as arranged, 5% on the retail price of all sales made of double sided records both sides of which contain your compositions. In the case, however, where one side is your composition and the other that of some other composer, then the usual allocation will be made of 2½% royalty to you; I think that there is one such case in our repertoire where we have only one side a song of your composition; in future, of course, we shall always arrange for both sides of the record to contain the songs of your works.

put this in the agreement.

Another point which seems to be pressed by your lawyer and one which I am totally at a loss to appreciate or understand is that the form of agreement to be entered into between us should be under seal; I must frankly say that to my knowledge no copyright agreements have ever been given in this country under seal; such an arrangement is totally unnecessary and I can assure you that I have every power to bind this Company in arrangements of this nature although, you appreciate., I have not the authority to use the Company's seal.

As to this point, please look up the Law. I think the agent binds the Principal. So there is no harm in coming to an agreement with the Agent. Of course he will have to sign the agreement as agent of the Columbia Company. Mohammad Iqbal

خودی کی بلندی کا نتیجہ:۔

اب تیسری بحث یہ ہے کہ خودی جب بلند ہو جاتی ہے تو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ جب اطاعتِ آئین نبویؐ کی بدولت خودی بلندی ہو جاتی ہے تو

نگرود آسمان بے رخصتِ او
نہ تابد اخترے بے شفقتِ او

یعنی کائنات زیرِ نگیں ہو جاتی ہے۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

عشق کی بدولت، خودی کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور معرفت خودی کا نتیجہ یہ ہے

یہ پیام دی گئی ہے مجھے بادِ صبحگاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

عشق کی بدولت، دل بیدار ہو جاتا ہے اور

دلِ بیدار فاروقی ، دل بیدار کرّاری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
جس بندہ حق بیں کی خودی ہوگئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے برندہ و براق

عشق حیاتِ جاودانی عطا کرتا ہے۔

زندگانی ہے صدف ، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرہ کو گہر نہ کرسکے
ہو اگر خود نگرو خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی نہ مر سکے
مہ و ستارہ ، مثالِ شرار ، یک دو نفس

مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
تیرے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

عاشق یا مومن، کی خودی جب بلند ہو جاتی تو حالت یہ ہوتی ہے۔

ہر زماں اندر تنش جانے دگر
ہر زماں اور اچو حق شانے دگر

یعنی ہر لحظہ اس کے جسم میں نئی جان پیدا ہوتی ہے اور ہر وقت، مثلِ حق، وہ نئی شان کے ساتھ دنیا میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اور سنیے:۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریل امیں ، بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

اور سنیے

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

عاشق یا مومن کا مرتبہ ان اشعار سے بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔

ہمچناں از خاک خیزد جانِ پاک
سوئے بے سوئ گریز و جانِ پاک
تا ز مازاغ البصر گیرد نصیب
بر مقام عبدہٗ گرود رقیب

یعنی جب کسی انسان کی خودی بلند ہو جاتی ہے۔ تو اس کی روح، مادی علائق سے آزاد ہو کر عالم لاہوت کی طرف پرواز کرتی ہے اور وہ قیدِ زمان و مکان سے آزاد ہو جاتا ہے۔ پھر اسے "مازاغ البصر" کی دولت سے حصہ ملتا ہے اور اس طرح وہ مقامِ عبدیت کبرےٰ پر فائز ہو جاتا ہے۔

الغرض جب خودی بلند ہو جاتی ہے تو صاحب خودی، مقام عبدیت حاصل کر لیتا ہے۔ یہ مقام کیا ہے؟ علامہ فرماتے ہیں۔

عبد دیگر ، عبدہٗ چیزے دیگر
ما سراپا انتظار او منتظر

یعنی عبد اور چیز ہے اور عبدہٗ (بندہ خدا) اور چیز ہے عبد خدا سے ملنے کا انتظار کرتا ہے اور عبدہٗ سے ملنے کا خود خدا منتظر ہوتا ہے۔ بندے تو ہم سبھی ہیں بقول اکبر بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو۔ لیکن سوال یہ کہ ہم کس کے بندے ہیں؟ اللہ کے یا شیطان کے؟ علامہؒ نے اسی بات کو واضح کیا ہے کہ عبد اور عبدہٗ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے "وَاِذَا سَاَ لَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَۃَالدَّاعِ اِذَادَعَانِ " اے رسول! جب میرے بندے (جو میرے عشق میں سرشار ہیں اور اپنی جان اور مال دونوں مجھے سونپ چکے ہیں۔ کیونکہ مومن وہ ہے جو جنت کے بدلے اپنی جان اور مال دونوں خدا کے حوالہ کر دے" اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ " آپ سے میرے متعلق سوال کریں کہ ہمارا اور خدا کا رشتہ کیا ہے تو آپ فرما دیجئے کہ میں اپنے بندوں سے بہت قریب ہوں اور فِیْمَا بَیْنَ اس درجہ یگانگت ہے۔ کہ جب وہ مجھے پکاریں گے تو میں ان کی پکار کا جواب دوں گا۔

اس آیت میں "الناس" کا تذکرہ نہیں بلکہ "عباداللہ" کا تذکرہ ہے یعنی عبد کا ذکر نہیں بلکہ عبدہ کا۔ مطلب یہ کہ جو شخص خودی کو بلند کرتا ہے، ع یعنی عاشق بن جاتا ہے اور سب کو چھوڑ کر اللہ کا بندہ بن جاتا ہے، تو پھر خدا بھی اس کا ہو جاتا ہے۔

جب خودی اطاعت کی بدولت اس مرتبہ پر فائز ہو جاتی ہے تو انسان، مقامِ عبدیت پر فائز ہو جاتا ہے اور یہ عبدیت، محبوبیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے خدا اپنے بندے کے فعل کو اپنا فعل اور اسکے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیتا ہے "وَمَا

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی "یعنی اے رسول! جب آپؐ نے کنکریاں پھینکیں، تو آپؐ نے نہیں بلکہ خدا نے پھینکیں"

" یَدُاللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ " یعنی جب ایک درخت کے سایہ میں آپؐ نے صحابہؓ سے بیعت لی تھی تو اگر چہ بظاہر انہوں نے آپؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا۔ لیکن دراصل وہ آپ کا ہاتھ نہ تھا بلکہ خدا کا ہاتھ تھا۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے رسولؐ کے فعل کو اپنا فعل اور آپؐ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا ہے۔ اسی لئے علامہ فرماتے ہیں۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

اب آپ عبدہ کی شان ملاحظہ کریں۔

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دیگر
ما سراپا انتظار او منتظر

عبد اور ہے اور عبدہ اور ہے۔ عبد کسی کا انتظار کرتا ہے اور عبدہ وہ جس کا کوئی اور انتظار کرتا ہے۔

عبدہ دہراست و دہر از عبدہ است
ماہمہ رنگیم و او بے رنگ وبوست

عبدہ، دہر ہے اور یہ دہر اسی کے دم سے قائم ہے، ہم سب مادیات میں غرق ہیں۔ لیکن وہ رنگ وبو یعنی آنی اور فانی صفات سے منزّہ اور پاک ہوتا ہے۔

عبدہٗ با ابتدا بے انتہا ست
عبدہ را صبح و شام ما کجاست

عبدہ اگر چہ پیدائش کے لحاظ سے حادث ہوتا ہے۔ لیکن عبدیت کی بدولت بے انتہائی کی شان حاصل کر لیتا ہے اور قید زمانی سے بھی آزاد ہو جاتا ہے۔

کس ز سرِّ عبدہ آگاہ نیست
عبدہٗ جز سرِّ الا اللہ نیست

عبدہ کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں کیونکہ عبدہ، خود لا اللہ کا بھید ہے۔

لا الہ تیغ و دمِ او عبدہٗ

فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ

لا الہ کو اگر تلوار فرض کیا جائے تو عبدہ اس کی دھار ہے اور صاف صاف سننا چاہتے ہو تو سن لو، ہو اور عبدہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اب آپ شعر پڑھیں تو مطلب بالکل واضح ہے۔

جب خودی اتنی بلند ہو جائے کہ بندہ مومن کا ہاتھ، خود اللہ کا ہاتھ ہو جائے، جب انسان مقامِ عبدیت پر فائز ہو جائے جب وہ کائنات پر حکمرانی کرنے لگے اور حالت یہ ہو جائے کہ

نہ گردد آسماں بے رخصتِ او

نہ تابد اخترے بے شفقت او

آسمان اس کی اجازت کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا کوئی ستارہ اس کی نوازش کے بغیر نہیں چمک سکتا، تو پھر اس میں کیا تعجب ہے کہ خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

حقیقت یہ کہ ہم خود، دنیا پرست ہیں اور رات دن دنیا پرستوں میں رہتے ہیں، مومن ہونا تو بڑی بات ہے ہم نے تو کسی مومن کو دیکھا بھی نہیں پھر ہم کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔ کہ مومن کس مقام پر ہوتا ہے۔

در رضائش مرضیِ حق گم شود

ایں سخن کے باورِ مردم شود

خود خدا، مولانا رومی فرماتے ہیں، اُس کی یعنی بندۂ مومن کی مرضی کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس لیے اپنی مرضی کو اس کی مرضی میں گم کر دیتا ہے۔ لیکن یہ بات اس قدر عجیب و غریب ہے کہ مشکل سے لوگ اس پر یقین لا سکتے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ مقام بہت دشواری سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ذیل کی دو آیتوں پر غور کیجیے تو شاید کچھ روشنی حاصل ہو سکے۔

نمبر 1۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

مقامِ عبدیت پر پہنچنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کی عبادت اور مراسم مذہبی بلکہ اس کا جینا اور مرنا محض خدا کی خوشنودی کے لیے ہو۔ اب ہم میں کتنے ہیں جو خدا کے لیے زندگی بسر کرتے ہیں۔ جسے دیکھو گردابِ شکم میں مبتلا ہے صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک یا اپنے لیے جیتے ہیں یا بیوی بچوں کے لیے۔ ہر لحظہ نفسِ امارہ کی پرستش کرتے ہیں اور اسی

بس عمر ختم ہو جاتی ہے۔

نمبر 2 "اِنَّ اللّٰہَ اشْتَریٰ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃ "

دوسری شرط یہ ہے کہ انسان اپنی جان اور اپنا مال دونوں خدا کے سپرد کردے۔ دونوں کو اپنا نہ سمجھے، بلکہ ان کو خدا کی راہ میں صرف کردے۔ لیکن کتنے ہیں جوان دونوں کو خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں۔ مال کی محبت کا یہ عالم ہے کہ جان جائے تو جائے پر مال ہاتھ سے نہ جائے۔ پس جب مال کی محبت اس درجہ ہے تو جان کس قدر عزیز ہوگی اس کا اندازہ خود کر لیجئے مقامِ عبدیت پر پہنچ کر "مومن" کائنات پر حکمرانی کرتا ہے اور ایک اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے کرسکتا ہے جیسا کہ علامہؒ لکھتے ہیں۔

مرضیٔ او مرضیٔ حق مے شود

ماہ ازانگشتِ او شق مے شود

لیکن پہلے بندہ کے لیے لازم ہے کہ آئینِ الٰہی کی اس درجہ پابندی کرے کہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں فنا کردے۔ اس لیے علامہ لکھتے ہیں۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار

می شود از جبر پیدا اختیار

اے انسان، خدا کی اطاعت کر، کیونکہ جب تو اس کی اطاعت میں کامیاب ہوجائیگا۔ تو پھر اُس کا صلہ یہ ملے گا کہ تو بندۂ مجبور سے بندہ مختار ہو جائے گا۔

تا توانی گردن از حکمش مپیچ

تا نہ پیچد گردن از حکمِ تو ہیچ

یعنی پہلے تو خدا کی اطاعت کر پھر اس اطاعت کی بدولت تجھے وہ مرتبہ حاصل ہوگا کہ دنیا زیر فرمان ہو جائے گی۔

از جدائی گر چہ آید جاں بلب

وصل او کم جو رضائے او طلب

مصطفیٰ داد از رضائے او خبر

نیست در احکامِ دیں چیزے دگر

تختِ جم پوشیدہ زیر بوریاست
فقر و شاہی از مقاماتِ رضاست

یعنی اگر تیری جان پر بھی بن جائے تو بھی رضائے الٰہی سے سرتابی مت کیجیو اور یہی اسلام کی حقیقت ہے۔ جس کا علم ہمیں آنحضرت صلعم کی وساطت سے ہوا ہے۔ جو شخص اللہ کی مرضی کا تابع ہو جاتا ہے کائنات اس کی تابع فرمان ہو جاتی ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو علامہؒ نے اس شعر میں اسلام کی روح پیش کر دی ہے۔ اسلام کے معنے ہیں سرِ تسلیم خم کرنا، اور شیوۂ تسلیم و رضا ہی وہ ذریعہ ہے جس سے خودی بلند ہو سکتی ہے اور انسان مقامِ عبدیت پر فائز ہو سکتا ہے۔ اب وہ شعر پھر پڑھیے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خلاصۂ کلام یہ کہ انسان کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ اس کی خودی مرتبۂ کمال کو پہنچے اور کمال عشق یا اتباعِ احکامِ الٰہیہ سے حاصل ہو سکتا ہے، عشق کی بدولت، انسان مومن بنتا ہے اور مومن مقامِ عبدیت پر فائز ہو کر "مولا صفات" بن جاتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر، اس کی مرضی خدا کی مرضی بن جاتی ہے اور خدا کی مرضی اس کی مرضی بن جاتی ہے اور یہ مرتبہ اتباعِ رسول سے حاصل ہو سکتا ہے فقط

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لیے اب صلاحِ کار کی راہ

رسالہ:۔

"حقیقت اسلام" اگست ۱۹۳۹ء

تلمیحاتِ اقبال

از میر ولی اللہ

میر ولی اللہ ایبٹ آبادی (ف ۱۹۶۴) اقبال کے ہم عصر تھے اور ان کے مداحوں میں تھے انہیں اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور سنسکرت پر یکساں دسترس حاصل تھی۔ اپنی زندگی میں انہوں نے اقبال کی تلمیحات پر کام کیا ابھی اپنا منصوبہ مکمل نہیں کر پائے تھے کہ عابد علی عابد کا کام سامنے آ گیا چنانچہ آپ نے مزید کام روک دیا۔ ۷۶ صفحات پر مشتمل ان کا غیر مطبوعہ مسودہ راقم الحروف کی تحویل میں ہے۔ اس مسودے سے چند تلمیحات کا انتخاب "نوادرِ اقبال نمبر" میں شائع کیا جا رہا ہے جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میر صاحب اپنے وقت کے کتنے بڑے عالم تھے۔ اگر یہ کتاب چھپ جائے تو اقبالیاتی ادب میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔

(ص۔ ک)
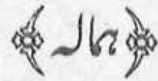
جلوہ---- کلیم---- طورِ سینا---- تجلّی

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لیے
تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

قرآن مجید میں ہے

"پس جب پوری کر لی موسٰی نے وہ مدت (جو مدین میں حضرت شعیبؑ سے مقرر کی تھی) اور چلا لے کر اپنے گھر والوں کو تو دیکھی اُس نے ایک طرف سے طور کے آگ۔ کہا اپنے گھر والوں سے ٹھہرو بے شک میں نے دیکھی ہے آگ سی۔ شاید میں لے آؤں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر یا چنگاری آگ کی۔ تا کہ تم سینکو۔ پس جب آیا وہاں تو ندا ہوئی وادی کے داہنے کنارے سے (وادالایمن)۔ برکت والے مقام میں درخت (کے اوپر) سے۔ کہ اے موسٰی بلاشبہ میں ہی ہوں اللہ۔ پروردگار سب جہانوں کا" (۲۸۔۲۹،۳۰)

اِس موقعہ پر اور کئی اور موقعوں پر حضرت موسٰیؑ کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے۔ اسی لیے انہیں کلیم، یا کلیم اللہ کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں ایک اور مقام پر ہے

"اور ہم نے وعدہ کیا تھا موسٰی سے تیس راتوں کا اور پورا کیا ہم نے ان کو دس راتوں سے۔ پھر پوری ہوگئی مدتِ مقررہ اس کے رب کی چالیس راتیں۔ اور جب آیا موسٰی ہمارے (چلہ کے) وعدہ کے لیے اور کلام کیا اسی سے اس کے رب نے۔ تو اس نے عرض کی۔ اے رب دکھا مجھے کہ ایک نظر دیکھ لوں تجھے۔ فرمایا ہرگز نہ دیکھ سکے گا۔ تو مجھے (لن ترانی)۔ لیکن نگاہ ڈال اس پہاڑ کی طرف۔ پس اگر وہ ٹھہرا رہا اپنی جگہ پر۔ تو تو بھی مجھے دیکھ سکے گا۔ پھر جب جلوہ ڈالا اس کے رب نے (تجلّی ربہ) پہاڑ پر۔ تو کر دیا اسے ریزہ ریزہ۔ اور گر پڑا موسٰی غش کھا کر" (۷۔۱۴۲۔۱۴۳)

یہ ہے اُس جلوے اور تجلّی کی حقیقت۔ کوہِ طور کو طور سینا بھی کہا گیا ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے

"اور ایک درخت جو اُگتا ہے طورِ سینا سے۔ وہ اُگتا ہے لئے ہوئے روغن اور سالن کھانے والوں کے لیے" (۲۳۔۲۰)

عراق ---- ساز

چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو

اوم ہندوؤں کا اسمِ اعظم ہے۔ عموماً ہر دعا سے پہلے بولتے ہیں۔ بھور بھوہ۔ سوَہ مقطعات ہیں۔ جن کا اکثر کوئی ترجمہ نہیں کیا جاتا۔ بعض ان الفاظ سے تینوں لوک یعنی تینوں جہان مراد لیتے ہیں۔ یعنی 1۔ زمین 2۔ آسمان اور 3۔ زمین وآسمان کے درمیان۔ بعض آدمی ان تینوں لفظوں سے تینوں زمانے مراد لیتے ہیں۔ یعنی ماضی۔ حال اور مستقبل۔ اور ترجمہ یوں کرتے ہیں۔ اے تینوں جہانوں یا تینوں زمانوں کے پروردگار خالق اور مالک۔

موحّد ہندو تو گایتری منتر کا یہی ترجمہ کرتے ہیں۔ جو اُوپر تحت اللفظ لکھا گیا۔ البتہ دیوتا پرست لوگ اِس منتر سے اگنی دیوتا (آگ) یا سورج دیوتا (آفتاب) کی پوجا کرتے ہیں۔ دیو یا دیوتا روشن ہستی کو کہتے ہیں۔ اب اسے خدا سمجھو یا آگ یا سورج۔

شمع

------طائرِ بامِ حرم-------

صیّاد آپ حلقہٗ دام ستم بھی آپ
بامِ حرم بھی طائرِ بامِ حرم بھی آپ

حرمِ کعبہ میں شکار منع ہے۔ اِس لیے طائرِ بامِ حرم صیّاد کی دستبرد سے محفوظ ہوتا ہے۔

تصویرِ درد

سکندر -------- آئینہ

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں

قصہ گو کہتے ہیں کہ جب سکندر نے حکیموں سے اپنی رائے ظاہر کی کہ ہم ایک ایسی چیز بنانی چاہتے ہیں جس میں ہر ایک چیز کا عکس دیکھ لیا کریں تو انہوں نے معدنیات سے اس کو بنانا چاہا لیکن جب اس سے مطلب حاصل نہ ہوا تو سکندر کی تدبیر سے سیّام لوہار نے فولاد سے یہ کام لیا اور لوہے کو ایسا جلا دی کہ اس میں ہر ایک چیز کا عکس معلوم دینے لگا۔ جب یہ آئینہ سکندر کے حسبِ منشا تیار ہو گیا تو اس نے بڑا جشن کیا۔ پہلے آئینہ فولاد سے ہی بنتا رہا۔ دو تین صدی سے جب کانچ دریافت ہوئی تو وہ بہ آسانی یہ کام دینے لگی اور فولاد کے آئینے کا رواج جاتا رہا۔ لُغت نویس کہتے ہیں کہ چونکہ پہلے آئینہ لوہے سے بنایا گیا تھا۔ اس لیے اُسے آہنہ کہتے تھے۔ یہی آہنہ رفتہ رفتہ آئینہ بن گیا۔

اومؔ ہندوؤں کا اسمِ اعظم ہے۔ عموماً ہر دعا سے پہلے بولتے ہیں۔ بھُور بھُوہ۔ سوٗہ مقطعات ہیں۔ جن کا اکثر کوئی ترجمہ نہیں کیا جاتا۔ بعض ان الفاظ سے تینوں لوک یعنی تینوں جہان مراد لیتے ہیں۔ یعنی 1۔ زمین 2۔ آسمان اور 3۔ زمین وآسمان کے درمیان۔ بعض آدمی ان تینوں لفظوں سے تینوں زمانے مراد لیتے ہیں۔ یعنی ماضی۔ حال اور مستقبل۔ اور ترجمہ یوں کرتے ہیں۔ اے تینوں جہانوں یا تینوں زمانوں کے پروردگار خالق اور مالک۔

موحّد ہندو تو گایتری منتر کا یہی ترجمہ کرتے ہیں۔ جو اُوپر تحت اللفظ لکھا گیا۔ البتہ دیوتا پرست لوگ اِس منتر سے اگنی دیوتا (آگ) یا سورج دیوتا (آفتاب) کی پوجا کرتے ہیں۔ دیوؔ یا دیوتاؔ روشن ہستی کو کہتے ہیں۔ اب اسے خدا سمجھو یا آگ یا سورج۔

﴿شمع﴾

------طائرِ بامِ حرم-------

صیّاد آپ حلقۂ دام ستم بھی آپ

بامِ حرم بھی طائرِ بامِ حرم بھی آپ

حرمِ کعبہ میں شکار منع ہے۔ اِس لیے طائرِ بامِ حرم صیّاد کی دستبرد سے محفوظ ہوتا ہے۔

﴿تصویرِ درد﴾

سکندر -------- آئینہ

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا

سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں

قصہ گو کہتے ہیں کہ جب سکندر نے حکیموں سے اپنی رائے ظاہر کی کہ ہم ایک ایسی چیز بنانی چاہتے ہیں جس میں ہر ایک چیز کا عکس دیکھ لیا کریں تو انھوں نے معدنیات سے اس کو بنانا چاہا لیکن جب اس سے مطلب حاصل نہ ہوا تو سکندر کی تدبیر سے سیّام لوہار نے فولاد سے یہ کام لیا اور لوہے کو ایسا جلا دی کہ اس میں ہر ایک چیز کا عکس معلوم دینے لگا۔ جب یہ آئینہ سکندر کے حسبِ منشا تیار ہو گیا تو اس نے بڑا جشن کیا۔ پہلے آئینہ فولاد سے ہی بنتا رہا۔ دو تین صدی سے جب کانچ دریافت ہوئی تو وہ بہ آسانی یہ کام دینے لگی اور فولاد کے آئینے کا رواج جاتا رہا۔ لُغت نویس کہتے ہیں کہ چونکہ پہلے آئینہ لوہے سے بنایا گیا تھا۔ اس لیے اُسے آہنہ کہتے تھے۔ یہی آہنہ رفتہ رفتہ آئینہ بن گیا۔

سرگزشت آدم

-------- گردشِ زمیں --------

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں

سکھایا مسئلہ گردشِ زمیں میں نے

گلیلیو نے گردشِ زمین کے متعلق بہت کچھ کہا اور لکھا۔ اس پر یورپ کی مذہبی جماعتوں میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ مذہبی رہنماؤں یعنی اہل کلیسا نے گلیلیو کے اس نظریے کو عقایدِ مذہب کے خلاف بتایا۔ اور اُس کے لیے بڑی بڑی ہولناک سزائیں تجویز کیں اور اُس کے قتل کا فتویٰ صادر کیا۔ آخر کار بنوکِ شمشیر اُس سے لکھوایا گیا کہ گردشِ زمین کا عقیدہ غلط ہے اور زمین گردش نہیں کرتی۔ کہتے ہیں کہ جب گلیلیو یہ تحریر دے کر کمرے سے باہر نکل رہا تھا تو دبی زبان میں یہ کہتا جا رہا تھا کہ "با ایں ہمہ زمین پھر رہی ہے"

داغ

آزر-------- بتخانہ

اٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے بت خانے سے

مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے والد آزر بُت پرست۔ بُت تراش اور بُت فروش تھے (تنبیہ) یہ آزر زے کے ساتھ ہے نہ کہ ذال کے ساتھ۔ علامہ اقبال مرحوم کی کتابوں میں یہ لفظ اکثر ذال کے ساتھ لکھا جاتا رہا ہے۔ ایک دفعہ میں نے انہیں اِس امر کی طرف متوجہ بھی کیا تھا۔

ابر

------سربن------

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا

سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا

سربن ایبٹ آباد کے متصل ایک پہاڑ ہے۔ یہ نظم علامہؒ مرحوم نے ایبٹ آباد میں ہی لکھی تھی۔

﴿ کنارِ راوی ﴾

منارِ خواب گاہ ---------- شاہسوارِ چغتائی

کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی
منار خواب گہِ شہسوارِ چغتائی

مقبرۂ جہانگیر کے میناروں کی طرف اشارہ ہے۔

﴿ غزلیات ﴾

نظّارہ -------- جنبشِ مژگاں

نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

فارسی کے اِس مشہور شعر پر مبنی ہے

در بزمِ وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا
نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

﴿ عبدالقادر کے نام ﴾

بتکدۂ چین ------ سعدی ------ سلیمیٰ

رختِ جاں بتکدۂ چین سے اٹھالیں اپنا
سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کردیں

چینی ترکستان کا حسنِ مشہور ہے۔ بت سے یہاں مراد معشوق ہے۔ سعدیٰ عرب کی ایک معشوقہ کا نام۔ سلیمیٰ یا سلمیٰ بھی عرب کی ایک معشوقہ کا نام ہے۔

﴿ گورستانِ شاہی ﴾

-------- کوہِ نور --------

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہگزر
چشم کوہ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور

دنیا کے مشہور ہیرے کوہِ نور کی تاریخ چند در چند سلطنتوں کے عروج و زوال کی تاریخ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ہیرے کی تاریخ جنگِ مہابھارت کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے اور میلادِ مسیح سے ایک صدی پہلے یہ پتھر راجہ، اوجین کے قبضے میں تھا۔

صحیح تاریخی حالات کوہ نور کے آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوتے ہیں۔ اُس وقت یہ ہیرا راجگانِ مالوہ کے پاس تھا۔ ۷۰۹ھ میں راجہ مالوہ کو شکست ہوئی تو کوہ نور سلطان علاؤالدین خلجی کے ہاتھ آیا۔ جب ہمایون نے اس علاقے کو فتح کیا تو کوہ نور بھی اس کے قبضے میں آ گیا۔ اس نے یہ پتھر اپنے باپ بابر بادشاہ کو دیدیا۔ بعد میں بابر نے پھر یہ پتھر ہمایوں کو دیدیا۔ اس کے بعد کوہ نور نسلاً بعد نسل شاہانِ مغلیہ کے پاس رہا۔ جب نادر شاہ افشار نے ہندوستان پر لشکر کشی کی تو اس نے محمد شاہ سے اسے لے لیا۔ نادر شاہ کے بعد یہ ہیرا اس کے بھتیجے شاہ رخ کے قبضے میں آ گیا۔ جب شاہ رخ مارا گیا تو کوہِ نور احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ آیا۔ اور اس کے خاندان میں رہا۔ جب اِس کا پوتا شاہ شجاع افغانستان سے بھاگا تو وہ کوہِ نور کو اپنے ساتھ لے آیا شاہ شجاع کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مجبور کیا تو اس نے یہ پتھر جمادالآخر ۱۲۲۸ھ میں رنجیت سنگھ کے حوالے کر دیا۔ رنجیت سنگھ کے بعد یہ پتھر اس کے خاندان میں رہا۔ جب اس کا آخری جانشین دلیپ سنگھ ۱۲۶۳ھ میں مغلوب ہوا۔ تو یہ ہیرا انگریزوں کے ہاتھ آیا۔ ۱۲۶۴ھ میں لارڈ ڈلہوزی نے یہ پتھر ملکہ وکٹوریہ کے پاس بھیجدیا اور ابھی تک یہ شاہانِ انگلستان کے قبضے میں ہے۔ واعتبرو یا اولی الابصار

﴿غرّہ شوال﴾

تُرک-------خلافت

چاک کردی تُرک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیّاری بھی دیکھ

پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) سے پہلے سلاطین عثمانیہ روم خلیفۃ المسلمین بھی ہوتے تھے۔ لڑائی کے بعد خاندان عثمانی کی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور ترکی میں جمہوری نظام حکومت قائم ہوا تو ترکوں نے خلافت بھی چھوڑ دی۔ وجہ یہ تھی کہ اس لڑائی میں عربی ممالک ترکی کے زیر نگین نہ رہے اور خود مختار ہو گئے۔ اس طرح ترکوں سے "خادم الحرمین الشرفین" کا شرف بھی چھن گیا۔ اور یوں بھی صدیوں سے اسلامی دنیا نے عملاً کسی سلطانِ روم کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ خلافت

محض ایک تمسخر سا بن کر رہ گئی تھی اور اتاترک نے اپنے نام کے ساتھ اس تمسخر کو جائز نہ رکھا۔ ترکِ نادان کی یہ نادانی کہاں تک جائز تھی آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔

﴿جوابِ شکوہ﴾

------یورشِ تاتار------

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

چنگیز خانی مغلوں نے جو کافر تھے مختلف اسلامی ملکوں پر حملے کئے اور انہیں تباہ کیا۔ یہ حملہ آور مغل تاتار سے اٹھے تھے۔ ہلاکو خان چنگیزی نے ۶۰۶ھ میں بغداد پر حملہ کر کے خلیفہ مستعصم عباسی کو قتل کیا اور اس طرح خلافت عباسیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ چنگیزی مغل کئی اسلامی سلطنتوں پر قابض ہو گئے۔ ۶۸۰ھ میں احمد چنگیز خانی شاہِ فارس (پسرِ ہلاکو خان مسلمان ہو گیا۔ ۶۹۴ھ میں غازان محمود چنگیز خانی نے اسلام قبول کر لیا۔ اور پھر ایران میں اور دوسرے مقامات پر اکثر چنگیزی مغل مسلمان ہو گئے۔ اِس طرح یہ سارے حملہ آور فاتحین ہوتے ہوتے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ یعنی صنم خانوں کے یہ معتکف آخرِ کار کعبے کے پاسبان بن گئے۔

﴿خضرِ راہ﴾

غروبِ آفتاب---------- خلیل

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل

قرآن میں ہے

"اور اسی طرح ہم دکھا رہے تھے ابراہیم کو حکومت آسمانوں کی اور زمین کی۔ تا کہ وہ ہو جائے یقین کرنے والوں میں۔ پس جب چھا گئی اس پر رات۔ تو اُس نے دیکھا ایک ستارہ۔ کہنے لگا یہی میرا رب ہے۔ پھر جب وہ (ستارہ) غائب ہو گیا۔ تو بولا کہ میں دوست نہیں رکھتا زوال پا جانے والوں کو۔ پھر جب اس نے دیکھا چاند چمکتا ہوا۔ تو کہا یہ میرا رب ہے۔ پھر جب چاند غائب ہو گیا تو بولا کہ اگر نہ ہدائت کی ہوتی مجھے میرے رب نے۔ تو میں ہو گیا ہوتا گمراہوں میں سے۔ پھر جب اس نے دیکھا سورج جگمگاتا ہوا۔ تو بولا یہی میرا رب ہے۔ یہ تو سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ بھی

غروب ہوگیا۔ تو بولا اے میری قوم! میں تو بیزار ہوں اُن سے جنہیں تم اللہ کے شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے متوجہ کیا اپنا رخ اُس ذات کی طرف جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو۔ سب سے منہ موڑ کر۔ اور نہیں ہوں میں مشرکوں میں سے" (۶، ۷۰، تا ۷۹)

طلوع اسلام

------لہو خورشید کا ٹپکے------

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّہ کا دل چیریں

یہ شعر قاسم دیوانہ کے اس شعر پر مبنی ہے

یکے ست حسن بصد جلوہ گر نقاب کشید
رگِ چراغ زوم خونِ آفتاب چکید

طلوع اسلام

پیرِ حرم---------جوانان تتاری

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

اشارہ ہے تاریخ کے اِس واقعہ کی طرف کہ چنگیزی مغل تاتار سے نکل کر تمام اسلامی دنیا پر چھا گئے اور آخر مستعصم کو قتل کر کے بغداد کی عباسی خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ بعدہ یہ لوگ خود مسلمان ہو گئے۔ یا عربوں اور ترکوں کا مقابلہ مقصود ہے۔ تُرک اور مغل دونوں تاتار سے نکلے۔ اور دونوں یک جدی تھے۔ نیز ملاحظہ ہو نوٹ نمبر (۱۳۸)

غزلیات

قطرہ-------- گوہر

کی ترک تگ ودو قطرے نے تو آبروئے گوہر بھی ملی
آوارگیٔ فطرت بھی گئی اور کشمکشِ دریا بھی گئی

اِس بے حقیقت لیکن مشہور بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک خاص موسم میں صدف مُنہ کھول کر سمندر کی سطح پر تیرتا رہتا ہے۔ جب بارش کا ایک قطرہ اس میں گرتا ہے تو وہ منہ بند کر لیتا ہے۔ یہ قطرہ صدف کے پیٹ میں تربیت پاتے پاتے آخر کار موتی بن جاتا ہے۔

۔۔۔ذکر و فکر۔۔۔

--------علّم االاسما--------

یہ ہیں سب ایک ہی سال کی جستجو کے مقام

وہ جس کی شان میں آیا ہے علّم الاسما

"وَعَلَّمَ آدَمَ الاَسْمَاءَ كُلَّهَا" (اور سکھا دئے اللہ نے آدم کو نام سب (چیزوں کے))

قران مجید میں ہے۔

"اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں سے کہ میں بنانے والے ہوں زمین میں ایک نائب۔ کہنے لگے۔ کیا تو بناتا ہے زمین میں اُس کو جو فساد مچائے گا اُس میں اور گرائے گا خون۔ اور ہم تسبیح پڑھتے رہتے ہیں تیری حمد کے ساتھ اور تقدیس کرتے ہیں تیری۔ کہا اللہ نے میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور سکھا دئے اللہ نے آدم کو نام سب (چیزوں کے) پھر پیش کیا انہیں فرشتوں پر اور کہا بتاؤ مجھے نام ان چیزوں کے۔ اگر تم ہو سچے۔ انہوں نے عرض کیا تو پاک ہے۔ نہیں کچھ علم ہمیں۔ مگر جو تو نے ہمیں سکھایا۔ بے شک تو ہی ہے بڑا جاننے والا حکمت والا۔ کہا (اللہ نے) اے آدم بتا دے انہیں نام اُن کے۔ پس جب اُس نے بتا دئے اُنہیں اُن کے نام تو کہا (اللہ نے فرشتوں سے) میں نے کہا نہ تھا تم سے کہ میں جانتا ہوں پوشیدہ باتیں آسمانوں کی اور زمین کی۔ اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔" (۲۔۳۰۔تا ۳۳)

اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام یعنی تمام چیزوں کی ماہیت بتا دی۔ یعنی کچھ علم آدم کو بالفعل دے دیا اور باقی تمام علوم اور حقائق و معارف کے لیے بے انتہا خزانوں کی کنجیاں اس کے حوالے کر دی۔ اسی لیے نوعِ انسانی آج تک ان خزانوں کے دروازے کھولتی چلی آئی ہے اور قیامت تک علوم کے نئے نئے دروازے کھولتی چلی جائے گی۔

غزل

-------مازاغ-------

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ مازاغ

قرآنی الفاظ میں "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی" (نہ تو نظر بہکی اور نہ حد سے بڑھی) پورا بیانِ واقعہ اس طرح ہے۔

"اُس کو سکھایا ہے سخت قوتوں والے نے۔ جو بڑا زور آور ہے۔ پس وہ قائم ہوا۔ اور وہ آسمان کے اونچے کنارے پر تھا۔ پھر وہ نزدیک ہوا اور نیچے آیا۔ پس تھا فاصلہ برابر دو کمان کے یا اس سے بھی کم (قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی) پس اس نے وحی کی اپنے بندے کے دل میں جو کچھ وحی کی۔ نہ جھوٹ کہا دِل نے جو کچھ دیکھا۔ پس کیا تم اس سے جھگڑتے ہو اُس پر جو اس نے دیکھا۔ اور اس نے دیکھا اس کو ایک بار اور بھی۔ پاس سدرۃ المنتہٰی کے۔ جس کے پاس ہے جنت الماویٰ۔ جب کہ چھا رہا تھا سدرہ پر جو کچھ چھا رہا تھا (یعنی نور) نہ تو نظر بہکی اور نہ حد سے بڑھی۔ بے شک اُس نے دیکھیں اپنے رب کی نشانیاں بڑی بڑی"۔ (۵۳۔۵تا۱۸)

اِن آیات میں واقعۂ معراج کی بعض جزئیات کی طرف اشارہ ہے۔ صاحب مازاغ سے مراد رسول کریمؐ۔

﴿کارل مارکس کی آواز﴾

-------مریز و کجدار-------

تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش مریز وکجدار کی نمائش

فارسی ضرب المثل ہے۔ کج دار و مریز۔ یعنی پانی سے لبریز پیالے کو ٹیڑا کرو لیکن خبردار پانی گرنے نہ پائے۔

اقبال میری نظر میں

میر ولی اللہ ایبٹ آبادی

میر ولی اللہ ایبٹ آبادی کا تعلق ایبٹ آباد سے تھا۔ آپ ۱۰ جون ۱۸۸۷ء میں چکوال میں پیدا ہوئے آپ کے والد مولوی سلطان میر اردو اور فارسی کے شاعر تھے ان کا کلام مخزن میں بھی شائع ہوتا رہا۔ میر ولی اللہ اپنی ''کتاب لسان الغیب'' کی وجہ سے مشہور ہوئے ۔ آخری زمانے میں لاء کالج پشاور یونیورسٹی کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ایک درجن سے زائد کتب کے مصنف تھے ۔۱۳ دسمبر ۱۹۶۴ء کو انتقال ہوا۔
درج ذیل مضمون دراصل ایک تقریر ہے جو میر صاحب نے ۲۵ فروری ۱۹۵۳ء کو پشاور کی کسی تقریب میں کی ۔ مندرجات اقبال کے سفر ایبٹ آباد کی بعض تفصیلات پیش کرتے ہیں۔ یہ تحریر ہنوز غیر مطبوعہ ہے لہذا اسے ایک نادر تحریر کے طور پر شائع کیا جارہا ہے۔

''میں طبعاً ایک شرح نویس ہوں۔ اس لئے اپنی تقریر کا آغاز اقبال کے ایک شعر کی تشریح سے کررہا ہوں۔ علامہ مذکور فرماتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اقبال کی شاعری پرانی۔ پامال۔ افسردہ و پژمردہ روش سے بہت دور ہٹ چکی تھی۔ اس لئے ان کے شعروں میں غلو تو درکنار معمولی مبالغہ بھی بہت کم نظر آتا ہے۔ چنانچہ انکا یہ کہنا کہ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں میں آنکھوں والا ایک آدھ آدمی ہزار ہا سال کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ قطعاً کوئی مبالغہ نہیں۔ گلزار ہستی کی نرگس اگر اپنی بے نوری اور اس باغ کے لاتعداد گونا گوں اور بوقلموں پھولوں اور غنچوں کی بے نوری پر روتی ہے تو اس کا رونا سچا ہے ۔ اسے یہ محسوس کر کے تکلیف ہوتی ہے کہ چاروں طرف لاکھوں آنکھیں کھلی ہیں لیکن نور بصارت سے محروم اور ہر جانب لاکھوں دل اور دماغ ہیں لیکن

نور بصیرت سے خالی۔ ''لَھُم قلوبُ لا یفقھون بھا ولھم عین لا یبصرون بھا '' انکے دل ہیں۔لیکن سوچتے نہیں۔انکی آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں۔

معزز سامعین! اپنے ملک کی ہزار ہا ہزار سال کی تاریخ کی ورق گردانی کر جایئے۔معلوم ہوگا کہ سیالکوٹ کے شہر نے جس میں اس عرصے میں کروڑوں آدمی آئے اور گئے۔دو اور صرف دو دیدہ ور پیدا کئے۔ایک ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور ایک علامہ اقبال۔جملہ معترضہ آ گیا۔میں نے عبدالحکیم کو ملا کہا اور اقبال کو علامہ۔یہ اس لئے کہ عبدالحکیم کو ان کے معاصر ملا کہتے تھے اور اقبال کو ہم علامہ کہتے ہیں۔ملا کا لفظ سنکر آپ کو ملاں، ملانڑاں اور ملوانڑاں یاد آ گئے ہونگے۔لیکن میرے دوستو آج کا مولوی اور مولانا یعنی آپ کا ملوانڑاں اُس وقت مائی لارڈ اور اُور لارڈ کا مرادف تھا۔اور اس وقت کا ملا اس وقت ہز اگز الٹڈ لارڈ شپ کا مرادف۔انسانوں کی طرح لفظوں کی بھی سوانح عمریاں ہوتی ہیں۔ان الفاظ کے معانی میں گزشتہ تین صدیوں میں جو گراوٹ نمودار ہوئی وہ ہو بہو نقشہ ہے اس تذلیل کا جو اس عرصے میں ملت بیضا پر واقع ہوگئی۔

ملا عبدالحلیم سیالکوٹی علوم اسلامیہ کے ایک نہایت بلند پایہ فاضل تھے۔اور اسلامیات کی چند درجن نہایت مفید اور مشہور کتابوں کے مصنف علامہ اقبال کی طرح ملا صاحب بھی عالم گیر شہرت کے مالک ہیں۔ہم اگر انہیں نہیں جانتے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم صدیوں سے معارف اسلامیہ سے بیگانہ ہو چکے۔لیکن ان کے علم وفضل کا آفتاب عالم تاب آج بھی اُنکی کتابوں کے اوراق میں ضوفشانیاں اور نور پاشیاں کر رہا ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمہ آفتاب راچہ گناہ۔

عاملان قضا وقدر نے ملا صاحب کو جہانگیر اور شاہجہان کا عہد اور علامہ اقبال کو ہمارا زمانہ نصیب کیا۔دیکھئے اور ندامت آمیز نظروں سے دیکھئے کہ یہ تضاد زمانی ان دو دیدہ وروں کی صلاحیتوں پر کس طرح اثر انداز ہوئی۔شاہان مغلیہ کی علم دوستی اور ہنر پروری شہرہ آفاق ہے۔چنانچہ انہوں نے ملائے موصوف کو عمر بھر کے لئے فکر معاش کی چکی کی مشقت سے آزاد رکھا۔چنانچہ ان کی زندگی کے تمام شب وروز اور شب وروز کی تمام ساعتیں فکر سخن میں صرف ہوگیئں۔نتیجہ یہ ہوا کہ ملا صاحب کے علمی کمال کے تمام تر امکانات معرض وجود میں آ گئے اور وہ ایک زندگی میں اتنا کام کر گئے کہ آج اگر کسی کو پے در پے چار زندگیاں بھی مل جائیں تو وہ اتنا کام نہ کر سکے۔قدر دان بادشاہوں نے کئی گاؤں ان کو جاگیر میں دیئے اور کئی دفعہ ان کو چاندی کے روپوں میں تولا اور وہ روپے انہیں دے دیے۔کہا جاتا ہے کہ ہر بار چھ ہزار روپیہ انہیں ملا۔لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ روپیہ آجکل کا روپیہ نہیں تھا۔بلکہ اس ارزانی وفراوانی کے وقت کا روپیہ تھا۔جبکہ مسجد وزیر خان کے تعمیر کرنے

والے ملک کے منتخب استاد معمار چار آنے روز پر کام کرتے تھے۔

اس کے مقابلے میں افسوس اور صد ہزار افسوس کہ سیالکوٹ کے دوسرے دیدہ ور کو وہ ناقدر شناس زمانہ نصیب ہوا جب کہ ملک کی زمام حکومت اغیار کے ہاتھ میں تھی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ حکمران قوم کے مفاد کسی رنگ میں بھی اقبال کے علمی فضائل کی نشو نما سے وابستہ نہ تھے۔ پھر حکومت کو کیا غرض تھی کہ وہ اقبال کی قدر شناسی کرتی اور انہیں غم روزگار کے بارگراں سے سبکدوش کر کے ان کے ملکات علمیہ کے پھلنے پھولنے کے اسباب پیدا کرتی۔ اس لئے حکومت پر تو کوئی گلہ نہیں۔ گلہ ہے تو خود اپنی قوم پر اور اپنے آپ پر۔

من از بیگانگان ہرگز نہ نالم
بمن ہر آنچہ کرد آن آشنا کرد

قوم کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے اہل کمال کے لئے ایسے حالات پیدا کرے کہ وہ فراغ خاطر اور اطمینان قلب کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہیں اور زندہ قومیں ہمیشہ یہ فرض ادا کرتی رہی ہیں۔ لیکن ہم نے جو سلوک اقبال سے کیا۔ اسکا خیال کر کے سر جھکا لینا پڑتا ہے۔ انہیں عمر بھر فکر معیشت نے دل جمعی کے ساتھ کام کرنے کا کبھی موقعہ نہ دیا۔ اور ان کے فنی امکانات منصہ شہود پر نہ آ سکے۔ کوئی کام بھی جمعیت قلب کے بغیر سر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اور اقبال کو جمعیت قلب کبھی نصیب نہ ہوئی۔ چند در چند تصنیفات تو خیر۔ ان کی ایک کتاب کی بھی اگر کما حقہ اشاعت ہو جاتی تو وہ ایسے تمام کاروبار سے فارغ ہو جاتے جو ذرائع معاش کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یو۔ پی کے ایک صاحب ایک دن اپنے ایک دوست کے ساتھ بیٹھے راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے۔ کہ یکا یک اٹھے اور جانے لگے۔ دوست نے کہا۔ کیا جلدی ہے۔ بیٹھو۔ یوپین صاحب بولے۔ جان من ابھی اور عشق کرتے۔ لیکن گھر میں کچھ کام ہے۔ میرے دوستو۔ یہ گھر کے کام آدمی کو کسی کام کا نہیں چھوڑتے۔ اور اقبال جب تک جیئے گھر کے کاموں سے فارغ نہ ہوئے اور یہ ہمارا قصور تھا۔ خود مجھے انہوں نے کئی دفعہ یہ پوچھا کہ تم اپنی کتابوں کی اشاعت کا کیا انتظام کرتے ہو۔ میں یہ سن کر حیران ہو جایا کرتا تھا کہ بار الہٰا۔ کیا اقبال کے جواہر پاروں کے لئے بھی خریدار ڈھونڈھنے پڑتے ہیں۔

اقبال کا اور ہمارا وہی پنجابی ضرب المثل والا معاملہ رہا۔ کہ ”گھول گھماونے سٹھہ گز۔ پر پھاڑ نہ دیوے ادھ گز۔“ ہم ہمیشہ ان کے سامنے اور ان کے بعد ان کی تعریفوں کے پل باندھتے رہے۔ لیکن ان کی تصنیفات کی اشاعت کی طرف سے ہمیشہ آنکھیں بند رکھیں۔

اگر الحمد خواہی صد بخوانند

یہ نینا رے چو خور گل بمانند

میرے عزیزو! موجودہ اجلاس میں ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے چیدہ و برگزیدہ تخمیناً تین سو اصحاب بیٹھے ہیں۔ لیکن میں بے خوف تردید یہ کہنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ ان میں بمشکل تین آدمی ایسے ہونگے۔ جنکے پاس اقبال کی تصنیفات کا مکمل سیٹ موجود ہوگا۔ اور ایسے آدمی تو شاید ڈھونڈھے سے بھی نہ ملیں گے۔ جنہوں نے اقبال کے کلام کا سر بسر مطالعہ کیا ہو۔ میں علامہ اقبال کی خود اپنی زبانی شہادت کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ ان کے ذہن میں کم از کم دو نہایت مہتم بالشان موضوعات پر نثر میں ضخیم کتابوں کا مکمل نقشہ موجود تھا، لیکن افسوس کہ زمانے کی ناقدر شناسی کے باعث وہ یہ کام نہ کرسکے ایک موضوع فقہ اسلامی کی تشکیل نو اور دوسرا معراج نبوی ﷺ کے حقایق و کوائف کے متعلق تھا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

معزز سامعین! میرا طالب العلمی کا زمانہ تھا کہ اقبال دو تین بار ایبٹ آباد تشریف لائے۔ ان کے بڑے بھائی ان دنوں وہاں پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں تھے۔ پہلی بار میں انہیں وہیں ملا۔ اس کے بعد ان کی آخری بیماری کے دوران تک ہر سال کئی کئی دفعہ میں ان کے شرف ملاقات سے مستفیض ہوتا رہا۔ سرگزشت آدم والی نظم انہوں نے پہلی دفعہ ایبٹ آباد کے ایک جلسہ میں سنائی تھی۔

سنے کوئی مری غربت کی داستان مجھ سے	بھلایا قصۂ پیمانِ اولیں میں نے
لگی نہ میری طبعیت ریاض جنت میں	پیا شعور کا جب جام آتشیں میں نے
کبھی میں ذوق تکلم میں طور پر پہنچا	چھپایا نور ازل زیر آستیں میں نے
کبھی میں غار حرا میں چھپا رہا برسوں	دیا جہان کو کبھی جام آخریں میں نے

اس نظم میں ایک شعر تھا۔

عجیب شے ہے صنم خانہ امیر اقبال

میں بت پرست ہوں رکھدی کہیں جبیں میں نے

لیکن اب یہ شعر بانگ درا میں موجود نہیں۔ اس جلسے میں انہوں نے فقہ اسلامی کی تشکیل نو کی ضرورت پر مبنی تقریر کی تھی۔ اور یہ خیال ہمیشہ ان کے دل میں رہا۔ ایک دفعہ انہوں نے اس سوال پر مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی خط و

کتابت کی مگر مولانا کی قدامت پسندی اس مسئلہ پر ان سے متفق نہ ہوسکی۔ اقبال ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اسلام جس طرح ایک سٹیریوٹائپڈ مذہب کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ وہ اس کی اصلی صورت نہیں۔ اقبال ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ ہمارے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ہم کسی مسئلہ پر بھی متقدمین کی تاویلات و توجیہات کی من وعن تقلید کریں۔ ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم ہر معاملے میں اپنی عقل سے کام لے کر اپنی رائے قائم کریں۔ میں نے ایک دفعہ اپنی ایک کتاب کو ان کے نام پر معنون کرنے کی ان سے اجازت مانگی۔ اس کے جواب میں آپ نے جو خط لکھا اس میں یہ شعر بھی تھا۔

نہ کردم گذ یہ چشمے ز افلاطون و فارابی

بچشم خود تماشائے جہان رنگ و بو کردم

لیکن افسوس ہے کہ ہم نے صدیوں سے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چھوڑ دیا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا وہ عمر بھر اس موضوع پر ایک مستقل تصنیف کی فکر میں رہے۔ لیکن لکھ نہ سکے۔

اُٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا

سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا

یہ نظم بھی اقبال نے ایبٹ آباد میں یعنی کوہ سربن کے دامن میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ اور وہیں سنائی تھی۔ لیکن جلسہ عام میں نہیں۔ میرے عزیزو! اقبال پیغام خودی کے پیغمبر۔ اقبال ہمیشہ اپنی خودی میں مستغرق رہے۔ حتیٰ کہ یہاں تک کہہ گزرے کہ۔

چناں بخویش نظر بستہ ام کہ جلوہ دوست

جہاں گرفت و مرا فرصت تماشا نیست

چنانچہ آپ نے مطالعہ اقبال کے دوران میں یقیناً یہ محسوس کیا ہوگا کہ اقبال کا مرد قلندر خود اقبال تھے اور اقبال کے شاہباز و شاہین خود اقبال۔ جن لوگوں کو اقبال کی نزدیکی نصیب ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کہ اقبال کی زندگی سرتاسر قلندرانہ زندگی تھی۔ شان قلندری پر اقبال کا یہ شعر آپ نے کئی بار پڑھا اور بارہا بار گنگنایا ہوگا۔

دم زندگی رم زندگی غم زندگی سم زندگی

غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری

اس شعر کے لفظوں سے اقبال نے خود اپنی زندگی کی تصویر بنائی ہے۔ یہ شعر نہ صرف معانی و مطالب کے لحاظ سے قلندرانہ زندگی کی توضیح کرتا ہے بلکہ اس کے الفاظ نے بھی ایک قلندر کے لیل ونہار کی روانی اور ترنم کا صحیح صحیح نقشہ کھینچ کر رکھ

دیا ہے۔اس شعر کو ایک دفعہ پھر پڑھیے۔

دم زندگی رم زندگی غم زندگی سم زندگی
غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری

ان لفظوں کی روانی اور ترنم اس ندی کی روانی اور اس کی موجوں کے ترنم کی یاد تازہ کرتی ہے۔جس کے کناروں پر بیٹھنے والے ہزار ہا اہل دل کے دل نور عرفان سے منور ہوگئے۔اقبال کے پاس بیٹھنے والوں میں بھی شاید ہی کوئی ایسا بے نصیب انسان ہو۔جو وہاں سے تہی دامان اٹھ کر آیا ہو۔ان کی کوئی بات بھی حقائق و معارف علمیہ سے خالی نہ ہوتی تھی۔ میں نے کبھی کسی شخص کا دروازہ ایسا کھلا نہیں دیکھا جیسا علامہ اقبال کا تھا۔ہر وقت ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔سکولوں اور کالجوں کے طالب علم، ٹیچر، پروفیسر، وکیل، جج، ڈاکٹر، حکیم غرض کہ تمام شعبہ ہائے زندگی کے چھوٹے اور بڑے تعلیم یافتہ لوگ دن بھر ان کے پاس آتے جاتے تھے۔رات گئے تک یہی سلسلہ جاری رہتا تھا۔کوئی دن ممنوع نہ تھا اور نہ کوئی وقت بند تھا، جو چاہے اور جس وقت چاہے آئے۔کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

ہر کہ خواہد گو بیاد ہر کہ خواہد گو برو
گیر و دار و حاجب و دربان درین درگاہ نیست

گفتگو ہر وقت علمی مسائل پر اور گاہ گاہ سیاسی مباحث پر ہوا کرتی تھی۔ان کا علمی تبحر اتنا عمیق اور اتنا وسیع تھا کہ موضوع کوئی بھی ہو وہ اس پر نہایت قادرانہ گفتگو کرتے اور نکات حکیمانہ کے دریا بہا دیتے۔

''کلمو الناس علی قدر عقو بھم'' پر کار فرما رہ کر کم استعداد طلباء سے ان کی لیاقت کے مطابق اور بڑے بڑے فضلاء سے ان کی وسعت معلومات کے موافق گفتگو کیا کرتے تھے۔کیا ایک مرد قلندر کے بغیر کوئی اور شخص اپنے اوقات گرامی کو اسطرح اپنی قوم پر وقف کر سکتا ہے۔فی الواقعہ اقبال کو نہ دم زندگی کا شمار تھا اور نہ رم زندگی کا غم۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

ہمارے بعض تعلیم یافتہ اصحاب خیال کرتے ہیں کہ اقبال کا فلسفہ خودی ماڈرن یورپین فلاسفی پر مبنی ہے۔یہ غلط ہے اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ ہم مغربی علوم میں اس درجہ منہمک ہوگئے ہیں کہ ادبیات شرقی کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اقبال پر اگر کوئی چیز اثر انداز ہوئی ہے تو وہ فلسفہ رومی ہے۔چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں۔

بیا کہ من زخم پیر روم آوردم   مے کہن کہ جوان تر زیادہ علمی ست

مولانائے روم کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے والے لوگ جانتے ہیں کہ فی الواقعہ مولانائے روم کا فلسفۂ کہن بہت باتوں میں یورپ کی ماڈرن فلاسفی سے زیادہ ماڈرن ہے۔ ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ فرائڈ نے سائکوانیلسیز اور آٹوسجشن پر جو کچھ لکھا ہے۔ وہ سب کچھ اور اس سے کچھ زیادہ مولانائے روم کے کلام میں موجود ہے۔

اقبال کا فلسفہ اگر کسی چیز پر مبنی ہے تو وہ کلام رومی ہے۔ چنانچہ اقبال نے خود اپنی اسرار خودی کے دیباچے میں رومی کے یہ شعر پیش کئے ہیں۔

دی شیخ با چراغ ہمے گشت گرد شہر ... کزد یوو دو ملولم ُانسانم آرزوست

زین ہمر ہان ست عناصر ولم گرفت ... شہر خدا و رستم و ستانم آرزو ست

گفتم کہ یافت مے نشود جستہ ایم ما ... گفت آن کہ یافت مے نشود آنم آرزوست

مثنوی کے دو شعر سنیے۔ ایک پورے فلسفہ خودی کی بنیاد ان دو شعروں پر رکھی جا سکتی ہے۔

غنچہ باشی کو د کانت پر کنند ... دانہ باشی مر غکانت بر جنند

غنچہ پنہاں کن گیاہ بام شو ... دانہ پنہاں کن بکلی دام شو

فلسفہ خودی پر اقبال کا ایک نہایت تند، تیز اور تلخ شعر ہے۔

در حلقہ دام تو جبریل زبوں صیدے

یزداں بکمند آورا ے ہمت مردانہ

دیکھئے یہ شعر رومی کے جس شعر پر مبنی ہے وہ اس سے بھی تندتر، تیز تر اور تلخ تر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

بز یر کنگرہ کبر باشی مردانند

فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

اقبال نے تو یہ سن رکھا تھا کہ باخدا دیوانہ باش و با پیمبر ہوشیار۔ اس لئے فرشتہ و یزداں تک ہی بات رہنے دی لیکن مولانائے روم نے پیمبر کو بھی نہ چھوڑا۔ بڑوں کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ ہم کم بضاعت لوگ کیا کہہ سکتے ہیں۔

اقبال صرف شاعر ہی نہ تھے۔ ایک بلند رتبہ فلاسفر بھی تھے۔ لیکن اس لائن میں سوائے ان چند انگریزی لیکچروں کے جو ایک مجلّد کی صورت میں چھپ چکے ہیں وہ اور کچھ کام نہ کر سکے۔ جسکی ذمہ داری قوم پر ہے۔ اقبال کی سی ہستیاں عطائے یزدانی ہوتی ہے اور قوم کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ان کی قدر کرے۔ لیکن ہم نے اقبال کو عطائے ماوشما کی طرح بلقائے

ماؤشما بخش دیا اور بیف کر بیٹھ گئے۔ نظام حیدر آباد (دکن) کی علم پروری کے قصے آپ نے سنے ہونگے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اقبال اس طرح کی قدر شناسی سے بھی بہرہ ور نہ ہو سکے۔

جن اصحاب نے مہاراجہ سر کرشن پرشاد اور اقبال کی خط و کتابت کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ علامہ موصوف دکن کی سرپرستی سے اس لئے مستفید نہ ہو سکے۔ کہ وہاں سے کچھ حاصل کرنے کے لئے انسان کو جتنا جھکنا پڑتا تھا وہ اتنا کسی قیمت پر بھی نہ جھک سکتے تھے، ان کا مشرب تو یہ تھا کہ

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اقبال تمام عمر الفقر فخری کے وظیفے پر گزر اوقات کرتے رہے۔ اور زبان حال سے کہتے رہے۔ ''اضاعونی و ایّ فتی اضاعوا''۔ ان لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور دیکھو کیسے آدمی کو ضائع کیا۔

آخر کار آج سے پندرہ سال پہلے آج ہی کے دن ملا اعلیٰ سے انہیں یہ پیغام پہنچا۔

اے بلند نظر شاہباز سدرہ نشیں — نشیمن تو نہ این کنج محنت آباد است
تراز کنگرہ عرش مے زنند صفیر — ندانمت کہ درین دامگہ چہ افتاد است

اور وہ اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس دامگاہِ محنت آباد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اقبال کا تصورِ فطرت اور جدید ماحولیاتی تحریک

ڈاکٹر اشرف عدیل
پشاور یونیورسٹی

اقبال کا فلسفیانہ نظامِ فکر بنیادی طور پر مطلق عینیت یا آئیڈیلزم کی ایک قسم ہے۔ اس کے مطابق ذات باری تعالیٰ ایک خودی مطلق ہے اور ساری کائنات بھی خودیوں کی ایک کالونی ہے جس میں انسان اپنے شعورِ ذات کی وجہ سے دوسری اشیاء کی نسبت خودی کے بلند تر درجے پر فائز ہے۔ علامہ صاحب کے نظامِ فکر کے مطابق فطرت کی سبھی اشیاء یعنی حیوان، پودے اور بے جان چیزیں، اپنی اپنی جگہ ایک خودی کی مالک ہیں علامہ کے نزدیک یہ سبھی خودی کے مختلف مدارج پر فائز ہیں۔

حال ہی میں ماحولیاتی تحریک کے زیرِ اثر اسلام اور دوسرے عالمی مذاہب پر بعض جدید مفکرین نے ماحولیاتی تنقیدوں کے کچھ سلسلے پیش کئے ہیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک فطرت، انسان کے فائدے کے لئے پیدا کی گئی ہے اور اس کے اندر کے وسائل کے استعمال اور اس کی تسخیر و استحصال ہی کے ذریعے انسان ترقی کر سکتا ہے۔ گویا جدید ٹیکنالوجیکل تہذیب کی تکنیکی عقلیت کی بنیادوں میں اسلام، عیسائیت اور اسطرح کا نکتہ نظر رکھنے والے دوسرے مذاہب کا فطرت کا یہی نظریہ کارفرما ہے۔ اس طرح ٹیکنالوجیکل تہذیب نے جدید دور میں فطرت کا جو استحصال کیا اور جو ماحولیاتی بحران پیدا کیا ہے اس کی ذمہ داری ایک حد تک ان مذاہب پر بھی پڑتی ہے۔

ماحولیات والوں کی اس تنقید کو آگے بڑھاتے ہوئے حال ہی میں پروفیسر افراسیابی نے بوسٹن سے ایک اہم تحقیقی مقالے میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس تنقید کا موثر اور تشفی آمیز علمی جواب پوری اسلامی تھیالوجی کے اندر نہیں ملتا۔ پروفیسر صاحب کے خیال میں فطرت کی ماحولیاتی تحریک کے حوالے سے تعبیرِ نو کی روشنی میں ایک نئی اسلامک تھیالوجی وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ جو نہ صرف اسلام کی تاریخی روایت کے ساتھ مستند طریقے سے منسلک ہو بلکہ جدید ترین عہد کے ماحولیاتی تقاضوں کو بھی پورا کر سکے اور اسلام پر ماحولیاتی تنقید کا موثر، علمی تدارک کرنے کے قابل ہو۔ اس سلسلے میں

پروفیسر افرسیابی کے نکتہ نظر کے مطابق اقبال اور ان کے سلسلے کے دوسرے مفکرین نے اسلام میں الٰہیات کی تشکیل نو کی جو بھی کوشش کی ہے اُن میں فطرت کا instrumental اور utilitarian تصور دیا گیا ہے اور یہ ساری کوششیں اسلامی ماحولیاتی تنقید کا جواب دینے کے قابل نہیں ہیں۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:

> From Abduh to Iqbal to Shariati, and so on, a common thread of the co-called reconstructive projects in Islam has been a near complete obliviousness to the need to infuse a credible ecological dimension. Thus, whereas Iqbal's pioneering "reconstruction of Islamic thought" was for the most part, except at the most abstract theological level, closed to ecological insights Shariati, on the other hand, invoked the anti-ecological view of nature as the "objectified other" by describing nature as a "prison". This deplorable lacuna in the reconstructive project has had vast ecological and even cultural implications; unintentionally, at lest, it skewed the course of the modernist Islamic though: in the direction of humanism and anthropocentricism, without achieving any major progress in Islamic theology of nature, and consequently, without addressing the limitation of the pre-existing views of nature___ as a prison or as metaphoric "place of forgetfulness"(Ibn al-Arabi) or as "dream of a sleeper" (Rumi).("Towards an Islamic Ecology" K.L.Afrabiabi, Hamdard Islamic. Vol XVII No.1, p.37)

پروفیسر افراسیابی کا خیال ہے کہ نہ صرف جدیدیت کے حامل اقبال اور شریعتی وغیرہ جیسے مفکرین بلکہ revivalist یا احیاء کے علمبردار مفکرین یا علم کی اسلامائزیشن کرنے والے دانشور بھی اس تنقید کا موثر جواب نہیں رکھتے ہیں اور شیعہ فقہ کے جدید ترین آیات الٰہم یعنی خوئی، بروجروی، منتظری اور خمینی وغیرہ بھی اس تنقید کے جواب یا ماحولیاتی حوالے سے فطرت پر نظر ڈالنے کے علمی رویہ سے بہرہ ور نہیں ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ افراسیابی کا یہ مقالہ اسلام کی نو تشکیلی اور احیائی تحریکوں اور روایتی فقہی کام کو جدید ماحولیاتی تحریک

کے non-isntrumental نظریہ فطرت سے عاری سمجھتا ہے۔ اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ اس وقت اسلام میں ایک نئی ecotheology ماحولیاتی الٰہیات کی تشکیل کی ضرورت ہے جو روایت کی روح سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ فطرت کے اندر تمام زیست کے تقدس اور فطرت کی intrinsic value کو سامنے لا سکے اور عصری ذہنوں پر گرفت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ افراسیابی اس طرح کی ecotheology کے تقاضوں کی تفصیل بھی بتاتے ہیں۔

اب احیائی یا نوتشکیلی فکری تحریکوں کے بارے میں افراسیابی کے جو خیالات ہیں اُن کا جامع جواب دینے کے لئے ظاہر ہے ان تحریکوں کے لٹریچر کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ یہ کام اس مختصر مضمون کے احاطہ کار سے باہر ہے۔ تاہم نو تشکیلیت کے اہم ترین نمائندہ اقبال کے حوالے سے میری ناقص رائے میں افراسیابی صاحب کے خیالات ایک حد تک درست نہیں ہیں۔

اس مضمون کا مقصد ایک طرف تو اقبال کے نظریہ فطرت کی وضاحت ہے تاکہ اُس پر ماحولیاتی حوالے سے بعض اعتراضات کی نادرستگی واضح ہو جائے (اگرچہ بعض دوسری قسم کے اعتراض پھر بھی درست رہیں گے۔) دوسری طرف میں اقبال کے نظریہ فطرت میں کچھ فلسفیانہ مشکلات کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس نظریے کی اندرونی فکری مشکلات کُھل کر سامنے آ جائیں اور اسطرح جدید ترین فکر کی روشنی میں اقبال کے نظریہ فطرت کا محاکمہ ہو سکے۔

اقبال کا نظریہ فطرت

جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا اقبال کائنات کو ایک ایسا نظام سمجھتے ہیں جس کے سبھی ارکان egos کی حیثیت کے حامل ہیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ ایک All-inclusive Ego ہے جب کہ جانداروں میں انسان شعورِ ذات رکھنے والی ego ہے۔ اس لئے باقی جانداروں سے ارفع ہے۔ بے جان اشیاء بھی ego رکھتی ہیں۔ لیکن ان کی ego میں تشخص کی سطح اتنی بلند نہیں ہوتی جتنی کہ جانداروں اور خاص کر انسان کے اندر ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ فطرت میں سبھی اشیاء اپنا اپنا تشخص رکھتی ہیں جسکا مرکز اُن کی ego ہے اور سارے جانداروں یا بے جان اشیاء کے تشخصات ذاتِ باری تعالیٰ کے تشخص یا خودی سے خالق و مخلوق کے رشتے کے ذریعے منسلک ہیں۔

چونکہ اقبال کا فلسفہ معروضی عینیت یا objective idealism کا ایک version ہے اس لئے خودی مطلق اور کائنات میں پھیلی باقی سبھی egos اقبال کے نزدیک اپنے جوہر میں مادی نہیں بلکہ روحانی حیثیت کی حامل ہیں۔ کائنات پر بحث کرتے ہوئے اقبال آغاز ہی اس نکتہ سے کرتے ہیں کہ نیوٹن کے absolute یا مطلق زمان و مکان کے نکتہ نظر

سے منسلک نظریہ کہ فطرت خالص مادی اشیاء پر مشتمل ہے جدید سائنس اور فلسفہء سائنس نے رد کر دیا ہے (p.28)۔

آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی جو تعبیر پروفیسر وائٹ ہیڈ نے پیش کی ہے اقبال اُسے کافی حد تک قبول کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''پروفیسر وائٹ ہیڈ کے مطابق کائنات کوئی غیر متحرک شے نہیں بلکہ واقعات کا ایک نظام ہے جس میں ایک مسلسل تخلیقی رو کا کردار پایا جاتا ہے'' (p.36)

اضافیت پر لکھتے ہوئے برٹرینڈ رسّل نے بھی اس نکتے کو واضح کیا ہے کہ ''اضافیت کی فزکس کے لئے مادہ کوئی ایسی مستقل شے نہیں جس کی حالتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں بلکہ اب یہ ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے واقعات کا نظام بن چکا ہے۔ (مادے کا) پُرانا ٹھوس پن ختم ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ خاصیت بھی جس کے ہوتے ہوئے مادیت پرستوں کو مادہ روانی رکھنے والے خیالات کی نسبت زیادہ حقیقی نظر آتا تھا'' (p.28)

وائٹ ہیڈ کے مطابق ''فطرت کوئی ایسی غیر متحرک حقیقت نہیں جو ایک غیر حرکی خلا میں پڑی ہوئی ہے بلکہ واقعات کا ایک نظام ہے جس میں ایک مسلسل تخلیقی رو کا کردار پایا جاتا ہے اور جسے (ہماری) فکر علیحدہ علیحدہ غیر متحرک اشیاء میں کاٹ دیتی ہے۔ ان علیحدہ علیحدہ اشیاء کے باہم تعلقات سے زمان و مکان کے تصورات جنم لیتے ہیں''۔ (p.28)

زمان و مکان سے متعلق اقبال کی عالمانہ بحث میں جانے کا یہ مقام نہیں لیکن اقبال جدید تر سائنس کے رجحانات کے پیش نظر فطرت کو مادی سمجھنے کے بجائے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حقیقت روحانی یا spiritual ہے۔ وہ ان معاملات کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میری ذاتی رائے میں حقیقت بنیادی طور پر روحانی (Spiritual) ہے۔ لیکن عام طور پر پھیلے ہوئے مغالطے سے بچنے کے لئے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ آئن سٹائن کا نظریہ، جو کہ ایک سائنسی نظریہ ہے، صرف اشیاء کی ساخت سے متعلق ہے اور ان اشیاء کی حتمی حقیقت کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا اس نظریے کی فلسفیانہ اہمیت دو باتوں میں مضمر ہے۔ اوّل یہ کہ یہ نظریہ فطرت کی معروضیت نہیں بلکہ substance کے بارے میں اس خیال کو تباہ کر دیتا ہے جس کے مطابق substance مکان space کے اندر ایک سادہ جگہ پر مشتمل ہے۔ کلاسیکل فزکس کی بنیاد یہی نظریہ تھا۔ دوئم یہ کہ اس نظریے کے مطابق مکان space مادے پر انحصار رکھتا ہے۔ آئن سٹائن کے نزدیک کائنات کسی لامحدود مکان space کے اندر کوئی جزیرہ نہیں۔ یہ محدود ہے لیکن اس کی کوئی سرحد نہیں۔ اس کے آگے کوئی خالی space یا مکان نہیں۔ مادے کی غیر موجودگی میں کائنات سُکڑ کر ایک نکتے میں سمٹ جائیگی۔'' (صفحہ ۳۱)

یہاں تک تو بے جان اشیاء کے حوالے سے بات تھی۔ اس فکر کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال زمان کی حقیقت پر اصرار کرنے کے علاوہ زیست اور شعور کی توجیہہ کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک زندگی اور شعور کی مادیت اور میکانیت کے حوالے سے درست توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔ اور اسی لئے آخری تجزیے میں حقیقت مادی نہیں ہوسکتی بلکہ مادہ حقیقت کے روحانی یا فکری اصول کا شاخسانہ یا اظہار ہے۔ اقبال کے خیال میں شعور کو مادے کی refined شکل کہنا تمام علم کی صحت سے انکار کے مترادف ہے کیونکہ اسطرح شعور الگ اور آزاد عمل کے طور پر باقی نہیں رہتا۔ اس طرح زیست کی میکانکی انداز میں توجیہہ اس لئے ناممکن ہے کہ اجزاء کو جوڑنے یا اُن کے باہمی عمل interaction سے زندگی تخلیق نہیں کی جاسکتی۔ زندگی کی ہر نمود زندگی کے عمل کی نئی نمود ہوتی ہے۔ (p.35) اس طرح اقبال کے نزدیک زندگی اور شعور دونوں کی حقیقت فکری یا spiritual ہے۔ اور شعور زندگی کے آگے بڑھتے ہوئے دھارے کو متوّر کرنے والی ایک لہر ہے جو زندگی کے دھارے کا حصہ ہے۔ (p.33)

اب جہاں تک کائنات میں اشیاء کا تعلق ہے تو اُن سے ہمارا حسیات کی سطح پر رابطہ ہوتا ہے لیکن ہماری حسیات ہمیں اس سلسلے میں دھوکہ بھی دے سکتی ہیں۔

اقبال فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ کی طرح ذات کے شعور کو داخلی، قریبی اور گہرا سمجھتا ہے اور ذات کا شعوری تجربہ ہی وہ واحد تجربہ ہے جو ہمیں حقیقت کے ساتھ رابطے میں لے آتا ہے۔ ہمیں اس تجربے کے تجزیے سے ادراکِ حقیقت ہوسکتا ہے۔ جب ہم اپنی ذات کے اندر دیکھتے ہیں تو ہمیں مسلسل تبدیلی کا عمل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن مستقل اور مسلسل تبدیلی کا تصوّر زمان کے بغیر ناممکن ہے۔ اس طرح شعورِ ذات کے تجربے کے تجزیے سے زندگی زمان کے اندر مستقل تبدیلی کے عمل کے طور پر سامنے آتی ہے۔ وجود کا اصل جوہر حقیقی زمان (duration) ہے اور زندگی ہر لمحہ اپنے تخلیقی عمل کے ذریعے تبدیلی سے گزر رہی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر ہم کائنات کو بھی شعورِ ذات کے تجربے پر قیاس کریں تو ساری کائنات ایک آزاد تخلیقی عمل یا حرکت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ یہاں وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جدید سائنس کے نزدیک بھی کائنات میں ایٹمز کا اصل جوہر برق ہے۔ اُن کے مطابق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایٹم کوئی برقیت رکھنے والی شے ہے۔ نہیں، ایٹم خود برق ہے۔ اس طرح جنہیں ہم اشیاء کہتے ہیں وہ فطرت کے تسلسل میں شامل واقعات events ہیں جنہیں ہماری فکر عملی ضروریات کے تحت مکانیت کے مختلف سانچوں میں بانٹ دیتی ہے۔ لیکن اپنی خالص حالت میں فکر زندگی سے الگ نہیں بلکہ زندگی ہی ہے۔ فکر اور زیست ایک ہی اکائی کے نام ہیں۔ لیکن چونکہ زندگی کے اندر توجہ کا عمل جاری وساری رہتا ہے جو

بے مقصد نہیں ہو سکتا اس لئے زندگی بھی بنیادی طور پر ایک مقصدی عمل ہے۔ اس لئے اگر شعورِ ذات کی analogy پر دیکھا جائے تو حقیقت اندھے تحرک کا نام نہیں بلکہ یہ مقصدی ہے۔ اس طرح فکر، زندگی اور مقصد مل کر وہ اکائی بناتے ہیں جسے ہم حقیقت کہتے ہیں۔

یہاں اقبال یہ بتاتے ہیں کہ برگساں کی غلطی یہ تھی کہ اُس نے Pure Time کو Self پر منطقی لحاظ سے اولیت دی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زمان ہو یا مکان دونوں واقعات کی کثرت کو ایک اکائی میں نہیں پرو سکتے۔ یہ ایک مستقل ذات ہی کا کام ہے کہ وہ اشیاء اور واقعات کی کثرت کو ایک organic wholenesss میں مجتمع کر دیتی ہے۔ اس لئے خالص duration میں وجود رکھنے کا مطلب ایک self یا ذات ہونا ہی ہو سکتا ہے۔ اور self ہونے کے معانی یہ ہیں کہ I amness کا وجدان حاصل ہو۔ اقبال کے نزدیک I amness کے وجدان کی ڈگری یا مقدار ہی حقیقت کے نظام میں کسی شے کے مقام کا تعین کرتی ہے۔

ہم انسان بھی I am کہتے ہیں لیکن ہمارا I amness اضافی ہے اور ذات اور غیر ذات کی تمیز کرنے پر منحصر ہوتا ہے۔ خودی مطلق یعنی ذاتِ باری تعالیٰ اسطرح کی تمیز سے بالاتر ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے غیر ذات سامنا کرنے والی دُوسری شے نہیں بلکہ جسے ہم ''فطرت یا غیر ذات کہتے ہیں وہ خدا کی زندگی میں ایک تیرتے ہوئے لمحے سے زیادہ نہیں''۔ اُس کی I amness ہر طرح سے آزاد و بے نیاز، بنیادی اور مکمل ہے۔ اس طرح کی ذات کا درست تصور ہمارے محدود اذہان نہیں کر سکتے۔ جہاں تک فطرت کا تعلق ہے تو وہ خلا میں پڑا مادے کا ڈھیر نہیں بلکہ واقعات کا ایک نظام اور، عمل و کردار کا ایک منظّم انداز ہے۔ اس حیثیت میں نیچر ذاتِ باری تعالیٰ سے منسلک ہے۔ اور جیسے کردار انسانی ذات سے منسلک ہوتا ہے، نیچر نتیجتاً خدا کی ذات سے منسلک ہے۔ انسانی نکتۂ نظر سے یہ خدا یا خودی مطلق کے تخلیقی عمل کی وہ تعبیر ہے جو ہماری موجودہ صورتِ حال میں ہم سے ممکن ہے۔ اپنے آگے کی طرف تحرّک میں کسی خاص لمحے کے حوالے سے نیچر محدود یا finite ہے لیکن وہ ذات جس کا یہ حصّہ ہے خالق ذات ہے اس لئے نیچر یقیناً پھیلتی رہے گی اور اس طرح یہ اس معنی میں بغیر حدود کے ہے کہ اس کے پھیلاؤ کی کوئی حد آخری حد نہیں۔ تو ہمیں فطرت کو ایک جاندار اور مستقل ارتقاء پذیر عضویہ سمجھنا چاہیے جس کے ارتقاء کی کوئی آخری بیرونی حد نہیں ہے۔ اس کی واحد حد اندرونی ہے یعنی وہ داخلی ذات Immanent self جو اسے زندگی دیتی ہے اور قائم رکھتی ہے۔'' (p.45)

اقبال اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے اس نکتہء نظر کے تحت فزیکل سائنسز کے بھی ایک

رُوحانی معانی نکلتے ہیں اور ''فطرت کا علم خدا کے عمل و کردار کا علم'' بن جاتا ہے۔ ''فطرت کے مشاہدہ کے ذریعے ہم عملاً مطلق ایگو (ذاتِ باری تعالیٰ) کے ساتھ ایک طرح کی قُربت کی تلاش میں ہوتے ہیں اور یہ عبادت ہی کی ایک اور قسم ہے۔'' ایضاً

ذاتِ باری تعالیٰ یا مطلق ایگو اور مخلوقات کے تعلق کو واضح کرنے کے لئے اقبال مزید کہتے ہیں: ''میں نے حتمی حقیقت کو ایگو متصور کیا ہے اور مجھے اس بات کا اضافہ کرنا چاہیے کہ مطلق ایگو سے صرف ایگوز ہی خلق ہوسکتی ہیں۔ مطلق ایگو کی تخلیقی انرجی، جس میں فکر اور عمل یکجا ہو جاتے ہیں، ایگو اکائیوں کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ دُنیا اپنی تمام تفصیلات کے اندر مادی ایٹم کی میکانکی حرکت سے لیکر انسانی ایگو میں فکر کی آزاد حرکت تک عظیم ذاتِ باری تعالیٰ ہی کا اظہار ہے۔ اُلو ہی انرجی کا ہر ایٹم خواہ وہ وجود کی میزان میں کتنا ہی نچلے درجے پر واقع ہوا ایک ایگو ہوتا ہے۔ لیکن ایگو کے اظہار کے اپنے درجے ہوتے ہیں۔ وجود کے سارے سلسلوں میں بتدریج بڑھتا ہوا ایگو کا اصول آخر کار انسان کی ذات میں تکمیل پاتا ہے۔ اسی لئے قرآن مطلق ایگو یا ذاتِ باری تعالیٰ کو انسان کی شاہ رگ سے بھی قریب تر بتاتا ہے۔'' (p.57)

''زمان و مکان اور مادہ ہماری فکر کی تعبیریں ہیں جو ہماری فکر خدا کی تخلیقی انرجی کو سمجھنے یا اُسے deal کرنے کے لئے کرتی ہے۔'' (p.53)

ھستی و نیستی از دیدن و نا دیدنِ من
چہ زمان و چہ مکاں شوخیِ افکارِ من است

مختصر یہ کہ اقبال کے نزدیک کسی بھی شے کی حقیقت کا انحصار اُسکی خودی پر ہوتا ہے۔ کائنات ساری egos کا نظام ہے اور وہی شے حقیقی ہے جس کے اندر individuality کی کچھ نہ کچھ مقدار موجود ہے۔ خودی کے درجے کے ساتھ حقیقت کے درجے کا تعین ہوتا ہے۔ یہاں اب تھوڑی سی وضاحت اقبال کے تصورِ خودی کی بھی ضروری ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی اعمال (acts) کا ایک نظام ہے۔ اقبال جسم کو بھی اعمال اور واقعات events کا نظام ہی گردانتے ہیں اور اس لئے گہری سطح پر جسم اور رُوح یا جسم اور خودی میں اقبال کے نزدیک کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ فرق صرف I amness کے احساس و شعور کی سطح اور درجے کا ہے۔ خودی کے حوالے سے مزید وضاحت کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ یہ ہماری ذہنی کیفیات mental states کو اکائی عطا کرنے والا اصول ہے۔ یہ ہمارے experiances کا مرکز ہے۔ اس کی اپنی ایک کنٹرولنگ انرجی ہوتی ہے۔ خودی مطلق یا ذاتِ باری تعالیٰ کے اندر خلق creation اور امر direction ایک

دوسرے سے جُڑے ہوتے ہیں اور کائنات میں باقی ساری egos کی تخلیق خدا کا امر ہے۔ اس طرح ساری egos اعمال کے ایک متحد نظام کی حیثیت میں directed اور مقصدی ہیں۔ اور اپنے دنیاوی career کے دوران گہرا شعورِ ذات حاصل کر لینے والی egos آخر کار Divine Presence میں لافانی حیثیت حاصل کر لیں گی۔

یہ نکتہ بھی نوٹ کر لینا چاہیے کہ انسانی خودی کی اقبال دو سطحیں بتاتے ہیں۔ ایک گہری سطح ہے جسے وہ appreciative ego یا قدر آفریں خودی کہتے ہیں۔ اور دوسری عمومی سطح ہے جسے اقبال efficient ego یا کارفرما خودی کا نام دیتے ہیں۔ efficienct ego فطرت میں Serial time یعنی ماضی حال اور مستقبل کی تقسیم والے وقت کی سطح پر کام کرتی ہے اور ہماری فکر کی عمومی سطح، جس کے اندر اشیاء کی ظاہری ٹھوس زمانی و مکانی صورتیں پائی جاتی ہیں، اسی efficient ego کی سطح ہے۔ یہ ایگو اسی سطح پر کارفرما رہتی ہے اور یہ سطح حقیقت کی ایک عام تعبیر کی سطح ہے۔

Appreciative ego یا قدر آفریں خودی وہ خودی ہے جو Duration یا حقیقی وقت کی سطح تک رسائی پالیتی ہے۔ اور کسی لمحاتی وجدانی تجربے کے دوران ماضی، حال اور مستقبل کے حصار سے نکل کر اپنی اصل حقیقت کا ادراک حاصل کر لیتی ہے۔ یہی خودی بعض اوقات روحانی تجربے کے دوران صوفی کے لئے حقیقتِ مطلق کے ادراک کی صورت پیدا کرتی ہے۔ پیغمبرانہ روحانی تجربہ صوفی سے بلند تر ہوتا ہے اور وہ اس طرح کہ اس تجربے کی بنیاد پر پیغمبر انسانیت کی فلاح اور ہدایت کے لئے عملی بصیرت اور اقدار مہیا کرتا ہے جب کہ صوفی کا تجربہ ذاتی ارتقاع پر مرکوز ہوتا ہے۔

بہر کیف اقبال کے نزدیک کائنات یا نیچر egos کی ایک کالونی یا نظام ہے جو خودی مطلق کے کردار کی طرح ہے۔ اس طرح کائنات کی ہر شے کی اصلی حقیقت رُوحانی ہے اور پوری کی پوری فطرت خودی مطلق کی زیست کا اظہار ہونے کی وجہ سے زندگی سے بہرہ ور ہے۔ پھر فطرت اُلوہی divine یا مقدس sacred ہے۔ اور جیسا کہ اُوپر نوٹ کیا گیا ہے فطرت کا سائنسی مطالعہ عبادت کی ایک قسم ہے۔

اقبال پر تنقیدوں کا جواب

اب اگر اقبال کے اس نظریہ فطرت کو اپنی ساری تفصیل کے ساتھ پیش نظر رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ اقبال پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا ہے کہ وہ فطرت کو کسی قسم کی intrinsic value سے بہرہ ور نہیں سمجھتا اور اُسے محض اس حد تک vlaueable کہتا ہے جس حد تک وہ انسان کے لئے فائدہ مند ہے۔ یہ درست ہے کہ فطرت انسانی ذات کے ارتقاء اور بقا کے لئے ضروری ہے اور اس طرح انسانی مفاد کے حوالے سے بھی instrumentally valuable ہے۔ لیکن چونکہ

اقبال کے نزدیک فطرت خودی مطلق کی زیست کا ایک حصہ ہے اس لئے اس کی اپنی تقدیس اور intrinsic value بھی ہے۔ اس لئے پروفیسر افرسیابی کا یہ الزام کہ اقبال کی نوتشکیلت اسلام پر ماحولیاتی تنقید کا جواب نہیں رکھتی اور اس سے ماحولیاتی بصیرتیں اخذ نہیں کی جا سکتیں، درست نہیں ہے۔ جدید ٹیکنالوجیکل تہذیب اور اُس کے ساتھ وابستہ تکنیکی عقل technical rationality نے فطرت کا جو غیر ضروری استحصال کیا ہے ظاہر ہے کہ اسلام کی نوتشکیلی تعبیر اسے نہ تو جائز گردانتی ہوئی نظر آتی ہے اور نہ ہی اُس کا جواز مہیا کرتی ہے۔ فطرت پر اپنی ضروریات اور بقاء کے لئے انسان کا انحصار نا قابلِ انکار ہے لیکن یہ انحصار فطرت کی تقدیس اور الوہیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پورا کیا جائے تو فطرت کی تباہی یا اُس کے اندر موجود کسی بھی جزو کی تباہی کی قطعاً اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اقبال کا نظریۂ فطرت اس اعتبار سے ماحولیاتی تحریک کی رُوح اور تقاضوں سے متضاد نہیں بلکہ اُن کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق فطرت انسان کی خودی کے لئے ایک ماحول مہیا کرتی ہے جس میں ایگو ماحول پر اور ماحول ایگو پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔ اس باہمی حملے میں ایگو تماش بین نہیں ہوتی بلکہ ایک رہنما انرجی (directive انرجی) کے طور پر موجود رہتی ہے اور ماحول کا تجربہ اُسے discipline عطا کرتا ہے۔ شعورِ ذات کا مالک ہونے کی وجہ سے انسان خودی کے بلند تر درجے پر فائز ہے اور اس لئے فطرت کو سنوارنے اور improve کرنے کا ذمہ دار بھی ہے اور خواہش مند بھی ہوتا ہے۔

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تُو کر

تو شب آفریدی چراغ آفریدم	سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی	خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم	من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

فروغِ آدم خاکی زتازہ کاری ہاست	مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند
طرحِ نو افگن کہ من جدّت پسند افتادہ ایم	ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ اقبال کے فلسفے میں سائنس کا مقصد conquest of nature یا

تسخیر فطرت نہیں بتایا گیا۔ سائنس کا مقصد فطرت اور زندگی کی تخلیقی رو کو سمجھنا اور اس عمل میں فطرت کو بہتری کی سطح پر لے جانے کی کوشش کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام فطرت کو تباہ کر کے نہیں کیا جا سکتا بلکہ فطرت کی فورسز کے ساتھ coordination یا ہم آہنگی پیدا کر کے سرانجام دیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ میری رائے میں اقبال پر پروفیسر افراسیابی کی تنقید درست نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میں آخر میں یہ عرض کرتا چلوں کہ اقبال کے نظریۂ فطرت میں کچھ اندرونی فلسفیانہ مشکلات موجود ہیں۔ Reconstruction کے پانچویں لیکچر میں وہ کہتے ہیں۔

"...the first half of the formula of Islam has created and fostered the spirit of a critical observation of man's outer experiance by divesting the forces of Nature of that Divine character with which earliar cultures have clothed them"(p.101)

وہ ایک بہت دلچسپ جملہ ہے۔ یہاں اقبال پہلی ثقافتوں پر اس لئے تنقید کر رہے ہیں کہ انہوں نے نیچر کو الوہی یا divine حیثیت دیدی تھی۔ جبکہ کلمہ طیبہ کا پہلا حصہ نیچر کو اس کردار سے عاری قرار دیتا ہے۔

میری ذاتی رائے میں اس جملے میں اقبال کے نظریہ فطرت کے لئے سب سے بڑی فلسفیانہ مشکل مضمر ہے۔ اول تو یہاں اقبال نے جو کہا ہے وہ نیچر کے بارے میں اُن کی دوسری بہت ساری statements کے ساتھ متصادم دکھائی دیتا ہے۔ جیسا کہ اوپر میں نے نوٹ کیا ہے۔ وہ خود ہی کہتے ہیں:

What we call Nature or not-self is only a fleeting moment in the life of God.(p.45)

یا پھر کچھ آگے چل کر اسی دوسرے لیکچر میں لکھتے ہیں۔

Nature is to the Divine Self as character is to the human self.(Ibid)

ظاہر ہے کہ ان بیانات میں علامہ صاحب نیچر کے Divine یا اُلوہی ہونے کا ذکر کر رہے ہیں جو اُن کی متذکرہ بالا پوزیشن سے متصادم نکتۂ نظر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ فطرت کو اُلوہی قرار دینے والے کسی بھی مسلمان مفکر کو یہ مسئلہ ضرور درپیش آئے گا کہ وہ اپنی پوزیشن کو کلمۂ طیبہ کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ کرے۔ علامہ اقبال نے اس نکتہ کو اُوپر دی گئی statement میں اُٹھایا

ضرور ہے لیکن لگتا ہے اُنہیں یہ احساس نہیں ہوا کہ کس طرح کی تعبیر کر کے وہ نیچر کو اُلوہی قرار دینے کے باوجود کلمہ کی موحدانہ رُوح کے ساتھ اپنے نظریہ فطرت کی ہم آہنگی یقینی بنا سکتے ہیں۔ میرے ذاتی خیال میں شاید اس مشکل کے حل کے لئے اقبال یہ کہیں گے کہ نیچر مخلوق ہے اور امرِ ربی سے وجود میں آنے کی وجہ سے خدا کے کردار کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی لئے ایک محدود معنوں میں divine یا اُلوہی ہے۔ جبکہ وہ پچھلی ثقافتیں جنہیں اقبال کی اوپر دی گئی statement کے مطابق کلمہ طیبہ مسترد کرتا ہے وہ نیچر کو مخلوق نہیں بلکہ خدا ہی سمجھتی تھیں اور نیچر کی اُلوہیت کا تصوّر اُن کے ہاں نیچر کی خدائی کا سا تصوّر تھا۔ بہر حال اقبال کے فلسفۂ فطرت میں اس tension یا مسئلے کو جس طرح بھی حل کیا جائے بنیادی بات یہ ہے کہ اقبال فطرت کو تقدیس اور اُلوہیت کی خصوصیات سے بہرہ مند سمجھتے ہیں اور اس طرح اُن کا فلسفۂ فطرت جدید ماحولیاتی تحریک کی رُوح سے متصادم نہیں بلکہ اُس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

حوالہ جات

1) K.L Afrasiabi, "Toward an Islamic Ecotheology", Hamadard Islamic, vol.XVIII,Spring 1995,NO 1,pp.33-49

2) M.Iqbal, Reconstruction of Religious Thought in Islam", Edited by M.Saeed Sheikh,Lahore,1986

اقبال اور فرید کا نظریہ عشق

ڈاکٹر میاں مشتاق احمد
شعبہ اُردو و اقبالیات
اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور

خواجہ فریدؔ اور علامہ اقبالؔ سرزمینِ پنجاب کے دو ایسے فکری راہ نما ہیں جن کا زمانہ ماضی قریب کا ہے۔ خواجہ فریدؔ، علامہ اقبالؔ سے صرف بتیس سال پہلے پیدا ہوئے۔ خواجہ فریدؔ کے آخری ایام میں اقبالؔ کا کلام شائع ہو رہا تھا (۱) علامہ اقبالؔ نے تصوف پر تحقیق کی ہے اور خواجہ فریدؔ خود صوفی تھے پھر کئی ایسی شہادتیں ملتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ فریدؔ کی ذات، علمی مرتبے اور شاعرانہ حیثیت کے بارے میں علامہ صاحب کو بخوبی علم تھا مثلاً ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''حضرت خواجہ فریدؒ کی کافیاں علامہ صاحب سنا کرتے تھے۔ آخری ایام میں ایک ملازم دیوان علی انہیں یہ کافیاں سنایا کرتا تھا۔ دیوان علی بھی علی بخش کا رشتہ دار تھا۔ آپ سرائیکی اور پنجابی۔۔۔ سے مستفید ہوتے تھے'' ۲

خود علامہ اقبال لکھتے ہیں:

''جس قوم سے خواجہ سلیمان تونسوی، شاہ فضل الرحمٰن اور خواجہ فریدؒ چاچڑاں والے اس زمانے میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں اس کی روحانیت کا خزانہ ابھی ختم نہیں ہوا'' ۳

ایک اور جگہ علامہ اقبال کہتے ہیں:

''رہا ستاروں میں پہنچنا، ان کی سیاحت کرنا ہو، جس طرح ابن العربی کی تحریروں سے دانتے کو تحریک ہوئی کہ واقعتاً نہ سہی، عالم خیال ہی میں سہی ستاروں کا رخ کرے۔۔۔ ایک بزرگ چاچڑاں شریف حضرت خواجہ فرید علیہ الرحمۃ کا بھی ایک رسالہ سیاحتِ افلاک میں ہے انہوں نے لکھا ہے۔ کس طرح ان کا گزر بعض سیاروں میں ہوا'' ۴

اسی طرح مولانا طالوتؔ جو اپنے وقت کے بڑے ماہرِ فریدیات ہیں اور علامہ اقبالؔ سے ان کا رابطہ ثابت ہے، وہ اپنے تحریر کردہ مقدمہ ٔ دیوان فریدؔ میں، اقبالؔ کا، خواجہ فریدؔ کے کلام پر تبصرے کا ذکر کرتے ہیں ۵ پھر صوفی تبسمؔ کا معہ ساتھیوں کے، اقبالؔ سے وہ مکالمہ جو اردو ڈائجسٹ میں شائع ہو چکا ہے ۶ اور اس طرح کی کئی

اور خارجی شہادتیں موجود ہیں لیکن داخلی شہادتوں کی تلاش بھی منطقی جواز لئے ہوئے ہے۔ اقبالؔ، جو صوفی ازم پر تحقیق کر رہے تھے، اپنے علاقے اور اپنے عہد کے اتنے بڑے صوفی کے بارے میں ضرور جانتے ہوں گے، جو کئی والیان ریاست کا مرشد ہے، جن ریاستوں سے اقبالؔ کا تعلق ہے اور پھر وہ شاعر ہے جسے بھرپور عوامی مقبولیت بھی حاصل ہے۔ اس کی شاعری اقبالؔ خود بھی سنتے ہیں اسی پنجاب کی زبان بولنے والا، علامہ اقبالؔ صرف اس کی شاعری ہی سے نہیں بلکہ خواجہ فریدؔ کی ان کتابوں سے بھی آشنا ہے جو عام لوگ زیادہ نہیں جانتے ہے

ایک اور نکتہ یہ بھی توجہ طلب ہے کہ اقبالؔ نے اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ خواجہ فریدؔ کو علاقائیت میں محدود کر دیا گیا اور وہ فریدؔ میں آفاقی عناصر دیکھتے ہیں جی ہاں! کائنات کا وہ اہم نکتہ، کوئی فنی مسئلہ نہیں ہے بلکہ نظریاتی ہے، جس کا ایک بنیادی حوالہ فلسفۂ عشق ہے جو تربیتِ انسانی کے لیے لازم اور شرطِ ارتقائے آدمیت ہے، وجہ حصولِ مقامِ عشق ہے جب انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ طلب کی یکتائی و وحدت سے شناسا ہو جاتا ہے عشق اس کا رہنما بن جاتا ہے اور مقامِ عشق سے سرفراز ہو جانے والوں کے لیے منزلیں بقول خواجہ فریدؒ:

تھل مارو دا پینڈ اسارا　　　　تھیسم ہک بلانگھ

اور بقول اقبال:

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام　　　　اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

یہاں امرِ خواجہؒ یوں ہے کہ:　　سِکھ ریت روِش منصوری نوں

سکھانا کیا ہے؟ روش منصوری، کیا ہے؟ ''انا الحق'' یعنی بتایا تھا کہ میں جان گیا ہوں کہ میں کیا ہوں؟

جو کوئی عشق مدرسے آیا　　　　فقہ اصول دا فِکر اٹھایا

بے شک عارف ہو کر پایا　　　　رمز حقیقت پوری نوں

جو کوئی چاہے علم حقائق　　　　رازِ لدنی کشفِ دقائق

تھیوے اپنے آپ دا شائق　　　　سٹ نزدیکی دوری نوں

اور متاعِ فقر کیا ہے فریدؔ فرماتے ہیں:

نینہہ فریدؔ فقر دی موڑی　　　　باجھ برہوں دے گُل گل گوڑی

اور اقبالؔ علیہ الرحمۃ کیا فرماتے ہیں؟ مسجد قرطبہ کا پہلا بند پڑھیے

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق　　عشق نہ ہو تو شرع و دیں، بت کدہء تصورات

من بندہء آزادم، عشق است امامِ من　　عشق است امامِ من، عقل است غلامِ من

اور عشق کی ابتدا، اس کا پہلا سبق سوز، جب تک کہ وہ ساز میں نہ ڈھل جائے! کیا مزہ ہے اس سوز میں؟ کیا لذت ہے؟ کیا مستی ہے؟

متاعِ بے بہا ہے سوز و سازِ آرزو مندی　　مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

عشق مدرسے آکر عشق پالینے والا کیا بن جاتا ہے؟ بقول فریدؔ:

عشق ہے ہادی پریم نگر دا　　عشق ہے راہبر راہ فقر دا

عشقوں حاصل ہے عرفان　　عشق اساڈا دین ایمان

جڈاں حضرت عشق استاد تھیّا　　سب علم و عمل برباد تھیا

پر حضرت دل آباد تھیّا　　سو وجد کنوں لکھ حال کنوں

عشق فرید نہیں اج کل دا　　روز ازل دی مُٹھیاں

ہے پیت فریدؔ دی ریت عجب　　ہے درد تے سوز دی گیت عجب

سن سمجھو سارے اہل صفا　　سبحان اللہ، سبحان اللہ

اور جب کوئی مقام عشق پالیتا ہے تو قلندر کہلاتا ہے جس کا تعارف فریدؒ یوں کراتے ہیں کہ:

جو ہے مردِ محقق، موقِن　　اوسدا تھیا شیطان بھی مومن

حق الیقین، نفسِ مطمئنہ کس کے پاس ہوتا ہے؟ سچے صوفی کے پاس بقول فریدؔ:

ہیں عشق دے ملک دے میر اساں

اور بقول اقبالؔ:

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی　　کُھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ　　عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

علامہ اقبالؔ، رومیؔ کو پیر کہتے ہیں اور خواجہ فریدؒ، ابن العربی کو مرشد مانتے ہیں۔ دونوں فن شعر کو اپنے پیغام کے مقابلے میں ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ دونوں انسانی جوہر کی نشو ونما کے لیے تربیّت کا نظام وضع کرتے ہیں۔ دونوں انسانِ

کامل کی شخصیت کی تعمیر و ترتیب کا مقصد لئے ہوئے ہیں۔ دونوں کے ہاں عشقِ مصطفےٰ علیہ میں سچائی، گہرائی اور گیرائی ملتی ہے، دونوں کے ہاں قرآن وحدیث کو بنیادی حوالہ بنایا گیا ہے۔ اقبالؔ، اکابرِ تصوف کو نہ مانتے تو مولانا رومؔ کے گرویدہ کیوں ہوتے۔ اقبالؔ، حضرت مہرعلی شاہ گولڑوی کو لکھتے ہیں:

''۔۔۔ ابن العربی پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے بایں حال، چند امور دریافت طلب ہیں'' ۸

اقبالؔ کے نزدیک عشق کا تصور نہایت وسعت رکھتا ہے یہ ایک ایسی قوت ہے جو خودی کی شیرازہ بندی کرتی ہے

قاضی جاوید کہتے ہیں:

''خواجہ فریدؔ کی زندگی میں ان کے تجربہء عشق کو بہت اہمیت حاصل ہے۔۔۔ جب کوئی تجربہ ذات کی گہرائیوں تک اتر جائے تو وہ ذات کو مکمل طور پر گرفت میں لے کر اس کی تشکیل نو کر دیتا ہے'' ۹

مجنوںؔ گورکھپوری کے مطابق:

''خواجہ فریدؔ ''جمال یار'' کے خیال میں نہیں بلکہ ''خیال یار'' کے جمال میں محو ہو جانے کی تحریک کرتے ہیں'' ۱۰

اور بقول خود خواجہ فریدؔ:

''عاشق مجازی کا عشق کچھ عرصے بعد زوال پذیر ہو جاتا ہے چونکہ عشق حقیقی صورت فعلیہ رکھتا ہے اور عشق مجازی صورت انفعالی رکھتا ہے'' ۱۱

خواجہ فریدؔ عشق ہی کو رمزِ حقیقی تک پہنچنے کا واحد راستہ سمجھتے ہیں ان کے نزدیک عشق ایک پاکیزہ اور غیر فانی جذبہ ہے یہ علم و عرفان کا منبع اور عمل کا محرک ہے جس سے معراجِ عرفان ومعرفت حاصل ہوتی ہے اور خواجہ فریدؔ مجاز کے پل سے گزر کر جمالِ مطلق تک رسائی پا لیتے ہیں تو فرماتے ہیں:

حسن مجازی کوڑا، ہے فانی برباد ۔۔۔ باجھ محبت ذاتی، کوجھا شور فساد

(مجازی عشق جھوٹا اور فانی ہے ذاتِ باری کی محبت کے سوا تمام شور و فساد غیر موزوں ہے)

عشق ہے ہادی پریم نگر دا ۔۔۔ عشق ہے راہبر راہ فقر دا

عشق حاصل ہے عرفان ۔۔۔ عشق اساڈا دین ایمان

(عشق ہی سرمایہء عاشق ہے یہی پریم نگر کا راستہ دکھاتا ہے یہی فقر و درویشی کی منزل کا رہبر ہے اسی سے عرفان (ذات) حاصل ہوتا ہے اس لئے عشق ہی ہمارا دین و ایمان ہے)

خواجہ فریدؔ نے کامل شعور واعتماد سے اپنا نظریہ عشق پیش کیا ہے جو انسانی شعور کو ہر لحظہ نئی توانائی ولذت عطا کرتا ہے:

قسم خدا دی قسم نبی دی ॥ عشق ہے چیز لذیذ عجیب

(اللہ و نبی کی قسم، عشق نہایت لذیذ و عجیب چیز ہے)

ان کا راستہ عام صوفیانہ روش سے اس طرح مختلف ہے کہ وہ اپنی ذات (شخصیت) کو قائم رکھتے ہیں بلکہ ان کا دعویٰ ہے کہ:

خلقت کوں جیندی گول ہے ॥ ہر دم فریدؔ دے کول ہے

سوگند پیر فخرؒ الدین ॥ ہذا جنون العاشقین

(لوگ جس محبوبِ حقیقی کی تلاش میں ہیں مرشد فخرؒ الدین کی قسم، وہ ہر دم میرے پاس ہے، اور یہی کمال عشق ہے)

خواجہ فریدؔ کا عقیدہ یہ ہے کہ عشق وجہ ءتخلیق کائنات ہے۔ جس کا ثبوت خود ذات اقدس کا فرمان ہے:

کُنتُ کنزاً صاف گواہی ॥ پہلوں حب محبوب کوں آہی

جیں سانگے تھیا جُمل جہان ॥ عشق اساڈا دین ایمان

(کُنتُ کنزاً کی حدیث قدسی ذاتِ احد کے عشق کی دلیل ہے کہ ذات باری نے اپنی نمود کی خواہش (محبت) میں جہان پیدا کیے)

فریدؔ کے نظریہ عشق کی بنیاد قرآن کے اس فرمان پر ہے کہ: انا عرضنا الامانة علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنا واشفقن منها حملها الانسان ط انه کان ظلوماً جهولاه [12]

(بے شک ہم نے امانت پیش کی آسمانوں اور زمینوں پہاڑوں پر تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور وہ اس سے ڈر گئے اور انسان نے اٹھالی۔ بے شک وہ اپنی جان کو مشقت میں ڈالنے والا بڑا نادان ہے)

فریدؒ کس ناز اور شان سے کہتے ہیں:

آپے بار محبت چایُم ڑی ॥ ونج آپ کوں آپ اڑائیم ڑی

(میں نے اپنی مرضی سے محبت کا درد قبول کیا اور اپنے آپ کو خود ہی پھنسایا)

لذتِ عشق اس قدر عزیز ہے کہ وہ" ظلوماً جھولا" کا شعور رکھنے پر بھی، عشق ہی پر راضی ہے:

گھاٹے عشق دے گھاٹے جاتے میں — تاں بھی چُم سر اَکھیاں چاتے میں

(عشق کے خسارے کو دیدہ ودانستہ چوم کر سر آنکھوں پر اٹھالیا)

عشق ان کے نزدیک ایک طرز وطریق حیات ہے اور وہ سب سکھانے والوں کو علی الاعلان کہتے ہیں:

زاہد کوں جا خبر سناؤ — عشق اساڈا دین

(زاہد کو بتادو کہ ہمارا دین (طریق) تو عشق ہے)

ٹھپ رکھ فقہ اصول دے مسلئے — باب برہوں داڈس وے میاں جی

(فقہ اور اصول کے مسائل کو لپیٹو اور مجھے تو صرف درس عشق پڑھاؤ)

پیش کیتا جیں فہم فکر کوں — لیت ولعل دی اِرکھر کوں

پڑھ کے شکر نہ ڈِتڑس سرکوں — عشق دی راہ وچ بھس پیا

(جو عقل وفکر کے وسوسوں میں الجھ گیا اور اس نعمت کو خوشی سے قبول نہ کیا وہ راہِ عشق میں ناکام رہا)

پیا عشق اساڈی آن سنگت — گئی شد مد زیز بر دی بھت

سب وسرے علم علوم اساں — کل بھل گئے رسم رسوم اساں

ہے باقی درد دی دھوم اساں — ہئ برہوں یا درہیو سے گت

(عشق سے آگہی ملی تو علم بے وقعت ہوگیا۔ علوم ورسوم بھول گئے، صرف درد کی دھوم اور عشق کی گت باقی رہ گئی)

فریدؔ کے ہاں عشق محض قال نہیں بلکہ حال ہے یہ وہ امتیاز ہے جو باقی عارفوں اور فریدؒ کے درمیان وجہ امتیاز ہے ۔وہ ایک خاص صوفیانہ پس منظر رکھتے ہیں۔ان کے ہاں زندگی کی بنیاد عشق، طریق عشق، دین عشق اور ایمان عشق ہے۔ یہ ان کے خمیر، سرشت اور روح کا بنیادی جزو ہے

دل نوں لُٹیا عشق مریلے — پھردی شہر تے جنگل بیلے

متاں فریدؔ کرے رب میلے — تانگھ، ارام ونجایا ہے

(عشق نے دل لوٹ لیا اسلئے شہروں، جنگلوں اور ویرانوں میں پھر رہی ہوں کہ شاید کہیں فریدؔ کو وصل نصیب ہو۔ اس انتظار نے چین گنوادیا)

تتی تھی جوگن چودھار پھراں ہند سندھ پنجاب تے ماڑ پھراں

سُنج بار تے شہر بزار پھراں متاں یار مِلم کہیں سانگ سبب

(میں سوختہ، جوگن بنی ہند، سندھ، پنجاب، مارواڑ میں، کبھی ویرانے میں تو کبھی شہر کے بازاروں میں پھرتی ہوں کہ کسی حیلے شاید محبوب مل جائے)

عشق لگا گھر وسریا زر وسری ور وسریا

گذریے ناز حسن دے مانے زیور تریور وسریا

(عشق لگتے ہی گھر، شوہر، حسن کے ناز اور زیور ولباس سب بھول گئے)

فریدؔ کے ہاں دردِ عشق کی ساری کیفیتیں موجود ہیں۔ وہ خود واقعتاً ان مراحل سے گزرے ہیں۔ سوزِ عشق کی ساری وحشتیں نبھائی ہیں انہوں نے عملاً لق ودق صحرا میں بیٹھ کر مراحلِ سلوک طے کیے۔ ان کے صحرائے چولستان میں گزرے اٹھارہ سال، ان کے لئے غار حرا کا سا زمانہ ہے۔ ان مدارج میں انسان ہونے کے ناطے کہیں کہیں شکستگی بھی ہے

جند سولاں دے وات نیں ڈتڑی برہوں برات نیں

(یہ سوز واندوہ عشق کا عطیہ ہیں)

اے عشق نہیں سر رو ہے ڈکھیں سولیں دا انبوہ ہے

(یہ عشق دردوسوز کا انبار، سر پہ اٹھانے کے سوا کچھ نہیں ہے)

عشق نہیں ہے نار غضب دی تن من کیتس کولے

(یہ عشق غضب کی آگ ہے جو تن من جلا کر کوئلہ کر دیتی ہے)

عشق انوکھڑی پیڑ سوسول اندر دے نین وہاوِم نیر الڑے زخم جگر دے

(یہ عشق عجب روگ ہے، درد پنہاں کی شدت سے آنسو بہتے ہیں پھر بھی زخم ہردم تازہ رہتے ہیں)

اور اس مقام پر راہ نما حقیقت رسالت مآب ﷺ کے حضور خواجہ فریدؔ کی عرض دیکھئے:

میں بد ناں کہیں بھیم بھرم دا توں ہیں صاحب لاج شرم دا

زور فریدؔ کوں تیڈڑے دم دا لگڑی سانول توڑ نبھائیں

(مجھ گناہ گار کی حیثیت ہی کیا ہے مگر آپ ﷺ ہماری عزت و ناموس کے والی ہیں، بس آپ ﷺ ہی کا سہارا ہے،

کہ ضرور کرم فرمائیں گے)

تو کیا ہوا کہ:

کھولی عشق قلب کلید وے   تھئے گجھڑے راز پدید وے

ڈینہہ رات ساڈڑی عیدوے   تھیا بُعد سخت بعید وے

(عشق نے دل کی کلید کھولی تو سب مخفی راز عیاں ہو گئے ہجر ختم ہوا اور ہم وصل سے سرفراز ہوئے)

ہمت و حوصلہ ملا اور فریدؒ کہہ اٹھے کہ:

اوڑک عشق اندر جند ڈیسوں   نہ سمجھیں کھل ہس وے میاں جی

عشقوں مُول فریدؔ نہ پھرسوں   روز نویں ہم چس وے میاں جی

(آخر ہم عشق ہی میں جان دیں گے، یہ محض مذاق نہیں، اس سے کسی بھی حال میں منہ نہ موڑیں گے کہ اس میں روز نئی لذت ہے)

کیچ ڈوتنساں جے تئیں جیساں   جے ول ولساں کافر تھیساں

گل وچ پایم پریت مُہار

(آخر دم تک منزل کی طرف کوشاں ہوں، واپسی تو کفر ٹھہری، عشق غلامی جو قبول کر لی ہے)

ان کا عشق اسی ذات واحد کا عشق ہے:

کر توبہ اغیاروں   پٹھڑے برہوں پیغام

(غیر سے توبہ کر، یہ عشق کا پیغام ہے)

تو پھر یہ مقام میّسر آیا ہے کہ:

ہیوں عشق دے ملک دے میراساں   پوشاک ہے سوسٹھ لیراساں

ہے بستر کھتڑی نگھ وے میاں جی

(ہم حاکمِ کشور عشق ہیں جن کا لباس چیتھڑے اور بستر، کھجور کے پتوں کی پھٹی چٹائی ہے)

ہے عشق دا جلوہ ہر ہر جا   سبحان اللہ سبحان اللہ

فریدؔ کے ہاں عشق اور توحید ہم معنی ہیں جس کے حوالے، نقادوں سے نہیں بلکہ خود کلامِ فریدؔ سے ملاحظہ کیجئے۔

کس قدر واضح تعریف ہے فریدی نظریہ عشق کی! :

راہ توحیدی، عشق فریدی	اپنے آپ دا دھیان اے
بن دلبر شکل جہان آیا	ہر صورت عین عیان آیا
کتھے موسیٰ تے کتھے شیث نبی	کتھے نوح کتھے طوفان آیا
کتھے ابراہیم خلیل بنے	کتھے یوسف وچ کنعان آیا
کل شے وچ کل شے ظاہر ہے	سوہنا ظاہر عین مظاہر ہے
کتھے ریت پریت داویس کرے	کتھے عاشق تھی پردیس پھرے
خاموش فریدؔ اسرار کنوں	چپ بے ہودہ گفتار کنوں
پر غافل نہ تھی یار کنوں	ایہو لاریبی فرمان آیا
وہ وہ سوہنڑے دا ورتارا	ہر صورت وچ کرے اوتارا
ناصح، ناہی، نہ تھی مانع	عشق اساڈا دین ایمان
کنت کنزاً صاف گواہی	پہلوں حب محبوب کوں آہی
جیں سانگے تھیا جمل جہان	عشق ہے ہادی پریم نگردا
عشق ہے ہادی راہ فقردا	عشقوں حاصل ہے عرفان
کھِلی عشق قلب کلید وے	تھئے گھڑے راز پدید وے
غیروں ہے قطع برید وے	ہُٹ گُھٹ گئی تقلید وے
وہ حضرت عشق مجازی	سبھ راز رموز دی بازی
اے سلک، سلوک فریدی	ہے ریت عجب توحیدی

قسم خدا دی قسم نبی دی   عشق ہے چیز لذیذ عجیب

عشق بھلایاں کل طاعاتاں

اقبالؔ، عشق کو مادی حقائق پر روحانی حقائق کی برتری ثابت کرنے کے لیے اپناتے ہیں اور اسے زندگی قوتِ محرکہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تکوین کائنات اور ارتقائے حیات دونوں کا سرچشمہ عشق ہے:

به برگ لاله رنگ آمیزیِ عشق   به جانِ ما بلا انگیزیِ عشق
اگر این خاک دان را وا شگافی   درونش بنگری خوں ریزیِ عشق

اقبالؔ کی نظر میں عشق قوتِ عمل و جوش کا دوسرا نام ہے، اس لئے انسان کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ عشق کا سوز و گداز رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک عشق ہی شوق و آرزو کی بدولت ارتقاَ کے لیے باعثِ تقویت ہے اور جلوت و خلوت کے امتزاج سے ہی عشق کی پوری قوت و توانائی کا اظہار ممکن ہے

عشق زپا درآورد خیمہءِ شش جہات را   دست دراز می کند تا به طناب کہکشاں
عشق درخلوت کلیم اللہی ایست   چوں بجلوت مے خرامد شاہی ایست
زندگی را شرع آئین است عشق   اصل تہذیب است دیں، دین است عشق

ان کے مطابق حقیقت تک رسائی عشق ہی کی بدولت ممکن ہے عشق سے نئی آرزوئیں اور تمنائیں پیدا ہوتی ہیں۔ عشق انہیں ایک نئی حیات، نیا سوز اور حرارت بخش دیتا ہے

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں   عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
کسے کو درد پنہانے نہ دارد   تنے دارد و لے جانے نہ دارد
عشق سلطان است و برہانِ مبیں   ہر دو عالم عشق را زیرِ نگیں
سرِ عشق از عالم ِ ارحام نیست   او زِ سام و حام و روم و شام نیست
ز رسم ِ راہ شریعت نکردہ ام تحقیق   جز ایں کہ منکرِ عشق است کافر و زندیق
ہر لحظہ، نیا طور، نئی برق ِ تجلی   اللہ کرے مرحلہ ء شوق نہ ہو طے

سوز و گداز دیکھیے:

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد زِ وصل | چیست حیاتِ دوام؟ سوختن ناتمام

وادیٔ عشق دور دراز است و لے | طے شود جادہ ءصد سالہ بآہے گاہے
دیں نگردد پختہ بے آدابِ عشق | دیں بگیرد از صحبتِ اربابِ عشق
می ندانی عشق و مستی از کجاست | ایں شعاع آفتاب مصطفےٰ است

عقل و عشق

عشق در پیچاک اسباب و علل | عشق چوگاں باز میدان ِ عمل
عقل را سرمایہ از بیم و شک است | عشق عزم و یقیں لانیفک است
ہردو بمنزل رواں، ہردوامیر کارواں | عقل بہ حیلہ می بُرد عشق بُرد کشاں کشاں
علم سے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب | علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے اُم الکتاب
علم بے عشق است از طاغوتیاں | علم باعشق است از لاہوتیاں
عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے؟ | عقل کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق | عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اور بقول یوسف حسین خاں: ''زندگی کے جس چاک کو عقل نہیں سی سکتی اس کو عشق اپنی کرامات سے بے سوزن اور بغیر تارِ رفو کے سی سکتا ہے''۔[۱۳]

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل | اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل
از محبت اشتعال ِ جوہرش | ارتقائے ممکنات ِ مضمرش
فطرتِ او آتش اندوزد زعشق | عالم ازروزی بیا موزد عشق

بقول خلیفہ عبدالحکیم: ''اقبال کے ہاں خودی اور عشق کے مضامین ہم معنی ہیں''۔[۱۴]

اور حاصل کلام یہ کہ:

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات | تا زبزمِ عشق یک دانائے رازآید بروں
اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی | نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ　　　عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

مماثلت

اقبالؔ و فریدؔ کے افکار کا مرکزی نقطہ عشق ہے یہ وہ بنیادی پتھر ہے جس پر ان دانشوروں کے افکار کی عمارت قائم ہے ان کے خیال میں عشق انسان کو فکر و عمل کی حریت عطا کرتا ہے یہ ارتقائے حیات کا سب سے بڑا محرک ہے اسی سے انسانی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے عناصر کائنات کی بقا ربطِ باہم میں مضمر ہے اور یہ ربط، عشق ہی کا ہے یعنی ان کے خیال میں کائنات کے قیام کی وجہ عشق ہے

اقبالؔ کے مطابق عشق اس فطری نظام کے ارتقاً کا نام ہے جو قلبِ انسانی میں ہی نہیں بلکہ کائنات کے ہر ذرے میں موجود ہے اس عالمِ رنگ و بو کے تمام کارناموں کے پس منظر میں یہ جذبۂ عشق ہی کارفرما ہے اس لئے وہ اسے دمِ جبرئیل، دلِ مصطفےٰ، خدا کا رسول، خدا کا کلام، نورِ حیات اور نارِ حیات قرار دیتے ہیں یہی جذبہ معرکۂ کرب و بلا میں اور بدر و حنین میں لشکرِ حق کے ثبات کی وجہ بنا :

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

خواجہ فریدؔ کا نظریہ عشق وسعت و ہمہ گیری وقوتِ تسخیر کے حوالے سے اقبالؔ کے تصورِ عشق سے مماثل ہے۔ انہیں کائنات کے ہر ذرے، ہر جگہ، ہر مظہر میں یہی جذبہ جلوہ گر نظر آتا ہے جو کبھی عاشق، کبھی معشوق، کبھی بلبل، کبھی شمع و پروانہ، کبھی چاند اور چکور، کبھی میقات پر کلام الٰہی سے باریاب ہوتا ہے اور کبھی اس کا اظہار جلال و جمال کی صفاتِ ایزدی میں ہوتا ہے، انبیاء کرام کے نفوس قدسیہ میں بھی اسی جذبے کی کارفرمائی ہے۔ کسی نے جوشِ عشق میں انا الحق کہہ دیا اور کسی نے سبحانی ما اعظم شانی، عشق ایسی اعلیٰ وارفع چیز ہے جس کا اظہار سب سے پہلے خدا کی طرف سے ہوا۔ تخلیق کائنات کا جواز بھی اسی جذبے کی مرہون منت ہے:

کنت کُنزاً اصاف گواہی　　　پہلوں حب محبوب کوں آہی
جیں سانگے تھیا جُمل جہان

(کنت کنزاً کی حدیث ذاتِ احد کے عشق کی دلیل ہے۔ ذات باری نے اپنی نمود کی خواہش (محبت) میں سارا جہان پیدا فرمایا)

مظاہرِ عشق کا بیان کر کے خواجہ فریدؔ فرماتے ہیں کہ جب تک زندگی میں درد اور سوز نہ ہو جینے کا مزہ نہیں :

ہے پیت فریدؔ دی ریت عجب ہے درد تے سوز دی گیت عجب

سن سمجھو سارے اہل صفا سبحان اللہ! سبحان اللہ!

(اے اہل صفا! فریدؔ کا مشغلہ زندگی محبت، سوز اور درد ہے۔ سبحان اللہ یہ بڑی عجب نعمت ہے)

اقبالؔ بھی اسی فلسفہ کا آئینہ دار ہے:

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دم بدم

بلکہ اقبالؔ اس سے آگے بڑھ کر دین وایماں کا مدار عشق پر رکھتے ہیں:

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

خواجہ فریدؔ بھی عشق کی اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں اور اس لافانی جذبے کو فقر و درویشی کا راس المال سمجھتے ہیں:

نینہہ فریدؔ فقر دی موڑی باجھ برہوں دے کل گل کوڑی

مردیں جیندیں نیویں پوری دل نوں داغ نہ لاویں وے

(عشق ومحبت درویشی کا راس المال یا سرمایہ ہے عشق ومحبت کے بغیر دنیا کی تمام باتیں جھوٹی ہیں اس کو جیتے جی بلکہ مر کر بھی نبھانا عاشق کا فرض عین ہے اس لئے ایک دم بھی غافل ہونا، دل کو داغ لگانے کے برابر ہے)

اقبالؔ و فریدؔ جس عشق کی عظمت کے نغمے الاپتے ہیں یہ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا سفر ہے اقبالؔ تو عشق مجازی کو ہوسناکی کہہ کر حیلہ پرویزی قرار دیتے ہیں

در عشق و ہوسناکی دانی کہ تفاوت چیست ؟ آں تیشہ فرہادے ایں حیلہ پرویزی

خواجہ فریدؔ حسن ازل کا جلوہ دیکھ کر مجازی عشق ہی کو بھول جاتے ہیں کیونکہ ان کی نظر میں حقیقت ظاہر ہوگئی ہے:

وسرے رنگ مجازڑے حسن ازل دے سانگ

(حسن ازل کی خاطر عشق مجازی بھول گئے)

اور بہ بانگ دہل اعلان کرتے ہیں:

عاشق راہِ خدا ہوں غیر سے مطلب نہیں

سالکِ راہِ ہدیٰ ہوں غیر سے مطلب نہیں (دیوان اردو، ص ۷۹)

خواجہ فریدؔ کا نقطہء نظر یہ ہے کہ عشق مطلوبِ حقیقی اور ذاتِ مطلق تک پہنچنے کا بہترین ذریعہ ہے یہی وہ جذبہ ہے جو ماسوا کو فنا کر کے دل کو حقیقی توحید کا مسکن بناتا ہے اقبالؔ بھی توحید پر استقامت کو عاشقی قرار دیتے ہیں:

عاشقی ؟ توحید را بر دل زدن
دانگہ ہے خود را بہر مشکل زدن

لیکن اس حالت کے حصول کے لیے عشق کو پورے وجود میں رچانا پڑتا ہے بلکہ یوں کہیے کہ مجسم عشق بننا پڑتا ہے یہ عشق انسان کی رگ رگ میں ریشے ریشے میں سما جائے تو بات بنے بقول اقبالؔ:

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

اور فریدؔ کہتے ہیں:

دل عشق مچائی اگ سائیں
ڈکھ سوز رچیا رگ رگ سائیں

(عشق نے یہ کیسی آگ بھڑکا دی ہے کہ رگ رگ اور ریشے ریشے میں سوز و گداز رچ بس گیا ہے)

راہ عشق میں سو طرح کی مشکلات پیش آتی ہیں اور عاشق کو انہیں اُف کیے بغیر برداشت کرنا پڑتا ہے اقبالؔ و فریدؔ اس سے آگاہ ہیں بلکہ اسے سہہ رہے ہیں فریدؔ فرماتے ہیں :

گھربار ڈِسے بربار اساں
گئے وسر سبھو کم کار اساں

لاچار تے زار نزار اساں
وَہ ڈتڑی برہوں برات عجب

(گھربار ہمیں جنگل اور صحرا لگتا ہے، ہم سب کاروبار بھول گئے ناچار و زار و نزار ہو گئے۔ واہ عشق نے ہمیں یہ کیسے عجب انعام دئے ہیں)

اقبالؔ راہِ عشق کو یوں پیش کرتے ہیں:

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق
کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق

کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش
کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق

اسی لئے تو اقبالؔ جبرئیل سے کہتے ہیں کہ:

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

خواجہ فریدؔ کہتے ہیں:

مجھ سے پختہ کا فریدؔ، یاں سا بنا ہے احوال
الاماں ! عشق کے گر ہاتھ کوئی خام آوے (دیوان اردو، ص ۱۱۵)

عشق دی بات نہ سمجھن اصلوں ایہ ملوانے رُکھڑے

اقبالؔ کہتے ہیں:

نہاں اندر دو حرفے سر خار است | مقام عشق منبر نیست دار است
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام | اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

خواجہ صاحب کہتے ہیں:

تھل مارو دا پینڈا سارا تھیسم ہک بلانگھ

(کیچ تک کی مسافت تو میرے لئے بس ایک جست ہے)

اقبالؔ و فریدؔ ایسے وصال کے طالب نہیں جو عاشق کی انفرادیت گم کر دے قطرہ دریا میں جذب ہو کے اپنی ہستی کھو دے نہیں بلکہ وہ تو عاشق کی انفرادیت کے ثبات کے قائل ہیں وہ تو ایسے وصل کے قائل ہیں جو قطرے کو گہر کر دے یعنی وہ ہجر کو اہمیت دیتے ہیں کہ وصال تو ان کے نزدیک طلب کی موت ہے

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق | وصل میں مرگِ آرزو ، ہجر میں لذتِ طلب

یہ ہجر اسے اور آگے بڑھنے کی جستجو و ہمت دیتا ہے اقبالؔ کہتے ہیں:

جدائی از مقامات وصالش | وصالش از مقامات جدائی است

فریدؔ کہتے ہیں:

ہے قرب عجب ، ہے بعد عجب | ہے وصل عجب ، ہے فصل عجب

(کیفیاتِ وجدانی میں ایک عجیب قرب اور عجیب بعد ہے، وصل بھی ہے فصل بھی)

دونوں عقل پر عشق کو ترجیح دیتے ہیں کہ عقل کی رسائی محدود ہے

ہے محض مقام تحیر دا | بٹھ حیلہ درک تفکر دا
ہیں ڈونگڑے ڈینہہ دوں ہتھ نہ پا | سبحان اللہ ! سبحان اللہ !

(یہ راز مقام تحیّر ہے لہذا غور وفکر (عقل) کا حیلہ نہ کر اور اس عمیق راستے کی طرف ہاتھ نہ ڈال کیونکہ اس راہ میں تاویلات اور عقلی دلائل کے گھوڑے دوڑانا فضول ہے)

اقبالؔ کا بھی یہی عقیدہ ہے کہتے ہیں:

عقل گو آستاں سے دور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں

اور حکم دیتے ہیں کہ:

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور — چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

صرف عقل ہی نہیں علم کو بھی عشق کے مقابلے میں کم تر قرار دیتے ہیں:

بر عقل فلک پیما ترکانہ شب خون بہ — یک ذرہ ءِ درد دل از علم فلاطوں بہ

فریدؔ بھی یہی کہتے ہیں:

جو کوئی عشق مدرسے آیا — فقہ اصول دا فکر اٹھایا

بے شک عارف ہو کر پایا — رمز حقیقت پوری نوں

(جو شخص محبت کے مکتب میں آیا اس نے فقہ اور اصول کا دھندہ ترک کر دیا اور حقیقت کی رمز کو فی الواقع عارف بن کر حاصل کیا)

خواجہ فریدؔ اور اقبالؔ کے عشق کا ایک لازمی پہلو عشقِ رسول ﷺ ہے دونوں کے ہاں جذب و مستی ہے دونوں اس نام پاک ﷺ کے لیتے ہی حالتِ جذب میں ڈوب جاتے ہیں خواجہ فریدؔ کا دیوان، ملفوظات فریدؔ اور سیرت، ان کے عشق رسول ﷺ کے گواہ ہیں اسی طرح اقبالؔ کی کلیات، ملفوظات اور ملنے والے لوگ اقبالؔ کے عشق رسول ﷺ کے ناقابلِ تردید گواہ ہیں۔ عشق، اقبالؔ و فریدؔ کے نظامِ افکار کی بنیاد ہے جب انسان ''توحید عشق'' اپناتا ہے تو خواجہ فریدؔ کے مطابق اس پر انوارِ الٰہی کی بارش ہونے لگتی ہے اور اس کا دل عرشِ بریں کا مصداق بن جاتا ہے:

وَہ عشق ڈڈڑی ذات ہے — تھئی رات سب پربھات ہے

شُد فرشِ دل عرش بریں — ہذا جنون العاشقیں

(عشق نے کیا ہی پُر کیف عطیہ دیا ہے کہ تمام رات دل پر تجلیات الٰہی کا دور دورہ ہوتا رہا ہے گویا کہ یہ خاکی دل عرشِ بریں بن جاتا ہے یہ جنونِ عشق کا ایک منظر ہے)

اور بقولِ اقبال:

بیا اے عشق اے رمزِ ما　　　　بیا اے کشت اے حاصل ما
کہن گشتند ایں خاکی نہادن　　　　وگر آدم بن کن از گلِ ما

خواجہ فرید اور اقبال کے تصورِ عشق کا تقابلی جائزہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان دونوں کے نظریہ عشق میں کامل ہم آہنگی ہے ان کے نزدیک عشق، ہی کی بدولت تمام اسرار منکشف ہو سکتے ہیں۔ عشق ہی سے تسخیر کائنات ممکن ہے اس عالم ناپائدار میں عشق کو دوام حاصل ہے اس جذبہ کی قوت کو بروئے کار لا کر انسان بھی دوام حاصل کر سکتا ہے اسی سے معرفت خالق ممکن ہے یہ جذبہ درس جہد مسلسل عطا کرتا ہے یہ محض نظارہ ء جمال نہیں بلکہ ازلی وابدی صداقت کا نام ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ بحوالہ اقبال اور ڈیرہ غازی خان از ہاشم شیر خان، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۱ء

۲۔ جاوید اقبال کا مکتوب بنام ہاشم شیر خان، محررہ ۱۷ اگست ۱۹۹۹ء، مشمولہ، علامہ اقبال اور ڈیرہ غازی خاں، ص ۲۷۷،

۳۔ علامہ اقبال کا مکتوب بنام محمد صالح تونسوی مطبوعہ اقبال نامہ (حصہ دوم) از عطا اللہ، جلد ۲، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۹ء

۴۔ علامہ اقبال بحوالہ ''میرے حضور'' از سید نذیر نیازی، اقبال اکیڈمی لاہور، طبع سوم، ۲۰۰۰ء

۵۔ عبدالرشید نسیم طالوت، مقدمہ دیوانِ فرید، عزیز المطابع، بہاول پور، ۱۹۴۴ء

۶۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم وضیاء الدین برنی، شمارہ امت کا نقیب، مضمون ''باتیں اقبال کی'' اردو ڈائجسٹ، لاہور، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۱۷۳

۷۔ محولہ بالا ۴

۸۔ اقبال نامہ، جلد ۲، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۴۴۲ تا ۴۴۴

۹۔ قاضی جاوید، ''غلام فرید''، مشمولہ ''عکس فرید''، سرائیکی ادبی بورڈ ملتان ۱۹۹۹ء، ص ۱۷۹

۱۰۔ مجنوں گھور کھپوری، بحوالہ روحِ فرید از رفیق خاور جسکانی، بزم ثقافت ملتان، ۱۹۷۷ء، ص ۳۴

۱۱۔ خواجہ فرید، مقابیس المجالس مترجم واحد بخش سیال، صوفی فاؤنڈیشن لاہور، ص ۱۰۲۱

۱۲۔ قران مجید، ۳۳:۷۲

۱۳۔ روحِ اقبال، از یوسف حسین، القمر انٹر پرائزر لاہور، ۱۹۹۶ء ص ۶۱

۱۴۔ فکر اقبال، از خلیفہ عبدالحکیم، بزم اقبال، لاہور طبع ہفتم، ۱۹۹۲ء، ص ۳۴۷

نوٹ! سوائے خواجہ فرید کے اردو اشعار کے جن کا حوالہ ساتھ ہی دے دیا گیا ہے، مضمون میں شامل تمام شعر کلام

اقبال اور کلامِ فرید سے لئے گئے ہیں جو مروج و مستعمل عام و خاص ہیں ان کا مزید حوالہ نہیں دیا گیا

کتابیات

۱۔ اقبالؔ، کلیات اردو، اسد پبلی کیشنز لاہور س ن

۲۔ اقبالؔ، علامہ، کلیات اقبالؔ، (فارسی) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، طبع پنجم، ۱۹۸۵ء

۳۔ خواجہ فریدؔ، دیوان فرید مترجمہ عزیز الرحمن، عزیز المطابع، بہاول پور، ۱۹۴۴ء

۴۔ خواجہ فریدؔ، دیوان فرید اردو مرتبہ صدیق طاہر، اردو اکیڈمی بہاول پور، طبع دوم، ۱۹۹۵ء

۵۔ خواجہ فریدؔ، فوئد فریدیہ، مترجم معینی شاہ جمالی، مکتبہ معین الادب ڈیرہ غازی خاں، ۱۳۷۳ھ

۶۔ مہر عبدالحق، لغات فریدی، سرائیکی مجلس بہاول پور، ۱۹۸۴ء

R. SIR MUHAMMAD IQBAL,
M. L. C.
BARRISTER-AT-LAW.

13

جناب شمس الحسن صاحب السلام علیکم

آپ کا خط مجھے مل گیا تھا — [illegible] کے متعلق [illegible]
اس بارے میں آپ مہربانی کر کے [illegible] کہ [illegible] شدہ [illegible]
اور کہاں تک ہے [illegible] میں ایسا ہی کچھ [illegible] وقت [illegible]
صورت میں ہے [illegible] کر سکوں گا —

محمد اقبال لاہور
۲۶ اگست ۳۰

شمس الحسن کے نام خط

پیغمبرِ خودی

رضا ہمدانی مرحوم

کا

''نایاب مضمون''

کسے خبر تھی کہ سیالکوٹ کی سرزمین پر جس مولود سعید نے جنم لیا تھا۔ وہ ایک دن دنیائے علم و ادب پر چھا جائے گا۔ پنجاب کا خطہ اس پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ کہ اس نے ایک ایسا جادو نگار اور فقید المثال انسان پیدا کیا۔ جس نے ایشیاء کے نام کو بالعموم اور ہندوستان کے نام کو بالخصوص چمکایا۔

وہ ہستی جس کو موت کے پنجے نے ہم سے چھین لیا۔ اقبال تھا۔ ۲۱ اپریل کی منحوس صبح اپنے ساتھ غم و الم کے مسرت ربا بادل کی طرح ہندوستان کے افق پر چھا گئی۔ ہندوستانیوں کے ساتھ ہی ربع مسکون کے ہر گوشے میں بسنے والوں کی آنکھوں کو اشک آلود کر گئی۔ لیکن یہ اشک افشانی قیامت تک دوسرا اقبال پیدا نہیں کر سکتی۔ اس وقت ہم سے نہ صرف اقبال چلا گیا۔ بلکہ بیک وقت ہندوستان کی ایک جلیل القدر ہستی چلی گئی۔ ایک بین الاقوامی فرد کی کمی ہو گئی۔ ایک مایہ ناز مفکر چل بسا۔ ایک مسلم الثبوت سیاستدان نہ رہا۔ اسلام اور مسلمانوں کا ایک سچا بہی خواہ مر گیا۔ ایک بطل حریت سے میدانِ ملت خالی ہو گیا۔

علم و ادب کے ایوان کی شمع بجھ گئی۔ اُردو ادب کی کمر ٹوٹ گئی۔ پیغمبر خودی کو اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنے مشن کی مزید نشر و اشاعت کر سکتا۔ اس کی تعلیمات کا ایک روشن پہلو خودی تھا وہ انسان کی پستی فطرت کو علو مرتبت کے سب سے بلند زینے پر دیکھنے کا متمنی تھا، اور خودی اس کے نزدیک اس کا واحد علاج تھا۔ وہ انسان کو کسی حالت میں بھی یاس و قنوطیت کے بادلوں میں گھرا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ خصوصاً ہندوستان کی غلامانہ ذہنیت کی خودی کے ذریعہ اصلاح کرنا چاہتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ انسان کو ہر حال میں خودی کے جذبۂ عالیہ کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ چنانچہ اس غرض کے پیش نظر

مرحوم کی شاعرانہ جدت طرازی ادبی دنیا کی ایک بے مثال اور عدیم النظیر سوغات ہے۔ ماقبل شعراء کرام اور علامہ صاحب مرحوم کے دور حاضرہ کے شعراء کی جزئیات اور سرمایہ شاعری۔ بُلبل۔ طوطی قمری۔ دراج۔ سار وغیرہ ہے۔ لیکن پیغمبر خودی نے خودی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنے لئے ایک عجیب وغریب پرندے کو تجویز کرلیا، اور وہ "شاہین" ہے جو فضائے آسمانی میں دوسرے طیور کے ساتھ ہم پرواز رہتے ہوئے بھی اس فضا کا مالک ہے جو کسی دوسرے طائر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ "شاہین" سے جو جو فوائد مرحوم نے حاصل کیے۔ اور جو جو اسباق ہمیں اس سے ملتے ہیں۔ وہ یقیناً ہماری غلامی کی خاردار زنجیروں کو توڑ سکتے ہیں۔ اور ہماری ماؤف ذہنیت کی اصلاح بھی اس سے ہوسکتی ہے۔

قبائے زندگانی چاک تا کے | چہ موراں آشیاں درخاک تا کے
بہ پرواز آ وَ شاہینی بیاموز | تلاش دانہ درخاشاک تا کے

خودی اس جذبۂ عالیہ کا نام ہے جس کے پیدا کر لینے سے انسان کو سوائے ذات ماسوٰی کے کسی دوسری طاقت یا ذات سے استمداد کی ضرورت نہیں رہتی۔ گو اقبال کا نظریہ اس سے بھی بلند ہے۔ ان کے خیال میں خودی کی تکمیل اس طرح ہونی چاہیے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

وہ خودی کا سبق دے کر انسان کو قعرِ مذلت کی گہرائیوں سے نکال کر بامِ رفعت وعزت پر جلوہ گر دیکھنا چاہتا تھا۔ اور ان کی تمام تر شاعری ان مقاصد عالیہ سے لبریز نظر آتی ہے۔ غرض یہ آزاد مرد خدا انسانی آزادی کو فطرت کی قید وبند میں کسی طرح محبوس دیکھنا نہیں چاہتا۔ مرحوم کی بکثرت تصانیف اٹھاؤ اس کی اوراق گردانی کرو۔ شائد کوئی ایسا صفحہ، سطر یا شعر ہو جس میں اس معلم قوم نے سوئی ہوئی دنیا کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر نہ جگایا ہو۔ انہیں خودداری کا درس نہ دیا ہو۔ اور ان کا ہر درس نہ صرف اشعار تک محدود تھا۔ بلکہ حکیم مشرق کی ہر وقت کی گفتگو اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ اسی مقدس فریضہ کی ادئیگی میں گزرا۔ آپ خودی کے کس حد تک قائل تھے۔ اس کا ذکر آپ سالک صاحب قبلہ مدیر 'انقلاب' لاہور کی زبانی سنیئے فرماتے ہیں۔

"میں شام کے وقت حسب معمول حاضرِ خدمات تھا کہ ایک بزرگ فقیر حضرت (اقبال) کے پاس آئے۔ باتیں شروع ہوئیں۔ حضرت نے فرمایا۔ سائیں جی۔ میرے لئے دعا کیجئے۔ وہ کہنے لگے آپ کو دولت مطلوب

ہے؟ فرمانے لگے نہیں مجھے دولت کی ہوس نہیں درویش آدمی ہوں اور اللہ مجھے ضرورت کے مطابق عطا کر دیتا ہے
۔پھر فقیر نے پوچھا۔کیا دنیا میں عزت و جاہ کے طلبگار ہو؟ حضرت نے فرمایا نہیں وہ بھی اس کے فضل سے حاصل
ہے۔میں کسی اونچے رتبے کا طالب نہیں ہوں۔سائیں جی نے سوال پوچھا تو پھر کیا خدا سے ملنا چاہتے ہو؟ اس پر
حضرت کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوئی۔فرمانے لگے "خدا سے ملنا"۔سائیں جی خدا خدا کرو۔میں اس
سے کیونکر مل سکتا ہوں۔میں بندہ وہ خدا میرا اسکا واسطہ صرف بندگی کا ہے۔ملنا کیا معنی اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ خدا
مجھ سے ملنے آ رہا ہے تو میں بیس کوس بھاگ جاؤں اس لئے کہ دریا قطرے سے ملے گا تو قطرہ غائب ہو جائے
گا۔میں قطرے کی حیثیت سے قائم رہنا چاہتا ہوں۔اور اپنے آپ کو مٹانا نہیں چاہتا۔بلکہ قطرہ رہ کر اپنے آپ میں
دریا کے خواص پیدا کرنا چاہتا ہوں۔اس پر سائیں جی بے خود ہو کر جھومنے لگے۔اور کہنے لگے واہ اقبال بابا جیسے سنتے
تھے ویسا ہی پایا۔تو خود آگاہ مشرب ہے تجھے کسی فقیر کی دُعا کی کیا ضرورت ہے۔

یہ ہیں حکیم مشرق کی تعلیمات جس سے ہماری پست ذہنیتیں عالی ہو سکتی ہیں۔خودی کا موضوع بہت زیادہ
وسعت لئے ہوئے ہے۔چند اوراق اس کے متحمل نہیں ہو سکتے مرحوم کے ایک الہامی شعر پر اس کو ختم کیا جاتا ہے۔کسی
دوسری صحبت میں انشاءاللہ کچھ نہ کچھ پیش خدمت ہو گا۔

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خُدا طلب

(نغمۂ حیات پشاور جولائی ۱۹۳۸ء)

"سیرتِ اقبال" پر ایک سرسری نظر

پروفیسر طاہر فاروقی کے نام علامہ سید محمد ذوقی کا خط

(غیر مطبوعہ)

"سیرت اقبال" مؤلفہ عزیزم میاں محمد طاہر فاروقی سلمہ سرسری نظر سے گزری۔
چند خامیاں معلوم ہوئیں جو طباعت مابعد میں دور ہو جائیں تو بہتر ہو۔

"سوانح حیات" کے تحت چند ضروری واقعات جن کا سیرت سے گہرا تعلق ہے درج نہیں مثلاً اقبال کے والد کے ہاں روزانہ شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ فصوص کا درس ہوا کرتا تھا اور اقبال لڑکپن میں تبرکاً اُس میں پابندی کے ساتھ شریک کیے جاتے تھے۔ اس کا ذکر خود اقبال مرحوم نے مجھ سے کیا۔ میں اقبال سے ذاتی طور پر واقف ہوں۔ بلکہ اُن کے انگلستان جانے سے قبل جب وہ لاہور میں بھاٹی دروازہ والے مکان میں رہتے تھے چند روز تک میری ان کی یکجائی بھی رہی تھی۔ اسی بناء پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی زندگی کے بعض اہم واقعات اب تک طباعت میں نہیں آئے۔

عمر کے ابتدائی حصہ میں درسیات خصوصی میں شرکت کا اُن کی پوری زندگی پر بہت کافی اثر پڑا۔ فصوص جیسی مشکل کتاب کا کمسنی کے زمانہ میں کما حقہ سمجھ لینا تو ذرا مشکل ہے لیکن اقبال جیسے ذہین سمجھ دار اور چند فطری صلاحیتیں لیکر پیدا ہونے والے لڑکے کا اُس سے بالکل غیر متاثر رہنا ناممکن تھا۔ چنانچہ اقبال کے آخری دور تک کی شاعری پر اپنی عربیت کا اثر غالب رہا وہ اثر موافقت و ہم خیالی کے رنگ میں ہو خواہ انحراف ومخالفت کی شوخی اور بغارت کا الہڑ پن لئے ہوئے ہو۔ ان کا سارا فلسفہ اسی محور کے اردگرد گھومتا رہا اور ان کی رسی اسی کھونٹے سے بندھی رہی جسے وہ اپنے آخری لمحات تک توڑ نہ سکے۔

ان کے والد مرحوم اور ان کے استاد میر حسن مرحوم کے انتقال کی تاریخوں کا کہیں ذکر نہیں۔ خود اقبال کی بھی تاریخ وفات کا ذکر نہیں۔ بس صفحہ ۵۲ پر " صبح سوا پانچ بجے کا وقت" دیدیا گیا ہے۔ نہ دن ہے نہ تاریخ نہ ماہ نہ سال۔ البتہ قطعات تاریخ سے سن کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور صفحہ ۵۲ پر عمر بتلا دی گئی ہے بقید سال و ماہ وایّام جس سے حساب لگالیا جاسکتا ہے۔ یہ بڑی کمی ہے۔ اس کی ضرورت تھی کہ بتلایا جاتا کہ ابتدائی پرورش اور تعلیم

وتربیت کی خدمت جن کے سپرد تھی ان کا سایہ اقبال کے سر پر کب تک رہا۔ اس پر روشنی ڈالنے کی بھی سخت ضرورت تھی کہ اقبال میں جو تغیرات آگے چل کر رونما ہوئے ان کو ان دونوں عظیم الشان ہستیوں نے کسی نگاہ سے دیکھا۔ تغیرات کو پسند فرمایایا ناپسند یا کس حد تک پسند اور کسی حد تک ناپسند۔

ان کی شاعری، ان کی روش، انکی شہرت پر ان کے بعض احباب کا بالعموم اور سر عبدالقادر مرحوم کا بالخصوص کس حد تک اثر پڑا اس کا علم عوام کو بہت کم ہے۔ یہ کتاب بھی اس سے تشنہ ہے۔

ہر انسان میں چند لغزشیں بھی ہوتی ہیں۔ اقبال بھی ایک انسان تھے اور ان میں چند لغزشوں کا ہونا اُن کی انسانیت کی ایک دلیل تھی۔ لیکں اس "سیرت" میں کسی ایک لغزش کا ذکر نہیں۔ اس فرد گذاشت سے اقبال مرحوم کی ایک خوبی پر پردہ پڑ گیا۔ انکی صلاحیت، انکی قوت ارادی، انکے عزم پر بہت کافی روشنی پڑتی اگر سنجیدہ اور سمجھدار طبقہ پر یہ آشکارا کر دیا جاتا کہ مرحوم نے کس خوبی وتدریج سے اپنی کمزوریوں پر غلبہ پایا حتیٰ کہ ایک کمزوری پر قابو پانے میں انہوں نے اپنی جان تک سے دریغ نہیں کیا۔

آجکل سوانح نویسوں اور سیرت نگاروں کی ایک خاص قسم وجود میں آگئی ہے جو اپنے ہیرو کو ذات سے بے عیب بنا کر پیش کرتے ہیں اور اس بیچارہ کو فضیلت انسانی سے محروم کر دیتے ہیں۔ اس الزام سے بعض "بزرگان قوم" بھی محفوظ نہیں۔
بعض لوگوں کو اقبال کے نظریہ "خودی" سے شدید اختلاف ہے۔ افسوس ہے کہ مرحوم کے متعلق بیشتر مطبوعات میں طرفدرانہ جوش وخروش سے اس مسئلہ پر لیپا پوتی تو بہت کچھ کی گئی ہے مگر غیر جانب دارانہ اور محققانہ انداز میں گہری تنقیدی نظر بہت کم ڈالی گئی ہے۔

یہ سچ ہے کہ "خودی" میں دو پہلو ہیں۔ محمود اور مذموم۔ لیکن یہ لفظ بدنام اسقدر ہو گیا ہے کہ لوگوں کے سامنے زیادہ تر اسکا مذموم پہلو ہی منڈلاتا رہتا ہے۔ اور محمود پہلو باوجود بار بار جتلائے جانے کے کچھ بُجھا بُجھا سا رہتا ہے۔ زبان کے ذریعہ اظہار خیالات کی کوشش میں عوام کے روزمرہ کے محاورات کا خیال نہ رکھنا غلطی ہے۔ لوگوں کی عام بولی میں یہ خودی، خود بینی، خودی پروری، خود پرستی ہی تو ہے جس نے آجکل چاروں طرف ایک طوفان بے تمیزی برپا کر رکھا ہے اور دنیا کو ایک جہنم بنا دیا ہے۔ ہٹلر اور مسولینی کو ختم کر دیا اور انسانیت کی بیخ کنی کر دی۔ دیوانہ را ہوئے بس است۔ اس زمانہ کے بگڑے ہوئے مسلمانوں کو اس بدنام اصطلاح کے ذریعہ تلقین کرنا بہت خطرناک کھیل اور سرود بہ مستان یاد دہانیدن ہے۔ کتنا ہی چیخ کر کہا جائے کہ یہ "خودی" ایک اصطلاح خاص ہے جس سے اس لفظ کے محمود پہلو کی جانب اشارہ ہے مگر کون التفات کرتا

ہے التفات کر ہی کب سکتا ہے جبکہ وہ محمود پہلو اتنا ادق اور بمشکل سمجھ میں آنے والا ہو کہ دور جدید کے بزم خود "تعلیم یافتہ" لوگوں کے بھی فہم سے بالاتر ہو۔ اس محمود پہلو کا اظہار کسی دوسری اصطلاح کے ذریعہ اور دوسرے انداز میں بھی ہو سکتا تھا۔ کیا خوب ہوتا اگر اقبال اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں دور حاضر کی خصوصیات کا لحاظ کر کے ایسا انداز بیان استعمال کرتے جو خطرات مذکورہ سے محفوظ ہوتا۔ ایک بدنام لفظ کا بار بار اور بکثرت اور بسا اوقات بلاضرورت استعمال کرنا یقیناً اُدۡعُوۡ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَتہ کے خلاف ہے۔

لیکن اگر ذرا گہری نظر سے کام لیا جائے تو اس نتیجہ پر آنا پڑیگا کہ اقبال کی اس شاعری کا مقصد سبیل ربک کی جانب دعوت دینا تھا۔ یہی نہیں عُلُوّاً فی الارض کی جانب دعوت دینا تھا۔ "از کلید دین در دنیا کشاد" "خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا" ان کے ملفوظات میں جو اس کا ثبوت ہیں، اس زمانہ کے بیشتر لیڈر اور رِفارمر اس مرض میں مبتلا ہیں۔ خدا اور رسول کا نام ضرور لیتے ہیں اور اوامر و نواہی کی بھی فہرستیں دُوہراتے رہتے ہیں۔ مگر بطور ذریعہ کے نہ کہ بطور مقصد اصلی کے۔ مقصد اصلی ان کا وہی عُلُوّاً فی الارض ہوتا ہے۔ اہلِ اللہ کے نزدیک ان میں اور کفار میں مقصود کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

"خودی" کا مذموم پہلو تو وہ ہے جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے اور جسکے تباہ کن اثرات سے دنیا چیخ اُٹھی ہے۔ اسکے محمود پہلو پر بھی ذرا نظر ڈال لی جائے تو مناسب ہو کیونکہ محمود پہلو کے اعتبار سے ہی اقبال سے لغزشیں ہوئی ہیں۔

اقبال نے اپنی شاعری میں لفظ "خودی" کے معنی تعین ذات کے بتلائے ہیں اس پر سب متفق ہیں کہ ایک تعین ایک تقید ہے، تنزل ہے، اعتباری ہے، اور عارضی ہے۔ تو پھر استحکام خودی کے معنی بجز استحکام تعین، استحکام تقید، استحکام تنزل،، استحکام اعتبارات فانی کے اور کیا ہو سکتے ہیں۔ جب تک سالک تعین سے تجاوز نہ کریگا اطلاق تک کیسے پہنچے گا؟۔ جب تک ایک مسافر لاہور سے پشاور جانے کے لیے لاہور کو پس پشت نہ چھوڑیگا پشاور کیسے پہنچے گا۔؟

مَنۡ عَرَفَ نَفۡسَہٗ فَقَدۡ عَرَفَ رَبَّہٗ حدیث نبوی نہیں ہے۔ بلکہ قول مشائخ ہے لیکن یہ قول صحیح ہے۔ اسکا ماخذ ہے وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنۡسٰھُمۡ اَنۡفُسَھُمۡ (الحشر۔ع۔۳) ماخذ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ عرفان نفس موقوف ہے عرفانِ حق تعالٰی پر۔ اس صورت میں اس قول مشائخ کے صحیح معنی یہ ہونگے کہ جس نے نفس کو پہچان لیا وہ خدا کو پہلے ہی پہچان چکا۔ جیسے کوئی یہ کہے کہ جس نے ایم۔ اے پاس کرلیا وہ بی۔ اے پاس کر چکا یعنی پہلے ہی پاس کر چکا۔ یہ معنی اس قول کے ہرگز نہ ہونگے کہ عرفان حق عرفان نفس پر موقوف ہے۔ کیونکہ سالک کی رسائی جب تک اطلاق تک نہ ہوگی وہ تعین کی حقیت کو ہرگز نہ سمجھ سکے گا۔

اگر سالک کوضرورتاً عارضی طور پر اطلاق سے تعین کی جانب نزول کرنا ہوتو ایسا تنزل خواہ لاکھ بار ہی کیوں نہ ہو تنزل تو تنزل ہی ہے اور تعین تعین ہی رہیگا۔ اور بحیثیت تعین کے وہ عارضی اور فانی ہی ہوگا۔ ایک عارضی اور فانی چیز کے استحکام کی تلقین محض کوتاہ بینی ہے۔ پھر اطلاق سے تعین کی جانب نزولِ عارضی لفظی اعتبار سے خواہ تعین کی جانب واپسی کہہ دیا جائے لیکن کیفی اور کیوف سے تجاوز کر کے حقیقی اعتبار سے وہ مظہریت کی ایک شان ہوگی جو پہلی حالت سے بالکل مختلف ہوگی۔ یہ التباس اقبال کو صرف اسلیے ہوا کہ وہ تصوّف کے عملی پہلو سے نا آشنا رہے۔ انہوں نے صرف اپنے ذاتی تخیل اور اپے ذاتی فلسفہ کی مدد سے اپنی گھتیاں سلجھانے کی کوشش کی اور پھیل گئے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے انکی شاعری کے تو مزے لیے اور بے سمجھے مزے لیے یا مختلف لوگوں نے اپنے اپنے فہم کے مطابق تاویلیں کر کے مزے لیے لیکن آج تک کوئی ایک بھی شخص اُن کے مجوزہ سلوک پر عمل کر کے اُس مرتبے تک نہ پہنچ سکا کہ اس سے پوچھا جاتا کہ "بتا تیری رضا کیا ہے؟" یا کس کی نگاہ نے تقدیریں بدل دی ہوں۔ درخت تو اپنے پھل ہی سے پہچانا جاتا ہے۔

تصوّف کے عملی پہلو سے مبرا ہونے کی وجہ سے جن غلطیوں میں مبتلا ہو جانا یقینی ہے ان میں سے ایک وحدت الوجود ہی ہے۔ وحدت الوجود کوئی تخیل یا نظریہ کا فلسفہ نہیں بلکہ ایک انکشاف ہے جو ذوق عمل اور شدت ریاضت ومجاہدہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتا اور یہ اغیار کے "وحدت الوجود" سے مختلف ہے۔

اصل چیز توحید ہے۔ وحدت الوجود، وحدت الشہود، وحدت فی الکثرت، کثرت فی الوحدت، یہ سب اُسی اصلی توحید کے مختلف پہلوؤں کے متعلق انکشافات ہیں جو سالک پر حسب حیثیت، حسبِ ظرف، حسبِ استعداد، دورانِ سلوک کے مختلف اوقات میں مختلف مدارج کے ساتھ منکشف ہوتے ہیں۔ ان میں اختلاف باہمی نہیں ہوتا۔ ہر چیز اپنے موقعہ اور محل پر درست اور ٹھیک ہوتی ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مسئلہ وحدت الوجود نے لوگوں کو ذوق عمل سے محروم کر دیا۔ اس محرومی کے اسباب کچھ اور ہیں۔ ذوق عمل سے تو وہ لوگ بھی محروم ہیں جنہیں تصوف کی ہوا تک نہیں لگی اور جو حقائق و دقائق توحید کے فہم تک سے قاصر ہیں۔

"اقبال وحدت وجود سے اختلاف بھی رکھتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ

"مئے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو"

گویا انکار بھی ہے اور اقرار بھی۔ یہی اقرار وہ ابن عربیت ہے جسکا ذکر اوپر آ چکا ہے لیکن یہ اقرار بھی

" خود کوزہ و خود کوزہ گر خودِ گلِ کوزہ "

کی بلندی تک نہیں پہنچتا۔ بعض اہلِ حجاب کبھی تفنن طبع کی خاطر کبھی ازراہ تمسخر بس اتنے سے ٹکڑے کو پڑھ دیتے ہیں۔ یا تو پورا شعر انہوں نے کبھی سُنا ہی نہیں یا بیچارے اُسکی لذت سے محروم ہیں۔ پورا شعر یہ ہے

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ خود رند سُبو کش

خود برسرِ آن کوزہ خریدار برآمد بشکست و روان شد

"بشکست و روان شد" کے معمّہ کا حل کرنا ان کے بس کی چیز نہیں۔ اقبال کی شاعری نے بھی کہیں اس معمّہ کو حل نہیں کیا۔ استحکام خودی کے پرستار کے پر اس بلندی پر پرواز کی تاب نہیں لاتے اسرار خودی کے دیباچہ میں اقبال منشی امیر احمد مینائی مرحوم کا یہ شعر کہتے ہیں

دیکھ جو کچھ سامنے آجائے منہ سے کچھ نہ بول

آنکھ آئینہ کی پیدا کر دہنِ تصویر کا

اور جو چاہتے ہیں نتیجہ نکالتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض ایک شغل ہے۔ تلقین دائمی نہیں

عرض یہ کہ لوگ (اِلّا مَاشَاءَ اللہ) ہمارے مرحوم دوست کا کلام پڑھ کر شوکت الفاظ اور حسن ادا کا شکار ہو گئے اور شاعری کی بھوں بھلیّوں میں گُم ہو کر حقیقت سے دور جا پڑے۔ حق تعالیٰ رحم فرمائے۔

سید محمود ذوقی

۲۱ جمادالاولیٰ ۱۳۶۹ھ/۱۱ مارچ ۱۵۵۰ء

نوٹ:۔ مصنف کی املا میں کوئی تبدیلی روا نہیں رکھی گئی

ادارہ

گوشۂ طلبہ

اقبال

طالب علموں کے لئے

اقبال کی آفاقیت

پروفیسر شمس الدین صدیقی

خواہ کوئی اقبال کے خیالات سے اتفاق کرے یا نہ کرے لیکن اقبال کو بڑا شاعر سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ اعلیٰ شاعری کی کونسی خصوصیت ہے جو اقبال کے ہاں نہیں؟ فکر کی بلندی و پختگی، تخیل کی وسعت و گہرائی جذبات کا خلوص اور پاکیزگی۔ حسن ادا اور موسیقی۔ مگر کونسی چیز ہے جو سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ ''فکر'' اقبال کی شاعری کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ اقبال کا کلام پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں جذبات اور تخیل دونوں فکر کے تابع ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ سستی جذباتیت یا سطحیت اقبال کی شاعری میں کبھی نظر نہیں آتی اور وہی بے مہار و بے اساس تخیل و موشگافی۔ یہی پختگی و بلندی فِکر ہے جو اقبال کو دنیا کے تمام بڑے شعراء میں ممتاز کرتی ہیں اور اقبال بناتی ہے۔ بانگ درا کو اقبال کی نمائندہ تصنیف کیوں نہیں قرار دیا جاتا؟۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گو شاعر کو حیثیت سے اقبال کی عظمت بانگ درا میں بھی کئی مقامات پر ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اس میں فکر کا وہ عنصر بہت کم ہے جو اقبال کا طرہِ امتیاز ہے۔ بلاشبہ اقبال کا ممتاز ترین مجموعہ اُردو میں بال جبرئیل ہے اور فارسی میں جاوید نامہ۔

فکر کی فراوانی نے اقبال کے بارے میں یہ عام خیال پیدا کر دیا ہے کہ وہ ایک باقاعدہ فلسفی ہیں جن کا ایک مستقل نظام فلسفہ ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ ہر بڑے شاعر کی طرح اقبال کا بھی ایک تصور حیات و کائنات تھا اور چونکہ اس تصور کو اقبال نے جزئیات کی تصریح کے ساتھ پیش کیا اس لیے ان میں اصطلاحی معنوں میں فلسفی قرار دے دیا گیا۔ اس میں اقبال کی مابعد الطبعیات سے دلچسپی کو بھی دخل ہے۔ یہ دلچسپی ان کی شاعری میں بھی نہ چھپ سکی چنانچہ تصور زمان و مکان اور تصور خودی خالص مابعد الطبعی نوعیت رکھتے ہیں اور یہیں سے ہماری مشکلات شروع ہو جاتی ہیں۔ اس حیثیت سے اقبال کی آفادیت تسلیم کہ ان کا پیغام عالمگیر اور ساری انسانیت کے لئے ہے اور ان کا تصور حیات وسیع ہے، لیکن اس حقیقت کو مانے بغیر چارہ نہیں کہ فکر و علمیت کا

غلبہ اتنا زیادہ ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے بڑی کدو کاوش اور وسعت مطالعہ کی ضرورت ہے اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ۔اس لیے اقبال کے قارئین کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے۔

ویسے تو ہر شاعر اور ہر ادیب کا مطالعہ ایک خاص ذخیرہِ معلومات کا متقاضی ہوتا ہے۔مثلاً زبان اور اس کے مزاج سے واقفیت اور روایات و علامات سے آگہی بہر حال لازمی ہے۔کہ اس کے بغیر شعر و ادب سمجھ ہی میں نہیں آ سکتا۔لیکن بخلاف اور شعراء کے اقبال کے افکار و خیالات کو سمجھنے کے لیے اسکے علاوہ اور بہت کچھ جاننے کی ضرورت ہے۔جیسے فلسفہ و مابعد الطبیعات ،تاریخ و سیاسیات ،عمرانیات و معاشیات ،حدیث و علم و کلام وغیرہ اس علم کے بغیر اقبال کا مطالعہ کرنے سے افکار اقبال کا محض سرسری اندازہ ہو سکتا ہے جو غلط فہمی پر منتج ہوتا ہے۔چنانچہ اس قسم کی غلط فہمیاں اقبال کے بارے میں پائی بھی جاتی ہیں۔کہ کوئی انہیں رجعت پسند کہتا ہے۔کوئی ترقی پسند۔کوئی اشتراکی ،کوئی فسطائی۔کوئی صوفی کوئی تصوف دشمن غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

یہ اختلاف کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اقبال کے اظہار میں کوئی خامی یا الہام ہے۔نہیں ،بلکہ اس وجہ سے کہ اقبال کے خیالات و افکار ایک کل کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔اور کلی حیثیت سے مطالعہ چاہتے ہیں۔اور اس کے لیے خاص علمیت کی ضرورت ہے۔اس طرح وہی بات جو اقبال کی عظمت کی ضامن ہے یعنی بلندی و وسعتِ فکر انہیں ایک عامی کی دسترس سے دور کر دیتی ہیں۔اور اگر یہ صحیح ہے کہ آفاقی شاعری وہ ہے جس سے ہر زمانہ میں سمجھ بوجھ والا طبقہ لطف اندوز و متاثر ہو سکے تو اقبال کی شاعری میں آفاقیت کچھ ہے اور کچھ نہیں ہے۔عمومی نقطہ ءنظر سے اقبال کا درس خودی جس سے انسان کی قوتِ ارادی اور قوتِ عمل کے اور لامحدود امکانات کا تصور وابستہ ہے۔کسی قدر مبالغہ آمیز سہی لیکن ایک آفاقی چیز ہے جو ہر کسی کو اپیل کر سکتی ہے۔مگر خودی کا وہ تصور جس پر اقبال کی فکر کی تمام عمارت کھڑی ہے۔ایک پیچیدہ اور مغلق چیز ہے جو صرف ماہرین فلسفہ و مابعد الطبعیات کے پلہ پڑ سکتی ہے اوروں کے بس کی بات نہیں۔یہی بات تصور عشق پر صادق آتی ہے۔اس کا عام مفہوم تو سمجھ میں آتا ہے لیکن جب اس کے ڈانڈے برگسان کے تخلیقی ارتقاء و وجدان اور نطشے کے میلان اقتدار سے جا ملتے ہیں تو پھر ہم منہ دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔کہ یہ سب کیا ہے۔

تصور زمان تو ان سب سے زیادہ پیچیدہ چیز ہے۔اس کا ذکر ہی کیا۔اس طرح ان کے کلام میں احادیث نبوی ﷺ اسلامی فلسفہ و حکمت، متکلمین و حکما کے شہپارے صوفیا و ائمہ کے خیالات۔اہل عرفان و ارباب کشف کے مقامات و احوال کی طرف جابجا اشارے اور تبصرے اور گزشتہ ساڑھے تیرہ سو سال میں اسلام کے آغوش میں پلنے والی

مذہبی، علمی سیاسی اور ذہنی تحریکوں کی تاریخ، اقوام عالم کے قدیم و جدید ہیجانات، ملل و مذاہب جدیدہ کا ارتقاء۔ خلافت سلطنت اور ملوکیت کا عروج و زوال مغرب کے نظریے اور تصورات غرض انسانی تہذیب و تمدن کے تمام اہم پہلوؤں پر حکیمانہ تبصرے ملتے ہیں۔ جن سے واقفیت کلام اقبال کے مقصود تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔

اقبال کا نام سن کر یا ان کے شعر پڑھ کر بہت سے لوگ سر دھنتے ہیں اور واہ واہ کرتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جو فیشن اور نمائش کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اقبال کا سارا کلام پڑھ جانے کے بعد سیدھی سادی بات جو ایک عام قاری کی سمجھ میں آتی ہے۔ صرف اتنی ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو پہچانے اور ان سے کام لے خدا اور اس کے رسول ﷺ سے عشق رکھے اسلامی تعلیمات کی حرکی روح کو سمجھے اور اس پر عمل کرے تو وہ حقیقت میں خدا کا جانشین ہو جائے اور اپنی تقدیر کا آپ مالک ہو جائے۔ اسکے علاوہ اور جو کچھ ہے وہ اقبال کے خصوصی اسکالروں کے لیے ہے سب کے واسطے نہیں۔ اقبال کی آفاقیت اسی مرکزی بات کو شاعرانہ طور پر پیش کرنے میں پنہاں ہے نہ کہ فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں میں اقبال کے کلام کا وہی حصہ میرے خیال میں آفاقی ہے جو فلسفیانہ نکتہ طرازیوں سے عاری ہے۔ کیونکہ اسی کلام میں شعریت ہے۔ وہی عام فہم بھی ہے۔ اور اسی میں عالمگیر اپیل بھی ہے۔

علمیت اور فکر سے انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن کا کلام بھی بوجھل ہے۔ لیکن اقبال کو ملٹن پر اس لحاظ سے مزید فوقیت حاصل ہے کہ جہاں ملٹن کی شاعری کی بنیاد صرف تخیل پر ہے۔ وہاں اقبال کی اچھی شاعری میں سوز و خلوص نے ایک تڑپ پیدا کر دی ہے۔ واقعہ کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کی پستی اور قوم کے درد نے اُن کی فکر کو اُکسایا۔ لیکن جب فکر کو حرکت ہوگئی تو ان کے سارے ذہن پر اسی کا راج ہو گیا۔ ہر بات کو سوچنا۔ سمجھنا تولنا پرکھنا شروع ہوا اور حیات و کائنات اور اس کے مختلف مظاہر کے بارے میں خیالات معین ہونے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور اس کے مسائل تک اقبال فکر کے ذریعے سے پہنچے۔ احساس و تجربہ کے ذریعہ سے نہیں۔ مگر جن نتائج پر وہ پہنچے اُن پر انہیں اس شدت سے یقین تھا کہ یہ یقین بجائے خود احساس کا بدل بن گیا۔ اور اس یقین کی وجہ سے ان کی باتوں میں ایک وزن پیدا ہو گیا، مگر وہ اثر پیدا نہیں ہوا جو محسوس شدہ تجربہ یا تاثر کے موثر اظہار سے پیدا ہوتا ہے۔ حال اور قال میں تو فرق ہوتا ہے۔ ہاں جب کبھی اقبال آنحضرت ﷺ کا ذکر کرتے ہیں۔ یا ملت اسلامیہ کی زبوں حالی و پستی کو محسوس کر کے اس کی ترقی کی تمنا کرتے ہیں۔ تب ان کا انداز قال کا نہیں حال کا ہوتا ہے۔ اور کلام کی تاثیر کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

حال اور قال کے اس نکتہ کی وضاحت رومی اور اقبال کے تقابلی مطالعہ سے بآسانی ہو سکتی ہے۔ دونوں کا تصور

عشق بڑی حد تک یکساں ہے۔ لیکن صاف محسوس ہوتا ہے کہ رومی اپنے تجربہ و احساس کے راستے سے تصور تک پہنچے ہیں اور اقبال فکر کے راستے سے اس تصور تک پہنچے ہیں اور اقبال فکر کے راستے سے اسی لئے اقبال کے ہاں مستی و سرشاری۔ وارفتگی وسپردگی اور سیلابی کیفیت اُس درجہ کی نہیں پائی جاتی جو رومی کے ہاں ملتی ہے۔ تجربہ و تاثیر کی شاعری میں جو عالمگیریت اپیل ہوتی ہے وہ خیالات و افکار کی شاعری میں نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب اقبال۔ ''پیچ و تاب رازی'' کے زیر اثر شعر کہتے ہیں تو خشک و بے مزہ فلسفہ طرازی ہوتی ہے۔ اور جب ''سوز و ساز رومی'' کے زیر اثر تو تیغ آبدار اور یہی موخر الذکر حصہ کلام آفاقی کہلانے کا مستحق ہے۔ کیونکہ یہ پُر از تاثیر ہے۔ اور اس کی اپیل عام ہے منظوم خیالات و افکار بطور ضرب المثل اور قابلِ حوالہ نکات کے تو خوب ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا خطاب زیادہ تر پڑھنے والوں کے دماغ سے ہوتا ہے۔ نہ کہ دل سے اس بات کی وضاحت کے لیے۔ ساقی نامہ پر نظر ڈالئے۔ یہ اقبال کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ لیکن اس کا سب سے موثر حصہ کونسا ہے؟ بلا تامل کہا جا سکتا ہے۔ کہ بہاریہ یا فلسفیانہ حصول کے مقابلہ میں یہ حصہ زیادہ اثر انگیز ہے۔

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوز جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر — یہ ثابت ہے تو اس کو سیّار کر
بتا مجھکو اسرار مرگ و حیات — کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مرے دیدۂ ترکی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
اُمنگیں مری آرزوئیں مری — اُمیدیں مری جستجوئیں مری
مری فطرت آئینہ ء روزگار — غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں امیر
مرے قافلے میں لُٹا دے اسے — لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے

صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان اشعار میں اقبال کا دل بول رہا ہے۔ نہ کہ دماغ اور اسی وجہ ان میں تاثیر ہے۔ مگر ایسے پر از تاثیر اشعار اقبال کے کلام میں ہر صفحہ پر بکھرے ہوئے نہیں ملتے کہیں کہیں ملتے ہیں۔

آخر میں ایک اور بات کا ذکر ضروری ہے۔ جو اقبال کی آفاقیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اقبال کا کلام پڑھنے سے مجموعی طور پر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس جانی بوجھی دُنیا میں گوشت پوست کے بنے ہوئے آدمیوں کی معیت میں نہیں ہیں بلکہ کسی اور دُنیا میں ہیں جہاں روحیں ہیں۔ فرشتے ہیں، خدا ہے، ابلیس ہے، مشیران ابلیس ہیں، حوریں ہیں، بڑے بڑے دماغ ہیں مگر نہیں ہے تو آدمی جسکے سینے میں ڈھڑکتا ہوا دل اور رگوں میں دوڑتا ہوا خون ہو۔ جسے چھوٹی بڑی خوشیاں اور لذتیں، دکھ درد اور آلام، مسرتیں اور مصیبتیں۔ محبتیں اور نفرتیں، خواہشیں اور اُمیدیں۔ کامیابیاں اور ناکامیاں، غرض اس زندگی کے حقیقی اور واقعی مسائل درپیش ہُوں۔

اقبال کے کلام کی دُنیا میں مثالی انسان کا تصور تو ملتا ہے۔ مگر یہ ایک تجریدی تصور ہے۔ نسوانیت یا منصبِ نسواں کا تصور تو ملتا ہے۔ مگر عورت ایک حسین پیکر اور دلنواز محبوبہ کے روپ میں نہیں ملتی اور ایک خیالِ مجرد بن کر رہ جاتی ہے۔ اِب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس قسم کی شاعری جس میں حقیقت کم اور طینیت زیادہ ہو۔ آفاقی و عالمگیر اپیل کی حامل ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں اس کا جواب نفی میں ہے۔ اسی لیے مجھے اندیشہ ہے کہ اقبال کے بیشتر کلام کا حشر بھی وہی ہوگا جو ملٹن کی فردوس گم گشتہ یا فردوس باز یافتہ کا ہوا۔ یعنی اس کی عظمت کے تو اعتراف میں کسی کو تامل نہیں لیکن عام طور پر اسے پڑھتا کوئی نہیں بجز خصوصی اسکالروں کے یا طالبعلموں کے نصاب میں اس کا پڑھنا بھی شامل ہے۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان پشاور)

''افکار ہلالی'' از محمد خان میر ہلالی کا پہلا ورق جس میں مصنف نے ڈین ہوٹل پشاور میں علامہ سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

اقبال او پښتون

د افغانستان تولواک اعلحضرت نادر شاه شهید په سنه ۱۹۳۳ کښے علامه اقبال، علامه سید سلیمان ندوی او د سر سید بچي ډاکټر راس مسعود، افغانستان ته د تعلیمی نظام په لړ کښے مشوره د پاره بللی وو۔ هغوئ د پینور ډین هوټل کښے ډیره وو۔ علامه اقبال سره حاجی هلالی صاحب د پښتو متعلق کوم سوال جواب کړے وُو هغه تاثر داسے دے۔

دا سے ډین هوټل کښے او وے حضرتِ اقبال
کوم اقبال؛ هغه نحوه په اسمان کښے د کمال
کوم اقبال هغه پوهه په اسرار د حقیقت
هغه فلسفی د افلاطون نه پاک خصال
د هر قوم له په دنیا کښے خدائے ورکړے دے دوه
هر قوم دے د ذره ارمان و ستلے د جلال

اقبال کا تصور مرد مومن

توسیعی خطبہ

(جو ۱۲مارچ ۱۹۶۶ءکو پنجاب یونیورسٹی سینیٹ ہال میں پڑھا گیا)

محمد طاہر فاروقی

اسلام کا اصل الاصول توحید کا عقیدہ ہے۔ اسلامی توحید تمام مذاہب وملل قدیمہ کے وحدانیت کے تصور سے مختلف ہے۔

مجملاً یوں کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تعلیمات نے توحید کی عمارت کے دو اہم ستون قرار دیئے ہیں۔ (۱) خدائے قدوس کی حقیقی عظمت وجلال کی پہچان۔ اور (۲) کائنات میں انسان کی اصل حیثیت اور اس کے مرتبے کی تعین۔

خدائے عزوجل ''ہر قسم کے صفات عالیہ، اوصاف کمالیہ اور محامد جلیلہ سے متصف ہے۔ اسکے مانند کوئی نہیں۔ عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے۔ اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔ سب فانی ہیں اسی ایک کو بقا ہے۔ سب اس کے آگے سربسجود ہیں۔ وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے۔ وہ تشبیہ وتمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتے ناطے سے پاک ہے۔''

خدا کی ''عظمت وجلالت وکبریائی'' کے ساتھ ہی وحی محمدی ﷺ نے ''یہ نکتہ سمجھایا کہ انسان اس عالم خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے۔ اور وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے۔'' انی جاعل فی الارض خلیفة (میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں) کا منشور اس کی خلافت کا گواہ ہے۔ ولقد کرمنا بنی آدم (اور ہم نے بنی آدم کو عزت واکرام عطا کیا) سے انسان کے جلال وعظمت، اور علم آدم الاسماء کلھا (اس نے آدم کو تمام وکمال اسماء کا علم بخشا) سے اس کے علم کی وسعت اور قوت تسخیر کی شہادت بہم پہنچی ہے۔

''غرض محمد رسول اللہ ﷺ نے جس توحید کی تلقین کی وہ انہی دو اصولوں پر قائم ہے۔ ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے۔ اس لئے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہ جھکنا چاہیے۔ اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوت، ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصاف کمالیہ

صرف اسی ایک بزرگ و برتر ہستی کے لیے ہیں۔ انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اُٹھ کر صرف اسی کے آستانے پر جھکنا چاہیے''۔

اقبال نے جس مرد مومن کا تصور پیش کیا ہے وہ نائب خدا اور خلیفۃ اللہ ہے۔ وہی تخلیق کائنات کا مقصود حقیقی اور انسان کامل ہے۔ وہ ان تمام اوصاف وکمالات سے متصف ہے جو مشیت الٰہی میں اسی کے لئے امانت رکھے گئے۔ اور جنکی بدولت اسے احسن التقویم کے معزز لقب سے نوزا گیا۔ اقبال کے کلام میں مرد مومن اور اس کے صفات وکمالات کا ذکر جا بجا آیا ہے۔ لیکن ایک قطعہ میں انہوں نے مرد مسلمان کی بڑی واضح تفسیر کی ہے۔ بلکہ اس قطعے میں بھی صرف یہ ایک شعر جامع تعریف کا حق ادا کر دیتا ہے۔ فرماتے ہیں:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

بظاہر یہاں شاعرانہ بلند خیالی اور مضمون آفرینی کی ایک عمدہ مثال نظر آتی ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے محض نکتہ نوازی اور سخن سرائی کے لئے یہ اوصاف جمع نہیں کئے۔ بلکہ واقعی یہی چار عناصر ہیں جن سے مرد مومن ترکیب پاتا ہے۔

آغاز آفرینش سے وجود نے جتنے ارتقائی مدارج طے کئے، بلاشبہ ان میں انسان ارتقائی شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر اس کو خیر وشر اور پست و بلند کا وہ مجموعہ بنایا گیا ہے کہ اگر ایک طرف وہ احسن التقویم کے خطاب کا سزاوار ہے تو دوسری جانب اسفل السافلین کا رتبہ بھی اسی کی طرف منسوب ہے۔ خیر وشر اور پست و بلند کا یہ تصادم و پیکار ہی انسان کو عظمت وشرف کی راہ پر لے جاتا ہے۔ اس لئے کہ اسے وہ فطرت صالح، عقل سلیم اور قوت ممیّزہ بخشی گئی ہے۔ جو اسے غلط سے صحیح کی طرف، پست سے بلند کی جانب، اور شر سے خیر کی سمت صراط مستقیم پر گامزن کرتی ہے۔ اسی طرح خدا نے انسان کو فطری طور پر جو صلاحیت عطا کی ہے وہ اسے خیر وسلامتی کی راہ پر قائم رکھتی ہے۔

''موجودات عالم کے ذرے ذرے میں حق تعالیٰ کا ظہور ہے۔ اگر یہ ظہور نہ ہوتا تو موجودات صوری کا وجود ہی نہ ہوتا۔ لیکن حق تعالیٰ کا ان ذروں میں ظہور ہر ذرے کی استعداد کے مطابق ہے۔ ظہور اتم سوائے انسان کے اور کسی چیز میں نہیں۔'' اسی لئے ساری کائنات اس کے لئے مسخر کی گئی ہے۔ اور اسی لئے اس کو خدا نے اپنی نیابت وخلافت کے منصب ولقب سے سرفراز کیا ہے۔

حضرت آدمؑ (جو ابوالبشر یا انسانیت کے اولیں پیکر تھے) اپنے ظاہر کے لحاظ سے خلق کی صورت تھے تو اپنے باطن کے لحاظ سے حق کی صورت۔ خداوند عزوجل کا ارشاد ہے: فاذا سویته و نفخت فیه من روحی۔ یہاں تسویہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب جسم آدم میں ہر قسم کی صلاحیت پیدا ہوگئی تب اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونکی۔ روح پھونکنے کے معنی صرف یہی نہیں کہ جسدِ آدم میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ بلکہ یہ بھی کہ حق تعالیٰ نے ''اپنی ذات اور صفات کا پرتو آدم پر ڈالا۔ چونکہ آدم کا تسویہ پورا ہو چکا تھا انہوں نے اس پرتو کو قبول کیا اور امانت الٰہی کے متحمل ہو گئے۔''

اسی لئے انسان میں جملہ صفات الٰہی کا پرتو پایا جاتا ہے۔ وجوب ذاتی اور صفات تنزیہی کے ماسوا کہ وہ اسی پاک اور برتر ذات کے لیے مخصوص ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انسان ان صفات کے لئے اللہ کا محتاج ہے۔ اور اللہ کسی بات میں کسی کا محتاج نہیں۔ انسان ظلی، عکسی اور اضافی طور پر صفات الٰہی کا حامل بنا تبھی تو اس کو مسجود ملائک کا اہم اور مقتدر رتبہ حاصل ہوا۔ مسجود ملائک ہونا گویا اعلامیہ تھا کہ وجود کے ارتقاء نے مکمل ترین شکل اختیار کر لی۔

تمہید لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن ابھی اسماء و صفات خداوندی پر بھی ایک نظر ڈالنی ہے۔ اسماء و صفات الٰہی کی عام تقسیم صفات سے ماورا ہے، اسی طرح اسکے صفات کا اندازہ کرنا بھی ممکن نہیں۔ لیکن جن صفات کا کم و بیش ادراک ممکن ہے یا جن کا انسان کی عملی زندگی سے ذرا بہت تعلق سمجھا گیا، ان کو ننانوے اسمائے الٰہی کہ کر ننانوے کے عدد میں جمع کر دیا گیا ہے۔ ورنہ تجسس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف وہ اسماء و صفات جن کا ذکر قرآن پاک میں اور حدیث شریف میں آیا ہے وہ بھی ننانوے سے بہت زیادہ ہیں۔

صفات جلالی اور صفات جمالی کی تقسیم بھی ہماری سوجھ بوجھ کے مطابق اور اعتباری قسم کی ہے۔ ورنہ ہر اسم جلالی بھی ہے اور جمالی بھی۔ یعنی ایک لحاظ سے جلالی ہے تو دوسرے اعتبار سے جمالی۔ ہر جلال کے لئے جمال اور ہر جمال کے لیے جلال لازم ہے۔ مثلاً سورج کی روشنی میں نسبتاً جلال ہے۔ لیکن جب سورج دور ہو جائے اور یہی روشنی زیادہ فاصلے سے گزر کر چاند کی روشنی بن جائے تو اس میں ایک جمال پیدا ہو جاتا ہے۔ انگارہ دور سے خوشنما نظر آتا ہے اور اس کی جمالی شان بڑی بھلی لگتی ہے۔ لیکن یہی انگا[illegible]یب ہو اور اسے ہاتھ لگایا جائے تو اس میں جلالی شان بھڑک اٹھتی ہے اور ہم تلملا جاتے ہیں۔

خدا کے اسماء و صفات کا عقیدہ اسلام میں صرف نظری چیز نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی اعتقاد میں اس کو علمی حیثیت بھی حاصل ہے۔

یعنی خدا کی یہ صفات اخلاق انسانی کا معیار ہیں۔انسان کے حصول شرف و عظمت کی کسوٹی یہی صفات و اسماء ہیں۔انسان کی علمی زندگی انہی صفات خداوندی کے عکس اور پرتو کے مطابق ڈھلنی چاہیے۔اگر انسان خدا سے نسبت پیدا کرے۔اور ان کو انتہائی معیار جان کر انکی نقل اور پیروی کی کوشش کرے۔تاکہ نیابت خداوندی کے منصب جلیلہ تک اس کو رسائی میسر آ سکے۔

حدیث شریف میں آیا ہے ان اللہ خلق آدم علی صورتہ (خدا نے آدم کو اپنی صورت میں پیدا کیا)۔ذات باری ہر قسم کی تجسیم و تشبیہ سے پاک ہے۔اس لئے ظاہر ہے کہ یہاں صورت سے مراد جسمانی شکل نہیں ہو سکتی۔بلکہ معنوی شکل و صورت مقصود ہے۔یعنی خدا کی صفات کاملہ کا عکس موجودات میں سب سے زیادہ انسان میں جلوہ گر ہوتا ہے۔اسی لئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ حسن خلق اللہ الاعظم (حسن اخلاق خدائے تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔) ارباب معرفت نے اسی لئے یہ تعلیم دی ہے کہ تخلقوا باخلاق اللہ (خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو)۔جو کوئی جس درجہ تک اخلاق خداوندی سے نسبت کاملہ پیدا کرے گا، وہ اسی قدر شرف انسانیت سے آراستہ ہو جائے گا۔

وہ انسان جو صفات الٰہیہ اور اخلاق خداوندی سے بدرجہ کامل آراستہ ہو، اقبال کی اصطلاح میں مرد مومن کہلاتا ہے۔اور یہی مرد مومن اقبال کے تصور کے مطابق انسان کامل ہوتا ہے۔''وجود کے تمام مراتب میں (جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا) انسان اکمل ہے۔اور جملہ افراد انسانی میں محمد رسول اللہ ﷺ سب سے اکمل اور ارفع ہیں۔اور مظہر اتم ہیں حق تعالیٰ کے۔بس آپ ہی انسان کامل ہیں۔دوسروں کو یہ مرتبہ آپ ہی کی برکت اور آپ ہی کی پیروی و متابعت اور آپ ہی کی محبت سے ظلی طور پر حاصل ہوتا ہے۔''

اس تفصیل کے بعد اقبال کے شعر پر غور کیجئے۔اور دیکھئے کہ انہوں نے مرد مومن کے لئے جو چار عناصر قرار دیئے ہیں، ان کے ذریعے اسی حقیقت کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔مکرر شعر پڑھنے کے لئے عذر خواہ ہوں:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت   یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

یہاں ایک جملہ معترضہ اور شامل کر لیجئے۔وہ یہ کہ اقبال کی اصطلاح کے مطابق مرد مومن، مرد مسلمان، مرد فقیر، مرد قلندر، مرد حق، مرد آزاد سب اسی مومن کے مختلف نام ہیں۔حسب ضرورت اقبال نے یہ مختلف الفاظ استعمال کئے ہیں مفہوم کے لحاظ سے یہ سب ایک ہی ہیں۔

بعض علماء نے اسماء و صفات الٰہی تین اقسام میں درج کیا ہے۔یعنی صفات جلالی، صفات جمالی اور صفات کمالی۔

یعنی ان اسماء وصفات سے اگر خدا کی رحیمی اور کریمی ظاہر ہوتی ہے تو وہ صفات جمالی ہیں۔ اگر ان سے خدا کے جاہ وجلال کا اظہار ہوتا ہے تو وہ صفات جلالی ہیں۔ اور اگر ان سے اس کی بلندی، تنزیہ اور کمالات کی جامعیت ثابت ہوتی ہے تو وہ صفات کمالی کہلاتی ہیں۔

علامہ اقبال نے مردمومن کے لئے جو چار عناصر تجویز کئے ہیں وہ ان تینوں صفات الہیٰ کے حامل ہونے کے ساتھ حقیقت محمدی کے بھی جامع ہیں۔ قہاری صفت جلالی ہے۔ غفاری صفت جمالی۔ قدوسی صفت کمالی۔ اور جبروت اصطلاح تصوف میں ''حقیقت محمدی ﷺ'' کو کہتے ہیں۔

میری ناقص رائے میں اقبال نے ان چار الفاظ کی یہ ترتیب محض اتفاقیہ اور صرف مصرع موزوں کرنے کے لئے قائم نہیں کی ہے۔ بلکہ ان الفاظ کا انتخاب اور ان کی یہ ترتیب بے شمار حقائق کی عقدہ کشا اور مفسر ہے۔ انسان کی عظمت و قوت، اس کی محبت شرافت، اس کی برتری و پاکیزگی، اور اس کے باطنی وروحانی ارتقائے اعلیٰ کی طرف بھی اس ترتیب میں بڑی بلاغت کے ساتھ اشارہ مطلوب ومقصود ہے۔

اقبال نے ان چار عناصر میں پہلا عنصر قہاری کو قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ابھی کہہ چکا ہوں قہاری صفات جلالی میں سے ہے۔ صفات جلالی کی یہ تعریف ہے کہ یہ وہ صفات ''جن سے اس کی شاہنشاہی، جلال وعظمت اور حکومت واستیلا کا اظہار ہوتا ہے۔'' اور خدائے تعالیٰ کے اسماء جلالی قاھر اور قھار کے مختصر معنی یہ ہیں کہ ''جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا۔ سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا''۔ یہ تشریح مختصر ہے لیکن اس سے بھی صفت قہاری کی جو بنیادی حیثیت ہے وہ بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید میں واضح طور پر انسان کو تسخیر کائنات کا حکم دیا گیا ہے۔ جا بجا ارشاد ہے کہ یہ ساری کائنات، ہوا پانی، زمین، آسمان اور ان میں جو کچھ ہے ہم نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پھر انسان کا فریضہ بن جاتا ہے کہ وہ سب کچھ تسخیر کرے۔ جب تک نوامیس فطرت اور مظاہر قدرت کی کامل تسخیر اور ان پر تصرف حاصل نہ ہو اسے مردمومن کے لقب سے سرفراز نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث　　　مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

جہاں تمام ہے میراث مردمومن کی　　　مرے کلام پہ حجت ہے نکتہ لولاک

فقر مومن چیست ؟ تسخیر جہات — بندہ از تاثیر او مولا صفات

خدا کی صفت قہاری کا عکس مردِ مومن میں جلوہ نما ہوتا ہے تو اسے تسخیر جہات اور غلبہ کائنات میسر ہو جاتا ہے۔ اس کی قوت و سطوت اور اس کے شوکت و جلال کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے۔ وہ آسمان و زمین کو تہہ و بالا کر سکتا ہے۔ کوئی چیز اور کوئی عمل اس کے تصرف اور اختیار سے باہر نہیں ہوتا۔ بقول اقبال:

ولایت، بادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری — یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتہ ایماں کی تفسیریں

یہاں ایک جملہ معترضہ کے لیے پھر عذر خواہ ہوں۔ اقبالیات پر گفتگو کرتے وقت ان کی اصطلاح خودی سے گریز ممکن نہیں۔ تسخیر کائنات، عرفان نفس اور معرفت الٰہی سب کچھ تصور خودی میں شامل ہے۔ اسی لئے فرماتے ہیں:

پیکر ہستی ز آثار خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی — خودی کی خلوتوں میں کبریائی

زمین و آسمان و کرسی و عرش — خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

اگر خواہی خدا را فاش بینی — خودی را فاش تر دیدن بیاموز

جب انسان کو معرفتِ خودی حاصل ہو جاتی ہے تو وہ انفس و آفاق کو مسخر کر لیتا ہے۔ ضمیر کائنات کے اسرار و رموز اس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ آسمان و زمین سب اس کے اشاروں پر رقص کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ ابن الوقت نہیں رہتا۔ بلکہ ابوالوقت اور ابوالحال کے بلند مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:

آں مسلمانے کہ بیند خویش را — از جہانے بر گزیند خویش را

از ضمیر کائنات آگاہ اوست — تیغ لا موجود الا اللہ اوست

در مکان و لامکان غوغائے او — نہ سپہر آوارہ در پہنائے او

خودی شیر مولا، جہاں اس کا صید — زمیں اس کی صید، آسماں اس کا صید

خودی صیاد و نخچیرش مہ و مہر — اسیر بند تدبیرش مہ و مہر

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے　　　مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

خودی کا استحکام عشق سے ہوتا ہے۔ عشق نام ہے اس قوت کا جو مقاصد آفرین ہے۔ جو ہمہ وقت تلاش، جستجو، پیش قدمی، آرزو، سوز و ساز سے ہمکنار رکھتی ہے۔ عشق تکمیل ذات کے لئے تسخیری عمل پر مستعد رہتا ہے اور اسی لئے تمام فطری اور عمرانی رکاوٹوں پر غالب آتا ہے۔ فرماتے ہیں:

نقطہ نورے کہ نام او خودی است　　　زیر خاک ما شرار زندگی است

از محبت می شود پائندہ تر　　　زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

از محبت چوں خودی محکم شود　　　قوتش فرماں دہ عالم شود

عشق کے مضراب سے نغمہ تار حیات　　　عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفیٰ　　　عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

از نگاہ عشق خارا شق شود　　　عشق حق آخر سراپا حق شود

عشق کہ یہ جذبہ مرد مومن کو حب خدا اور حب رسول ﷺ سے میسر ہوتا ہے۔ فرمان خدا ہے:

و الذین آمنوا شد حبا للّٰہ (جو مومن ہیں وہ خدا کی ذات سے زیادہ سے زیادہ عشق رکھتے ہیں۔)

محبت خدا عشق رسول ﷺ کے بغیر میسر نہیں ہوتی۔ قرآن شریف میں واضح طور پر فرمایا ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (اس آیت کی تفسیر یوں کی گئی ہے کہ فرما دیجئے کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو اول میرا اتباع کرو۔ اس طرح تم کو میری محبت حاصل ہوگی۔ اور محبت رسول ﷺ سے تم حب الٰہی تک پہنچو گے۔ جس کے صلے میں تم کو یہ انعام نصیب ہوگا کہ خود خدا تم سے محبت فرمائے گا۔) علامہ فرماتے ہیں:

ہر کہ عشق مصطفیٰ ﷺ ساماں اوست　　　بحر و بر در گوشہ داماں اوست

سوز صدیقؓ و علیؓ از حق طلب　　　ذرہ عشق نبی ﷺ از حق طلب

زانکہ ملت را حیات از عشق اوست　　　برگ و ساز کائنات از عشق اوست

اور عشق کی یہ قوت ہی مرد مومن کو قہاری کی صفت بخشتی ہے۔ بقول اقبال:

طبع مسلم از محبت قاھر است　　　　مسلم ار عاشق نباشد کافر است

مرد مومن کے عناصر اربعہ میں سے دوسرا عنصر ہے غفاری۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں غفاری صفات جمالی میں سے ہے۔ صفات جمالی وہ ہیں ''جن سے خدا کے رحم و کرم، عفو و درگزر اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔'' غفور اور غفار کے معنی ہیں ''معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگزر کرنے والا''۔

مرد مومن باوجود غلبہ وسلطانی، قوت و شوکت اور جاہ و جلال کے معمولات زندگی ادا کرنے اور یگانہ و بیگانہ سے معاملہ کرنے میں سراپا رحمت و شفقت ہوتا ہے قرآن پاک میں مومنین کی صفات یوں بیان کی گئی ہے۔ اشداء علی الکفار رحماء بینھم (وہ کفار کے حق میں بہت سخت لیکن آپس کے تعلقات میں بیحد رحمدل اور شفیق ہیں)۔ مومن کو یہ صفت اتباع رسول ﷺ کے صدقے میں اور خدا کی صفت غفاری کے پرتو سے میسر آتی ہے۔ دراصل مومن کے سامنے ایک ہی مثالی پیکر کردار اور اسوۂ حسنہ مکارم اخلاق کا واحد نمونہ ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ۔ فرمان الہیٰ ہے (تمہارے لئے رسول پاک ﷺ کی سیرت میں بہترین نمونہ موجود ہے)۔

مرد مومن صفات قہاری و غفاری کا جامع ہوتا ہے۔ عملی دنیا میں دونو ـ صفات یکساں مفید اور ضروری ہیں۔ اس میں شدت اور نرمی دودنوں پائی جاتی ہیں۔ بقول سعدیؒ:

''درشتی و نرمی بہم در بہ است''

لیکن دونوں کا مصرف و محل جداگانہ ہوتا ہے۔ دراصل تو خدمت خلق اس کا وظیفہ و معمول ہوتا ہے اس لئے کہ

خدمت از رسم و رہ پیغمبری است

اسکی نفرت بھی عمیق اسکی محبت بھی عمیق　　　　قہر بھی اسکا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق

اس کی محبت اور کدورت سب خدا کے لئے ہوتی ہے۔ اس کا ہر اقدام دوسروں کے مفاد، رفاہ عام اور خدمت خلق کے لئے ہوتا ہے۔ اس کا ہر عمل بے غرض، بے لوث، پاک اور نفسانیت سے خالی ہوتا ہے۔ اسی لئے ابنائے زمانہ کے حق میں اس کا وجود خدا کی رحمت ثابت ہوتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل　　　　اس کی ادا دلفریب اسکی نگہ دلنواز

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو　　　　رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

پرسوز و نظر باز و نکوبین و کم آزار　　　آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

وہ رزم گاہ حیات میں شمشیر بے نیام ہوتا ہے تو شبستان محبت میں کوئی دوسرا اس سے زیادہ نرم نہیں ہوسکتا۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم　　　رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم　　　دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اسلام بنیادی طور پر محبت اور سلامتی کا پیام دیتا ہے۔ بقول اقبال:

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی　　　اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

لیکن کارزار زندگی میں محبت و اخوت کے ساتھ قوت و شدت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے حضرت علامہ رزم گاہ حیات میں کامیاب ہونے کے لئے قہاری و غفاری کے اوصاف کو حسب ضرورت کام میں لانے کا پیام دیتے ہیں:

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر　　　شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے　　　گلستان راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

مرد مومن کے لئے تیسرا عنصر قدوسی ہے۔ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قدوس اسماء کمالی میں سے ہے۔ یعنی وہ اسماء و صفات جو خدا کی یکتائی، بے مثالی، خوبی، بڑائی، قدرت، کبریائی اور نیکی وغیرہ کو ظاہر کرتی ہیں۔ قدوس کے معنی ہیں پاک مقدس۔ مرد مومن خدا پر ایمان لاتا ہے تو اس کے جملہ احکام کے سامنے سرخم کر دیتا ہے۔ وہ عشق رسول ﷺ میں سرشار ہو کر اسوہ نبوی ﷺ کے اتباع کی بدولت مکارم اخلاق سے آراستہ ہو جاتا ہے۔ غیر اللہ کی نفی اس کو پاکی باطن اور صفائے قلب عطا کرتی ہے۔ اس کے اعمال و اقوال احکام الہیٰ کے نور سے منور ہوتے ہیں۔ اور اس کا قلب بیدار مہبط تجلیات الہیٰ بن جاتا ہے۔

دل بیدار فاروقیؓ، دل بیدار کراریؓ　　　مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

مومن کا دل ہوا و ہوس، آلودگی و نفسانیت سے پاک ہوتا ہے۔ عشق حقیقی کی بدولت اسے دل زندہ اور قلب سلیم حاصل ہو جاتا ہے جو معرفت الہیٰ کے نور سے روشن ہوتا ہے۔ اس کی پاکی باطن، صفات قلب اور تنویر روحانی اس کو وہ ملکوتی اور لاہوتی آن عطا کرتی ہے۔ جسکا اندازہ کرنا بھی ممکن نہیں۔ علامہ فرماتے ہیں:

خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات　　　ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے — وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روح قرآنی

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی — یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی

یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار — اسی مقام سے آدم ہے ظل سبحانی

مرد مومن اتباع ﷺ اور عشق رسول ﷺ کی بدولت وہ پاکی و پاکیزگی حاصل کرتا ہے جو کمال انسانیت کے لئے لازم ہے۔ جس کے صدقے میں اس کو بے اندازہ قدرت وقوت میسر آتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

می ندانی عشق و مستی از کجاست — ایں شعاع آفتاب مصطفی ﷺ است

زندہ تا سوز او در جان تست — ایں نگہ دارندہ ایمان تست

با خبر شو از رموز آب و گل — پس بزن بر آب و گل اکسیر دل

دل ز دیں سر چشمہ ہر قوت است — ویں ہمہ از معجزات صحبت است

اس گفتگو سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ صفات قہاری وغفاری وقدوسی میں رنگ کر مرد مومن میں ان صفات الہی کا انعکاس ہوتا ہے۔ اور وہ ان اوصاف وکمالات سے آراستہ ہو جاتا ہے جو اس کی ظاہری و باطنی زندگی کو اسوۂ حسنہ پر ڈھالتی ہیں۔ انسان کو اخلاق وصفات میں ملاء اعلیٰ سے تشبیہ اور ہم شکلی کا جوہر عطا کیا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کو سوز و گداز اور شوق و آرزو کا جذبہ عطا ہوا ہے۔ بقول اقبال:

مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں — انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

انہی اوصاف وکمالات کا مجموعہ ہونے کے باعث مرد مومن نیابت خداوندی کا صحیح استحقاق رکھتا ہے۔ ”خلافت الہیٰ اور نیابت خداوندی کا تقاضا یہ ہے کہ خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف وکمالات کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا اتنا ہی وہ اپنے اندر اس منصب خلافت و نیابت کا استحقاق زیادہ ثابت کرے گا۔ اور اسی وقت وہ نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کر سکے گا۔“ اصل کے اوصاف وکمالات کا یہ عکس کسی فرد میں اس کی اپنی صلاحیت اور پاکیزگی کے لحاظ سے کم وبیش پایا جائے گا۔ مدارج روحانی اور کمالات باطنی میں اس درجہ ترقی ممکن ہے کہ پھر بندہ مومن سرتاپا خدائی رنگ میں رنگ جائے۔ جیسا کہ فرمان الہیٰ ہے صبغة الله و من احسن من الله صبغة (اللہ کا رنگ!! اور اس کے رنگ سے زیادہ اچھا اور چوکھا اور کونسا رنگ ہو سکتا ہے!!!) حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

آدم اصطرلاب اوصاف علوست — وصف آدم مظہر آیات اوست

ہر چہ در روے می نماید عکس اوست | ہم چو عکس ماہ اندر آبجوست

خلق راچوں آب داں صاف وزلال | وندرو تابان صفات ذوالجلال

جب مردمومن اپنی پاکی باطنی، روشن ضمیری، تنویر روحانی اور صفات ستودہ کی بدولت صفات خداوندی کا مظہر بن جاتا ہے۔ تو اسے وہ کمال ارتقاء انسانیت حاصل ہوتا ہے جو اسے مقام محمدی ﷺ تک پہنچاتا ہے۔ حقیقت محمدیہ ﷺ کو الفاظ میں بیان کرنا بیحد دشوار ہے۔ یوں سمجھئے کہ ''حقیقت انسانی کی اصل حقیقت محمدی ﷺ ہے۔ حق تعالیٰ نے سب سے پہلا تنزل حقیقت محمدی ﷺ میں فرمایا۔ رسول ﷺ نے فرمایا کہ اول ماخلق اللہ نوری یعنی پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی وہ میرا نور ہے۔ نیز فرمایا کہ کنت نبیا وآدم بین الماء والطین یعنی میں نبی تھا جب کہ آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھے۔ آپ کل موجودات سے اسبق اور کل مخلوقات سے اکمل ہیں۔ آپ اصل ہیں جملہ کائنات کی۔ (حدیث قدسی ہے لولاک لما خلقت الافلاک یعنی اگر آپ کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں کائنات ہی پیدا نہ کرتا)۔ آپ خلاصۃ الموجودات ہیں۔ جس طرح آدم پر تخلیق کائنات ختم ہوئی آپ ﷺ پر تکمیل انسانیت ختم ہوئی۔ دراصل وہ قطب جس پر احکام عالم کا دارومدار ہے، اور جو ازل سے ابد تک دائرہ وجود کا مرکز ہے حقیقتاً ایک ہی ہے، اور وہ ہے حقیقت محمدیہ ﷺ''۔

مردمومن کے وجود کا چوتھا عنصر جبروت ہے۔ اور جبروت کے معنی اصطلاح صوفیہ کے مطابق حقیقت محمدی ﷺ کے ہیں۔ اسی لئے اقبال کہتے ہیں:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ آپ ﷺ کی ذات والا صفات تک رسائی عشق کی بدولت نصیب ہوتی ہے۔ عشق کی تکمیل بغیر اسوۂ طیبہ کے کامل اتباع کے ممکن نہیں۔ جس نے آپ کے اسوہ حسنہ کا مکمل اتباع کیا اسے آپ کی محبت حاصل ہوئی، اور جسے یہ سعادت نصیب ہوگئی اسے سب کچھ مل گیا۔ بقول علامہ:

در دل مسلم مقام مصطفیٰ ست | آبروے ما ز نام مصطفیٰ ست

ہر کہ از سر نبی ﷺ گیرد نصیب | ہم بہ جبریل امیں گردد قریب

مردمومن کے لئے واحد مثالی پیکر ذات رسول ﷺ ہے۔ جب اسے آپ تک رسائی ہوجاتی ہے تو وہ اس مقام

بلند پر پہنچ جاتا ہے جس کی تفسیر علامہ اقبال نے اپنے خط میں یوں کی ہے:

''مسلم وہ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے۔ یہ ایک قوت نورانیہ ہے جو جامع ہے جواہر موسویتؑ اور ابراہیمیتؑ کی۔ آگ اسے چھو جائے تو بردوسلام بن جائے، پانی اس کی ہیبت سے خشک ہو جائے۔ آسمان و زمین میں یہ سما نہیں سکتی کہ یہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہیں۔ پانی آگ جذب کر لیتا ہے۔ عدم بود کو کھا جاتا ہے۔ پستی بلندی میں سما جاتی ہے۔ مگر جو قوت جامع اضداد ہو، اور محلل تمام تناقضات کی ہو، اسے کون جذب کرے، مسلم کو موت نہیں چھو سکتی۔ کہ اس کی قوت حیات و موت کو اپنے اندر جذب کر کے حیات و موت کا تناقض مٹا چکی ہے۔۔۔۔۔۔۔ مسلم حنیف جذبات متناقض یعنی قہر و محبت اپنے قلب کی گرمی سے تحلیل کرتا ہے۔ اور اس کا دائرہ اثر اخلاقی تناقضات تک ہی محدود نہیں، بلکہ تمام طبعی تناقضات پر بھی حاوی ہے۔ پھر مسلم جو حامل ہے محدثیت کا اور وارث ہے موسویتؑ اور ابراہیمیت کا، کیوں کر کسی شے میں جذب ہو سکتا ہے، البتہ اس زمان و مکان کی مقید دنیا کے مرکز میں ایک ریگستان ہے جو مسلم کو جذب کر سکتا ہے۔ اور اس کی قوت جاذبہ ذوقی اور فطری نہیں۔ بلکہ مستعار ہے ایک کف پا سے۔ جس نے اس ریگستان کے چمکتے ذروں کو کبھی پامال کیا تھا''۔ اسی لئے علامہ اقبال فرماتے ہیں:

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است	اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است
طینت پاک مسلمان گوہر است	آب و تابش از یم پیغمبر است

مرد مومن یا انسان کامل کا جو تصور اقبال نے پیش کیا ہے، اس کا مختصر خاکہ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ''انسان کامل کی پیدائش سے قبل انسانیت کے لئے جسمانی اور روحانی حیثیتوں سے مدارج ارتقا کا طے کرنا شرط ہے۔ وہ ابھی ہمارے لئے نصب العین ہے۔ اس زمانے میں خارج میں اس کا کہیں وجود نہیں''۔

اقبال کی اصطلاح کے مطابق خودی کی کامل صورت یہی مرد مومن یا انسان کامل ہے۔ یہی شرف انسانیت کی معراج کمال ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ اس میں ''زندگی کے متضاد قوتیں ہم آہنگ ہو جائیں گی۔ اور اس میں قوت اور علم اپنے انتہائی مدارج کے ساتھ موجود ہوگا،،۔ یہی وہ مقام ہے جسے علامہ نے اپنے اس قطعے میں یوں بیان کیا ہے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان	گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے	دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

اسی مرتبہ پر مرد مومن کی تفسیر یوں بھی فرمائی ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

یہی بات مولانائے روم اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

آدمی چوں نور گیرد از خدا

ہست مسجود ملائک زا اجتبا

اور اسی مقام پر رضائے بندہ اور مرضی مولا میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ بقول مولانائے روم:

گفتہ او گفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

علامہ اقبال بھی یہی کہتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

در رضایش مرضی حق گم شود

ایں سخن کے باور مردم شود

یہ لطیف نکتہ انسان اس لئے نہیں باور کر پاتا کہ اس کا ادراک حجابات کے پردوں میں ڈھکا رہتا ہے۔ ورنہ خود خدا نے قرآن شریف میں رسول مقبول ﷺ کے عمل کو اپنی جانب منسوب کیا ہے۔ فرمایا ہے۔:

و ما رمیت اذ رمیت و لکن اللہ رمی (جب تم نے مٹھی میں بھر کر پھینکا تو وہ تم نے نہیں پھینکا تھا وہ تو اللہ نے پھینکا تھا۔) بقول اقبال:

عزم او خلاق تقدیر حق است

روز ہیجا تیر او تیر حق است

الغرض بندہ مومن جو توحید کا رازدار اور متاع مصطفوی ﷺ کا امین ہوتا ہے۔ جو احکام الٰہی اور فرامین مصطفوی ﷺ کے اتباع کی بدولت جذبہ عشق کا حامل بنتا ہے۔ عشق رسول ﷺ جس کا زادراہ اور قرآن عظیم جسکا ساز و برگ ہوتا ہے، اسے وہ شوکت وسطوت نصیب ہوتی ہے، جو اسے ساری کائنات پر تصرف اور غلبہ بخشتی ہے۔ اور وہ بطن گیتی

اور سینہ افلاک کو چیر کران کے اسرار سر بستہ کو حل کرتا اور سلطان موجودات بن جاتا ہے۔

خودی ہے زندہ تو سلطان جملہ موجودات

وہ قوت عشق کی بدولت انسانیت کے شرف کامل تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اب اس کا ایک قدم زمین پر ہوتا ہے تو دوسرا ماورائے افلاک۔ تدبیر و تقدیر اس کے اشاروں پر عمل کرتی ہیں۔ وہ عبدیت کے درجہ کمال پر فائز ہو کر بیک وقت نیابت خداوندی اور صفات ملکوتی حاصل کر لیتا ہے۔ اسی کی شان میں علامہ یوں بھی کہتے ہیں:

مرد حق از کس نگیرد رنگ و بو | مرد حق از حق پذیرد رنگ و بو
ہر زماں اندر تنش جانے دگر | ہر زماں او را چو حق شانے دگر

نیز فرماتے ہیں:

ہم چناں از خاک خیزد جان پاک | سوئے بے سوئی گریزد جان پاک
در رہ او مرگ و حشر و حشر و مرگ | جز تب و تابے ندارد ساز و برگ
در فضائے صد سپہر نیلگوں | غوطہ پیہم خوردہ باز آید بروں
می کند پرواز در پہنائے نور | مجلسش گیرندہ جبریل و حور
تا ز مازاغ البصر گیرد نصیب | بر مقام عبدہ گردد رقیب

مرید بے حاجتے گفت
کہ یزداں را ز حال ما خبر نیست
بما نزدیک تر از شہ رگ ماست
ولیکن از شکم نزدیک تر نیست

اگر خاک تو از جاں محرمے نیست
ز غم آباد ... شاخ تو ہم از نیساں نمے بست
[illegible]
[illegible]

403

زبور عجم (فارسی) کے مسودے کا ایک ورق، علامہ کی محنت کا ایک ثبوت

اقبال کا فن

ڈاکٹر نورالحسن نقوی

اقبال اس ادب کے قائل تھے جو زندگی کو سنوارنے میں انسان کا مددگار ہو۔ وہ نہ فلسفی ہونے کے دعویدار تھے اور نہ شاعر بلکہ خود کو ایک پیغامبر اور ایک مخصوص نظامِ فکر کا شارح و مفسر کہتے تھے۔ انھوں نے بار بار کہا کہ میں کہاں اور شعر و نغمہ کہاں، میں تو راہ گم کردہ راہی کو اس کی منزل کا پتا دینا چاہتا ہوں اور اس کے لئے میں نے شعر کو وسیلہ بنایا ہے۔ گویا اقبال خیال کو زیادہ اہم سمجھتے تھے اور آرٹ کو محض حصول مسرت کا ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کو بہتر بنانے کا وسیلہ قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک انسانی جدوجہد کا منتہائے مقصد زندگی ہے۔ ایک کامیاب، طاقت ور، بامعنی زندگی اور علم وفن اس کے خانہ زاد ہیں۔ اقبال سے بہت پہلے سرسید نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ شاعری سے قوم کو بیدار کرنے کا کام لیا جانا چاہیے۔ انھوں نے اپنی نثر سے سوتوں کو جھنجھوڑنے کا کام لیا لیکن شعر سے ان کی طبیعت کو مناسبت نہ تھی، حالی نے مدوجزر اسلام کو محدود پیمانے پر اس کام کو انجام دیا لیکن اقبال کی ساری شاعری گویا اسی آرزو کی تکمیل ہے۔

افلاطون شاعروں کو اپنی مثالی ریاست سے شہر بدر کرنے پر اس لئے مصر تھا کہ وہ ان کی شاعری کو مخرب اخلاق سمجھتا تھا۔ ارسطو نے شاعری کو محض نقالی کے بجائے تخلیقی عمل قرار دیا اور ادب کی مقصدیت پر زور دیا لیکن انیسویں صدی میں مقصدیت کے خلاف آواز بلند ہوئی اور فن برائے فن کا نظریہ عام ہوا۔ فرانس میں اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی جس کی قیادت فلابیر، بودلیر اور گائیتر کر رہے تھے۔ روس میں پشکن اور انگلستان میں والٹر پیٹر اور آسکر وائلڈ اس کے علمبردار تھے۔ امریکہ میں ایڈگر ایلن پو نے اس نظریے کو فروغ دیا۔ اس تحریک کے حامی ادب کو اخلاق اور فلسفے کی بندشوں سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ وہ فن کے لیے حسن کو ہی ضروری سمجھتے تھے۔ خیر اور صداقت ان کے خیال میں ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان میں سے بعض تو اتنے انتہا پسند تھے کہ ان کے نزدیک کسی شے کا مفید ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ حسن سے عاری ہے۔

وکٹر کوزین کا کہنا تھا کہ آرٹ نہ مذہب و اخلاق کی خدمت کے لیے ہے اور نہ اس کا مقصد افادہ ہے۔ مذہب مذہب کی خاطر ہونا چاہیے، اخلاق اخلاق کی خاطر اور آرٹ آرٹ کی خاطر، نیکی اور پاکبازی کے راستے سے رسائی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح جمال کا مقصد افادہ نیکی یا پاکبازی نہیں ہے جمال کا راستہ جمال ہی کی منزل کی طرف رہنمائی کرسکتا ہے۔ اقبال اس نظریے کو رد کرتے ہیں۔ وہ صرف اس آرٹ کو وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو ''انسان کی سوئی ہوئی قوت عمل کو بیدار کرے اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا حوصلہ عطا کرے۔'' حسن آفرینی ان کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اصل چیز افادیت ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حسن حسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں خواہ مضر تو خواجہ حافظ دنیا کے بہترین شعراء میں سے ہیں''

کلام اقبال کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ حافظ کی شاعری کو اقبال اس لیے ناپسند کرتے ہیں کہ وہ زندگی کو بے حقیقت بتاتی ہے اور انسان کو جینے کا حوصلہ نہیں دیتی۔

عربی نقاد بھی حسن آفرینی کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ابن رشیق نے اسلوب کو موضوع سے زیادہ اہم بتایا۔ قدامہ ابن جعفر نے الفاظ اور طرز ادا ہی کو شعر ٹھہرایا۔ لفظ و معنی کے رشتے کو گلاس اور پانی کے تعلق سے واضح کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ پانی تو درحقیقت ایک ہی ہے البتہ مٹی شیشے اور سونے کے برتن سے اس کی حیثیت میں فرق پڑ جاتا ہے۔ لیکن حالی نے اس دلیل کو یہ کہہ کر رد کیا ہے کہ اگر پانی گدلا یا کھارا ہو تو سونے کا گلاس بھی اس کی قدر و قیمت میں اضافہ نہیں کرسکتا۔ اس طرح حالی موضوع کی اہمیت کو واضح کرنا چاہتے ہیں لیکن حالی کے افکار کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مقصدیت اور افادیت پر زور دینے والے حالی کہیں بھی فنی تقاضوں کو نظر انداز کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ دراصل اعلیٰ درجے کا ادب اسی وقت وجود میں آتا ہے جب کہی جانے والی بات معنی خیز ہو اور کہنے کا انداز دل نشین۔ خیال اس وقت تک شعر میں نہیں ڈھلتا جب تک وہ موزوں پیرائیہ بیان تلاش نہ کرے۔ فلابیر کا کہنا ہے کہ ''ہر خیال کو ادا کرنے کے لیے کچھ الفاظ مخصوص ہیں اور ان کی ترتیب بھی مقرر ہے۔ جب تک ان الفاظ اور اس ترتیب تک رسائی نہیں ہو جاتی خیال ادا نہیں ہو سکتا۔'' کارلائل کی رائے میں اسلوب فن کار کا لباس نہیں جلد ہے۔ اقبال لفظ و معنی کے رشتے کو روح و جسم کے تعلق سے ظاہر کرتے ہیں:

ارتباطِ حرف و معنی اختلاطِ جان و تن

اس ادبی بصیرت کے باوجود اقبال جگہ جگہ ادب کی مقصدیت اور افادیت پر زور دیتے ہیں، کہیں یہ بھی کہہ گزرتے ہیں کہ فن کی باریکیوں سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ان کے زمانے کے ادیب وشاعر جو ابھی تک پرانی لکیر کو پیٹے جاتے تھے، موقع بے موقع اساتذہ کے کلام سے سند مانگتے تھے۔ اقبال ایک وسیع المطالعہ شخص تھے۔ انھوں نے معترضین کے جواب میں نامور شاعروں کے کلام سے سندیں بھی پیش کیں لیکن جب ذرا ذرا سی لغزش پر گرفت کی گئی تو وہ جھنجھلا گئے اور جس طرح غالب کہہ اٹھے تھے کہ ''گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی'' اسی طرح اقبال نے بھی کہہ دیا کہ شاعری سے میرا کیا واسطہ اس کا دوسرا سبب یہ تھا کہ ان کے زمانے تک اردو شاعری میں موضوع کی اہمیت کا احساس پیدا نہ ہوا تھا۔ اقبال نے اس کا ازالہ موضوع کی اہمیت پر ضرورت سے زیادہ زور دے کر کرنا چاہا۔

اقبال کا نظریہ شعر: ان کی اس تحریر سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔

''شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمع نظر نہیں رہا ہے کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ اس واسطے کہ آرٹ غایت درجے کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات میرے حالات میں میرے لیے ممکن نہیں۔''

• دو خطوط کے اقتباسات اور ملاحظہ ہوں:

''فن شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کرلیا ہے۔ ورنہ

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست
کہ برمن تہمت شعر وسخن بست''

''حقیقت میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی نسبت دنیائے شاعری سے کچھ بھی نہیں ہے اور نہ کبھی میں نے سنجیدگی سے اس کی طرف توجہ کی ہے۔''

مندرجہ بالا اقتباسات کے علاوہ بھی ان کی تحریروں میں متعدد جگہ اس حقیقت کا اعتراف مل جاتا ہے کہ فن بہت توجہ اور محنت کا تقاضا کرتا ہے۔ ایک خط میں مثنوی اسرار خودی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اگر مجھے فرصت ہوتی تو غالباً موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔ اس کا دوسرا حصہ بھی ہوگا جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔ مجھے یقین ہے

کہ وہ حصہ اس حصے سے زیادہ لطیف ہوگا کم از کم مطالب کے اعتبار سے گو زبان و تخیل کے اعتبار سے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہوگا۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے جو اپنے اختیار کی بات نہیں۔'' ایک شاعر کے کلام کی اس لیے تعریف کرتے ہیں کہ اس کی ''تازہ نظموں میں شعریت سے زیادہ معنویت'' نظر آتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار جابجا شعروں میں بھی ہوا ہے مثلاً:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

او حدیثِ دلبری خواہد زمن — رنگ و بوے شاعری خواہد زمن
کم نظر بیتابیء جانم نہ دید — آشکارم دید و پنہا نم دید

لیکن ان بیانات سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ اقبال شعر کے فنی تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ اپنے پیغام کو زیادہ نمایاں کرنا چاہتے ہیں ورنہ ان کا کلام شاہد ہے کہ ''شعر کہہ دینے کے بعد وہ اس کی طرف سے غافل نہ ہوتے تھے بلکہ اسے بہتر سے بہتر بنانیکی کوشش جاری رکھتے تھے'' قطع و برید اور حک و اصلاح کا سلسلہ چلتا رہتا تھا اور آخر کار بعض شعروں کی شکل بالکل بدل جاتی تھی۔ اقبال شعر گوئی کی صلاحیت کو خداداد مانتے ہیں لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ محنت اور کوشش کے بغیر اعلیٰ درجے کی شاعری وجود میں نہیں آتی:

ہرچند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد — کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا — روشن شررِ تیشہ سے ہے خانہ ء فرہاد

بظاہر ان دونوں بیانات میں تضاد نظر آتا ہے یعنی ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ شاعری کے فنی تقاضوں کی طرف توجہ کروں۔ دوسری طرف وہ شعوری کوشش اور اکتساب ہنر کو ضروری قرار دیتے ہیں اور عملاً اپنے شعروں کی نوک پلک سنوارتے نظر آتے ہیں لیکن بات دراصل یہ ہے کہ ان کی رائے میں شاعری کا فن جانکاہی کا تقاضا کرتا ہے اور وہ حتی المقدور محنت کرنے کے باوجود اسے ناکافی سمجھتے ہیں اور اس سے مطمئن نہیں ہوتے۔ معجزۂ فن کے وجود

میں آنے کے لئے جس عرق ریزی کی ضرورت ہے اسے وہ جگر کاوی کا نام دیتے ہیں۔ گویا معمولی محنت سے شاعری کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ کہتے ہیں۔

رنگ ہو یا خشت وسنگ، چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

غرض بات یہ ہے کہ اقبال جس نے فنی تکمیل کے آرزومند ہیں ان کے خیال میں فرصت نہ ہونے کے باعث اس تک ان کی رسائی نہیں ہو پاتی لیکن اصلیت یہ ہے ان کے کلام کا بیشتر حصہ فن کا معجزہ ہے۔ بلاشبہ ان کا کچھ کلام ایسا بھی ہے جو شاعری کم اور خطابت زیادہ ہے اور شاید یہ صرف اس لیے زندہ رہے گا کہ اس کے خالق اقبال ہیں۔ ابتدا میں اقبال اپنے کلام کی تراش خراش جس جگر سوزی کے ساتھ کرتے تھے وہ آگے چل کر کم ہوگئی لیکن اس وقت تک مشق ومہارت سے فن پر ان کی گرفت مضبوط ہوچکی تھی اور شعر کہنے کی خداداد صلاحیت تو ان میں پہلے سے موجود تھی۔ ہربرٹ ریڈ نے شاعری کو ایک الہامی کیفیت کہا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ اقبال الہامی شاعر تھے۔

فن برائے فن اور فن برائے زندگی کی اصطلاحیں آج فرسودہ ہوچکی ہیں صرف وہ شاعری زندہ رہتی ہے جس میں فکر فن بن جاتی ہے اور فن فکر۔ سچے شاعر کی پہچان یہ کہ اس کے ہاتھوں میں لفظ اور خیال دونوں موم ہوکر شعر کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ بڑے فن کار کو خام مواد اور وسیلہ اظہار دونوں پر یکساں حاکمانہ قدرت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ فن کار ہمیشہ فن کی بلندیوں پر ہی رہے۔ کبھی فکر پوری کامیابی کے ساتھ فن میں ڈھل جاتی ہے، کبھی خامی رہ جاتی ہے اور کبھی فن کار یکسر ناکام ہوجاتا ہے۔ اقبال کا بھی یہی معاملہ ہے۔ جہاں ان کی فکر جذبے میں تحلیل ہوگئی وہاں اعلیٰ درجے کی شاعری وجود میں آئی ہے، جہاں ایسا نہ ہوسکا وہاں وہ شاعری ملتی ہے جو صرف ان کے پیغام کے لیے یاد رکھی جائے گی اور بحیثیت شاعری کے اس کی عمر کم ہوگی۔ اقبال شعر کے فنی تقاضوں کی طرف اپنی کم التفاتی کا کتنا ذکر کیوں نہ کریں اصلیت یہ ہے کہ وہ ہر جگہ اپنی بات کو زیادہ سے زیادہ پراثر بنانے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ حسب ضرورت وہ مختلف فنی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ کبھی یونانی حکما کی طرح استفسار سے کام لیتے ہیں، کبھی تمثیل کا سہارا لیتے ہیں تو کبھی ڈرامائی عناصر سے تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح فن کار کا وہ عمل شروع ہوجاتا ہے جسے صناعی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لب ولہجہ اقبال کی شاعری میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کوئی بات دھیمے لہجے میں کہی جائے تو زیادہ پراثر ہوتی ہے۔ کوئی بات اونچی آواز سے ادا ہو تو دل میں گھر کرتی ہے۔ کہیں شاعر کو سرگوشی اور خود کلامی کا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے تو کہیں راست تخاطب بھی تاثیر میں اضافہ کرتا ہے۔ کبھی بات کو زیادہ دلنشیں اور اثر انگیز بنانے کے لیے اپنی بات کسی اور کی زبان سے کہلانی ہوتی ہے۔ ایلیٹ نے ان تینوں صورتوں کو شاعری کی تین آوازوں کا نام دیا ہے۔ اس زاویے سے اردو شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ میر پہلی آواز کے شاعر ہیں، غالب دوسری آواز کے اور اقبال کے کلام میں دوسری اور تیسری آواز سنائی دیتی ہیں۔

میر کی شاعری کا بڑا حصہ خود کلامی پر مشتمل ہے۔ باپ اور منہ بولے چچا کے مرجانے کے بعد انھیں کوئی ہمدرد میسر نہ آیا۔ کوئی ایسا نہ تھا جسے وہ اپنا دکھ درد سنا سکیں۔ چنانچہ ہوش سنبھالا اور شعر کہنا شروع کیا تو خود کو ہی اپنا مخاطب بنایا۔ جب شاعری کا شہرہ دور دور تک پہنچا اور بڑے بڑوں نے ان سے ہمکلامی کو فخر جانا تب تک بچپن میں پڑی نفسیاتی گرہ ان کے یہاں بے دماغی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اب بھلا وہ کس کو منہ لگانے والے تھے۔ ان کے کلام کا مطالعہ کیجیے تو وہ اپنے آپ سے ہی باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بہت کیا تو بے جان چیزوں سے باتیں کرلیں۔ کہیں یہ بھی شبہ ہوتا ہے کہ روئے سخن محبوب کی طرف ہے مگر لہجے کا دھیما پن صاف بتاتا ہے کہ اسے کچھ سنانا مقصود نہیں صرف دل کا غبار نکال لینا چاہتے ہیں۔ جب کہتے ہیں۔

رات محفل میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

تو غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔ جو شخص رات پہروں دیوار سے لگا تصویر کی صورت چپ کھڑا رہا۔ دن نکلتے نکلتے وہ بھلا ایسا جرات مند کیوں کر ہو گیا کہ اپنے محبوب سے ہم کلام ہو جائے۔ یہ بات کہنے کو کہہ بھی دی مگر اس طرح کہ وہ سن نہ لے، سمجھ نہ جائے۔ غالب کا معاملہ ان کے برعکس ہے، جن شعروں میں وہ خود سے مخاطب نظر آتے ہیں وہاں بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات اپنے ہی کو کیا سارے جہان کو سنا دینا چاہتے ہیں جیسے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

اقبال پیامی شاعر تھے اور عوام وخواص سب ان کے مخاطب، چنانچہ وہ جو کچھ کہتے ہیں بہ آواز بلند کہتے ہیں۔ ان

کی ساری شاعری دوسری اور تیسری آواز کی شاعری ہے۔ تیسری آواز کا مطلب یہ ہے کہ شاعر تاریخ یا روایت سے کردار مستعار لیتا ہے یا خود کردار تخلیق کرتا ہے اور پھر اپنی بات ان کی زبان سے کہلواتا ہے۔ یہ ایک ڈرامائی عمل ہے جس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ پہلا مرحلہ کرداروں کا انتخاب ہے۔ شاعر جو بات کہنا چاہتا ہے اس میں زور اور اثر پیدا کرنے کے لیے وہ اپنی آواز کو کافی نہیں سمجھتا۔ چنانچہ اسے ایسے کردار کی تلاش ہوتی ہے جس کے ہونٹوں سے نکل کر اس کی بات زیادہ دلنشیں اور زیادہ پر اثر ہو جائے۔ تاریخ کے صفحات سے مدد نہ ملے تو وہ خود کردار وضع کر لیتا ہے لیکن دونوں صورتوں میں اس کا کام بڑا مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ اگر کردار اور اس کی زبان سے ادا ہونے والی بات میں ذرا سی خامی رہ جائے تو ساری محنت رائیگاں جاتی ہے۔ اس سے پہلے کہ کردار زبان کھولے شاعر کو پوری فضا تیار کرنی پڑتی ہے۔ قطعہ بند اشعار سے قطع نظر غزل میں یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غزل کے مخصوص رمزیہ انداز کے سبب بہت سے شعر مل جائیں گے جن میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور شاعری کی تیسری آواز سنائی دینے لگی ہے مگر بات گل و بلبل کی تمثیل سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ مثلاً۔۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کو ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

چلے بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلہ نو بہار ٹھہرے گا

اقبال نے البتہ غزل میں بھی شاعری کی تیسری آواز سے کامیابی کے ساتھ پیغام بری کا کام لیا ہے۔

جو موجِ دریا لگی یہ کہنے، سفر سے قائم ہے شان میری
گہر یہ بولا، صدف نشینی ہے مجھ کو سامان آبرو کا

یہ موج پریشاں خاطر کو پیغام لب، ساحل نے دیا
ہے دور وصال بحر ابھی، تو دریا میں گھبرا بھی گئی

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر
شمع بولی، گریہ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

دم طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایت سوز میں نہ مری حدیثِ گداز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

شاعری کی تیسری آواز کا استعمال اقبال نے اپنی نظموں میں بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ کرداروں کے انتخاب میں انھوں نے موقع محل کا بہت لحاظ رکھا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کردار کی زبان سے اپنا پیغام ادا کریں پورا ماحول تیار کر دیتے ہیں۔ مثلاً خدا سے یہ دعا کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اونچے حوصلے عطا فرما۔ اس دعا کے لیے وہ طارق کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ مجاہد اپنی مختصر سی فوج کے ساتھ سمندر پار کر کے اسپین کے ساحل پر جا پہنچا ہے۔ سفینہ نذر آتش کیا جا چکا ہے۔ بے سروسامانی کا عالم ہے۔ سامنے دشوار گذار پہاڑیاں ہیں اور ان کے پیچھے دشمن کی تازہ دم، مسلح، کثیر افواج۔ ایسے عالم میں اس کی نظر خدا ہی کی طرف اٹھتی ہے۔ پہلے وہ اپنے مجاہدوں کی بہادری کا بڑے پر جوش انداز میں بیان کرتا ہے۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

یہ گویا رجز ہے۔ پھر دعا کرتا ہے۔۔

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے — وہ بجلی کی تھی نعرہ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے — نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

اللہ تعالیٰ سے یہ گلہ کرنا مقصود ہے کہ دنیا میں بندہ مزدور کی حالت بہت خستہ ہے۔ تو کیسا معبود ہے کہ قادر و عادل ہونے کے باوجود ان کی خستہ حالی کا مداوا نہیں کرتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تو ان بدحال انسانوں کا پروردگار ہی نہ ہو۔ یہ گستاخانہ کلمات ادا کرنے کے لیے مزدوروں کے رہنما اور منکرِ خدا لینن سے زیادہ مناسب اور کون ہوسکتا ہے۔ لینن جب خدا کے حضور میں حاضر ہے تو اس کے وجود سے انکار کیسے کرے۔ اب تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

آج آنکھ سے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

چنانچہ پاسِ ادب بھی ہے اور اس بات کی ندامت بھی کہ عقل کے پھیر میں پڑ کے وجودِ خداوندی کا انکار کرتا رہا۔ اب ادب واحترام کا یہ عالم ہے کہ کہتا ہے۔

حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات — اے نفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے — ہر دم متغیّر تھے خرد کے نظریات

اس سے پہلے کہ حرفِ مدعا زبان پر لائے لینن طرح طرح سے معذرت کرتا ہے۔ کہتا ہے میں جب تک دنیا میں رہا۔ ایک سوال مجھے پریشان کرتا رہا۔ آج مجھے وہ سوال کرنے کا موقع ملا ہے۔ میرے ذہن میں خیالات نے طوفان بپا کر رکھا ہے۔ اس لیے میں زبان کھولنے پر مجبور ہوں۔ پھر وہ سوال اس کی زبان پر آتا ہے جسے دریافت کرنے کے لیے شاید اس سے زیادہ مناسب کوئی شخصیت نہیں ہو سکتی ذرا یہ تو بتا تو آخر ہے کس انسان کا معبود؟ اس بدحال فلک زدہ انسان کا جو تیرے آسمان کے نیچے مصیبت کی زندگی گزار رہا ہے! اگر ایسا ہے تو سن تیرے قادر و عادل ہونے کے باوجود اس بیچارے کی زندگی بڑی تلخ ہے۔

جب تک میں جیا خیمہ افلاک کے نیچے — کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا — جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ — وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات!
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

پھر یہ سوال کر کے خاموش ہو جاتا ہے ع کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟

اس پر فرشتے بھی متاثر ہو کر کہہ اٹھتے ہیں ع نقش گرِ ازل! ترا نقش ہے ناتمام ابھی

آخر خدائے تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس کی دنیا کے غریبوں کو نیند سے بیدار کیا جائے اور ان کے خون میں ایسی حرارت پیدا کر دی جائے کہ وہ ظالموں سے سرگرم ستیز ہو سکیں۔ گراں خواب غریب کو ربانی آواز ہی بیدار کر سکتی ہے۔ چنانچہ احکام خدا ہی کی طرف سے جاری ہوتے ہیں اور وہ بھی فرشتوں کے نام۔

سخت کوشی کی نصیحت کے لیے وہ عقاب سال خوردہ کا انتخاب کرتے ہیں جو بچہ شاہین کو یہ بتاتا ہے کہ۔۔

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

گدائی کی مذمت کے لیے ایک مردِ زیرک وضع کر لیتے ہیں جس کے تجربات کا نچوڑ یہ ہے کہ۔

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج

کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

ستارے جن کی دلبری سے حسنِ ازل جھلکتا ہے انسان کو یہ سبق دیتے ہیں کہ سارے نظام جذب باہمی سے قائم ہیں۔ اس نصیحت کے لیے ستاروں کو یوں منتخب کیا ہے کہ یہ گردوں نشین قوم بھولے بھٹکے قافلوں کی رہبری کرتی ہے۔ انسان انھیں اپنی قسمت کا آئینہ سمجھتا ہے۔ اس لیے شاعر کا خیال ہے کہ شاید ان کی صلاح انسان کے لیے زیادہ کارگر ہو۔

قوم کے لیے سرسید کے دل میں بھی ایسی ہی تڑپ تھی جیسی اقبال کے دل میں۔ وہ ساری زندگی سوتوں کو جھنجھوڑتے رہے یہاں تک کہ مسلمانوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو گئے۔ ان کی روح اس شہر کو جو اجڑ گیا تھا آباد اور اپنی محنتوں کے چمن کو لہلہاتے دیکھ کر مسرور و مطمئن ہوتی ہے اور اہل قوم کو اپنے سنگ تربت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ جس پر معلم، مدبر اور شاعر کے لیے نصیحتیں درج ہیں کہ اپنی قوم کو ترک دنیا کا سبق نہ سکھلانا، فرقہ بندی کی تعلیم نہ دینا، سیاست میں دلیری اور بیباکی سے کام لینا کہ بندہ مومن کے دل میں مکر اور خوف کے لیے جگہ نہیں۔ شاعر تلمیذ رحمٰن ہے۔ اس کی شاعری کا مقصد سوتوں کو جگانا ہونا چاہیے۔ سرسید مرتے دم تک انہی باتوں پر زور دیتے رہے۔ لہذا ان نصیحتوں کے لیے سرسید کی لوح تربت ہی سب سے زیادہ موزوں ہو سکتا تھا۔

اقبال نے جن کرداروں کا اپنے پیام کا وسیلہ بنایا ہے ان میں غالباً سب سے اہم کردار ابلیس کا ہے۔ ابلیس حرکت کا سرچشمہ ہے اور خودسر و بیباک ہے۔ وہ خدائے قدوس کے حضور بھی لاف زنی سے باز نہیں آتا۔ جبریل پر چوٹیں کرتا ہے، آدم کو اپنے زور بیان سے فریب دیتا ہے۔ خدا سے ہم کلام ہوتا ہے تو اپنی برتری کے لیے طرح طرح کی دلیلیں دیتا ہے، اپنے اوصاف گنواتا ہے: زندگی کے ہنگامے میرے دم سے ہیں، کائنات کی رگوں میں دوڑنے والا خون مجھ سے حرارت حاصل کرتا ہے۔ اے خدا: ستارے بنائے تو نے ہیں مگر ان کی گردش میرے رہین منت ہے۔ انسانی بدن میں جان تو نے ڈالی مگر اسے زندگی کی ہماہمی سے آشنا میں نے کیا۔ وہاں سے نکل کر وہ آدم کے پاس پہنچا ہے اور اسے ورغلاتا ہے کہ جنت کی زندگی بے کیف ہے۔ یہاں کبھی نہ ختم ہونے والا سکون ہے۔ نہ یہاں نشاطِ کار، نہ عمل کا ذوق اور نہ مقصد کوشی۔ یہاں سوائے اس کے کیا ہے کہ کوثر و تسنیم سے تو اپنی پیاس بجھاتا رہے اور خدا کے آگے سربسجود رہے۔ آمیں تجھے ایک نئی دنیا کی سیر کراؤں۔ ابلیس کو اس پر فخر ہے کہ وہ دل یزداں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا ہے اور سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو کے جہاں میں سرگرم عمل ہے۔ پھر وہ خدا سے درخواست کرتا ہے کہ مجھے اس صید زبوں یعنی انسان کی صیادی

سے رہائی عطا کر۔ یہ کم بخت خودی ناشناس ہے اور بے تامل میری فرمانبرداری کرتا ہے۔

اے خداوندِ صواب و ناصواب   من شدم از صحبتِ آدم خراب

ہیچ گہ از حکم من سر برنہ تافت   چشم از خود بست و خود را در نیافت

اور

صید خود صیاد را گوید: بگیر

الاماں از بندۂ فرماں پذیر

وہ اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ کہاں میں مردِ پیر اور کہاں یہ انسان مٹی کا کھلونا۔ یہ خس اور میں آگ۔ مجھے کسی مد مقابل سے روشناس کر۔ کوئی ایسا جواں مرد بھیج جو میری گردن مروڑ دے۔ جسے دیکھ کر مجھ پر رعشہ طاری ہو جائے۔ اس سے مقابلے میں لطف تو آئے گا خواہ میں شکست ہی کیوں نہ کھا جاؤں:

اے خدا ایک زندہ مردِ حق پرست

لذتے شاید کہ یابم در شکست

اقبال نے ابلیس کی زبان سے جو پیغام ادا کرایا ہے وہ حرکت و عمل اور سخت کوشی کا پیغام ہے۔ چنانچہ اس کے لیے ابلیس کا انتخاب اس لیے مناسب ہے کہ روز ازل سے وہ سرگرم عمل ہے۔ ایسا مصروف کہ کبھی جمعے کی چھٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔

آنچناں برکارہا پیچیدہ ام

فرصت آدینہ راکم دیدہ ام

ابلیس کی دوسری خصوصیت استقامت ہے ان گنت پیغمبروں کو دیکھ چکا مگر جو راستہ اختیار کر چکا ہے اسے ترک کرنے پر آمادہ نہیں۔ تیسری صفت یہ کہ جدائی میں تڑپنے والوں کا سردار ہے۔ وہ وصل کا نہیں ہجر کا طالب ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وصل عشق کی موت ہے۔ اقبال بھی عشق خداوندی میں مسلک ہجر کے قائل ہیں۔ انسان اپنے عشق میں کتنی ہی شدت پیدا کر لے وہ بندۂ مولا صفات تو بن سکتا ہے مگر بندگی سے نکل کر خدا نہیں بن سکتا یعنی انسانی وجود ذاتِ باری تعالیٰ میں ضم نہیں ہو سکتا۔

خضر بھی ایک اہم کردار ہے جس سے اس تکنیک کے تحت اقبال نے کام لیا ہے۔ منظر دریا کا کنارہ ہے۔ رات کے سناٹے میں شاعر اپنے دل میں اضطراب کی ایک دنیا چھپائے دریا کے پرسکون پانی کو دیکھ رہا ہے۔ اس کے ذہن میں

کتنے ہی سوال ہیں جن کا جواب جاننے کے لیے وہ بے چین ہے۔ آخر دھیمی دھیمی چاندنی کی طلسماتی فضا میں اسے حضرت خضر کا ہیولا نظر آتا ہے۔ شاعر کو یہ امید ہوتی ہے کہ یہ جہاں دیدہ اور دانا بزرگ اس کے سوالوں کا جواب دے سکے گا۔ چنانچہ وہ ایک ہی سانس میں سارے سوال اس کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ زندگی کیا ہے؟ سلطنت کا مفہوم کیا ہے؟ سرمایہ ومحنت میں یہ کیسی کشمکش ہے؟ جواب میں خضر اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کر دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ اقبال اپنے تجربات خضر کی زبان سے ادا کرتے ہیں۔ خضر ایک سن رسیدہ اور پختہ کار بزرگ ہیں، اس لیے ان کی باتیں حکیمانہ ہیں۔ لب ولہجہ سنجیدہ ومتین ہے۔ جوش وخروش کی کمی نمایاں ہے۔ افکار میں گہرائی زیادہ ہے اور گرمی کم۔ انھوں نے سورۂ کہف میں خضر کی جیسی تصویر دیکھی ویسی ہی پیش کردی۔ اس نظم (خضر راہ) پر مولانا گرامی نے اعتراضات کیے تو اقبال نے جواب میں لکھا۔

> ''کل نیاز الدین صاحب کا خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ نظم خضر راہ آپ کو پسند نہیں اور آپ کی رائے میں اس کے تمام اشعار بے لطف ہیں اور بعض غلط۔ غلط اشعار کے متعلق تو میں فی الحال عرض نہیں کرتا۔ آپ مجھے اغلاط سے آگاہ فرمائیں گے تو عرض کروں گا۔ باقی آپ کے اعتراض کا پہلا حصہ صحیح ہے مگر یہ اعتراض گرامی کے شایانِ شان نہیں۔ اگر کوئی اور آدمی یہ اعتراض کرتا تو مضائقہ نہ تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس نظم کا بیشتر حصہ خضر کی زبان سے ادا ہوا ہے اور خضر کی شخصیت ایک خاص قسم کی شخصیت ہے۔ وہ عمرِ دوام کی وجہ سے سب سے زیادہ تجربہ کار آدمی ہے اور تجربہ کار آدمی کا یہ خاصہ ہے کہ اس کی قوت متخیلہ کم ہوتی ہے اور اس کی نظر حقائق واقعی پر جمی رہتی ہے۔ اس کے کلام میں اگر تخیل کی رنگینی ہو تو وہ رہنمائی کے فرائض ادا کرنے سے قاصر رہے گا۔ پس اس کے کلام میں پختگی اور حکمت تلاش کرنی چاہیے، خاص کر اس حالت میں جب کہ اس سے ایسے معاملات میں راہنمائی طلب کی جائے جن کا تعلق سیاسیات اور اقتصادیات سے ہو۔''

یہ طویل اقتباس اس بات کو واضح کرنے کے لیے نقل کیا گیا ہے کہ کرداروں کی پیش کش اور مکالموں کی ادائیگی میں اقبال اس تکنیک کی ساری باریکیوں کا لحاظ رکھتے تھے۔

تمثیل نگاری کی بہت سی مثالیں ان کے کلام سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ محبت، حقیقتِ حسن چاند اور تارے، ستارہ، دو ستارے، شبنم اور ستارے، شعاع آفتاب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حقیقت حسن ایک کامیاب تمثیل ہے۔ حسن کو اپنے فانی ہونے کی شکایت ہے۔ خدا کے دربار سے اس کی شکایت کا جو جواب ملتا ہے وہ چاند کی زبانی ستارہ صبح کو معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ راز زمین کی طرف آنے والے مسافر شبنم کو معلوم ہو جاتا ہے اور اس کے ذریعے پھول تک پہنچتا ہے اور آخر

کارحسن کی ناپائیداری کارازطشت از بام ہوجاتا ہے۔ یہ مختصر تمثیل پوری نقل کی جاتی ہے۔

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا — جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا — شب درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی — وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی — فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو — فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے — کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا — شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

یہاں ایک اور مختصر تمثیل کا ذکر ضروری ہے جس کی تکنیک ذرا مختلف ہے۔ ستارہ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتا مگر اس کا لرزنا اس کے خوف زدہ ہونے کا پتا دیتا ہے۔ خوف کا سبب بھی نامعلوم ہے چنانچہ پہلے تو کوئی کانپنے کی وجہ دریافت کرتا ہے اور انجام کار ایک اہم راز کے چہرے سے نقاب اٹھا دیتا ہے۔

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو؟ — مآل حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو؟
متاعِ نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو؟ — ہے کیا ہراسِ فنا صورتِ شرر تجھ کو؟
زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھ کو؟ — مثالِ ماہ اڑھائی قبائے زر تجھ کو؟

غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تجھے کانپتے گزرتی ہے

چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے — جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر — فنا کی نیند مے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینش گل — عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں — ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

یہاں ایک مسلسل اور طویل مکالمہ ہے۔ پہلے چار مختصر سوال ہیں۔ پھر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اسے قدرت نے بھی کچھ تو عطا کیا ہے۔ اس کے بعد اظہار تعجب کیا جاتا ہے کہ ایسی نعمتوں سے نوازے جانے کے باوجود وہ ساری رات

ڈرتا اور لرزتا رہتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ابھی تک یہ راز نہیں کھلتا کہ آخر تخاطب ہے کس سے۔ دوسرے بند میں اچانک اسے ''چمکنے والے مسافر'' کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے اور پھر وہ حقیقت بیان کی جاتی ہے جسے جاننے کی ضرورت آسمان کے تاروں کو نہیں زمین کے مکینوں کو ہے۔ پوری نظم گویا ایک مونولاگ ہے۔ ایک اور بات بھی توجہ کی طالب ہے۔ مخاطب یعنی ستارہ ہر ایک کے پیش نظر ہے۔ لیکن بولنے والا نظر سے پوشیدہ ہے۔ نہ جانے یہ شاعر کی آواز ہے یا کوئی غیبی صدا۔ آخر تک ایک ابہام برقرار رہتا ہے جو شعر کے حسن میں اضافے کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ صرف ایک مثال ہے کہ فکر اس طرح فن بن جاتی ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ افلاطون نے اپنے افکار کی اشاعت کا ایک نرالا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ وہ راستہ چلتے لوگوں کو روک کر ان سے سوال کرتا تھا صرف سوال! اور سننے والا سوچنے کے لیے مجبور ہو جاتا تھا۔ جو باتیں اس شخص کے ذہن میں آتی تھیں وہ وہی حکیمانہ باتیں ہوتی تھیں جنھیں افلاطون کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکتا تھا۔ اس طریق کار سے اقبال نے بھی کام لیا ہے مگر انداز جداگانہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شاعرانہ ہے۔

سوالیہ انداز سے اقبال نے اپنی شاعری میں بہت کم کام لیا ہے۔ کبھی وہ سوال کرتے ہیں اور جواب بھی دیتے ہیں۔ کبھی صرف سوال کرنے پر بس کرتے ہیں اور جواب قاری کے تخیل پر چھوڑ دیتے ہیں۔ سوالوں کی تیسری قسم وہ ہے جسے استفہام تنکیری کہا جاتا ہے۔

شاعر موت کی حقیقت سے آشنا ہونا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ شہر خموشاں کے مکینوں سے اکتیس سوال کرتا ہے۔ (خفتگانِ خاک سے استفسار) جن میں سے چند یہ ہیں۔

وہ بھی حیرت خانہ امروز و فردا ہے کوئی؟ اور پیکارِ عناصر کا تماشا ہے کوئی؟

آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا؟ اس ولایت میں بھی ہے انسان کا دل مجبور کیا؟

کیا وہاں بجلی بھی ہے دہقان بھی ہے خرمن بھی ہے؟ قافلے والے بھی ہیں اندیشہ رہزن بھی ہے؟

جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا؟ واں بھی انسان ہے قتیل ذوقِ استفہام کیا؟

اس نظم میں سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا بلکہ یہ نظم جس شعر پر ختم ہوتی ہے اس سے خود سو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

تم بتا دو راز جو اس گنبدِ گرداں میں ہے

موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انسان میں ہے

''شمع و پروانہ'' میں شمع سے بہت سے سوال کیے جاتے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اے شمع آخر تیری روشنی میں ایسی کیا بات ہے کہ پروانہ اس پر فدا ہو جاتا ہے اور موت کے آزار میں آرامِ جاں پاتا ہے۔ آگے چل کر ایک اشارہ ملتا ہے کہ۔

چھوٹا سا طور تو یہ ذرا سا کلیم ہے

گویا ازل سے عشق حسن پر فدا ہوتا آیا ہے۔ ''ستارہ'' کی مثال اوپر گزری جس کے ہر سوال میں جواب پوشیدہ ہے۔ جگنو، میں اور تو، شکوہ اور جواب شکوہ وغیرہ سے اس تکنیک کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

لفظ و معنی کی مطابقت بھی شاعری میں ایک بڑی اہم منزل ہے۔ اس کے بغیر اعلیٰ درجے کی شاعری وجود میں نہیں آسکتی۔ یہ کہنا درست نہیں کہ لفظوں کے بغیر کوئی خیال ذہن میں پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ خیال اپنی پہلی شکل میں مجرد ہوتا ہے اور جب لفظوں میں ڈھل جاتا ہے تو وہ عام طور پر اپنی اصل سے کمتر رہ جاتا ہے۔ شاعر کا خیال بلکہ شاعری کی زبان میں جذبہ کبھی اتنا پرجوش ہوتا ہے کہ لفظوں کا جامہ اس پر تنگ ہوتا ہے اور الفاظ اس کی تاب نہیں لاسکتے۔

آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

شاعر ابلاغ کے لیے بہتر سے بہتر الفاظ کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ایک ایک لفظ کو تنقیدی نظر سے دیکھتا ہے اور بقول حالی اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا جب تک زبان کے سارے کنویں نہ جھانک لے۔ جو الفاظ شاعر کے ذہن میں پہلی بار آتے ہیں ضروری نہیں کہ تخلیق کا عمل مکمل ہونے تک وہی برقرار رہیں یا ان کی پہلی ترتیب قائم رہے۔ حک و اصلاح اور قطع و برید کے اس عمل کو حالی آورد کا نام دیتے ہیں۔ ان کے لفظوں میں شعر شاعر کے دماغ سے ہتھیار بند نہیں کودتا۔ وہ اشعار جن پر بے ساختگی کا گمان ہوتا ہے عموماً شاعر کی لگاتار محنت سے اپنی آخری شکل اختیار کرتے ہیں۔ بڑے بڑے اساتذہ کا کلام اور اس کلام کے مسودے اس کی شہادت دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ دعویٰ باطل ٹھہرتا ہے کہ ہر خیال کو ادا کرنے کے لیے کچھ الفاظ پہلے سے مخصوص ہیں اور ان کی ترتیب بھی پہلے سے طے ہے۔ خود ہماری زبان کے شاعروں نے ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھ کر اس دلیل کو رد کیا ہے۔ اقبال کا کلام شاہد ہے کہ انھوں نے ایک بات کو دس انداز سے ادا کیا ہے اور ہر بار اپنی بات کو پہلے سے زیادہ دلنشیں اور پرتاثیر بنانے کی کوشش کی ہے۔

کلام میں تراش خراش اور نوک پلک کی درستی کی اہمیت سے اقبال اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے اپنے نکتہ چینوں کے اعتراضات کی روشنی میں بھی اور دوستوں کے مشورے پر بھی اپنے کلام کی خود اصلاح کی۔ ہر اچھا شاعر تنقیدی صلاحیت رکھتا ہے۔ اقبال اپنے کلام کو تنقیدی نظر سے دیکھنے اور اس میں بار بار تراش خراش کرنے کے عادی تھے۔

ایک خط میں جسٹس دین محمد کو لکھا ہے کہ ایک شعر میں چالیس بار ردوبدل کیا گیا ہے۔ اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں وہ اپنے شعروں کو سنوارنے کی طرف زیادہ متوجہ رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ابتدائی کلام میں زیادہ صناعی ملتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس طرف ان کی توجہ کم ہوتی چلی گئی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس عمل کی افادیت کے قائل نہ رہے تھے بلکہ اس لیے کہ وقت کم تھا اور کہنے کو بہت کچھ باقی تھا۔ چنانچہ اب وہ متنبی اور ابن الرومی کی طرح زبان کی زیادہ پرواہ نہ کرتے تھے۔ ایک بار جب اقبال کی توجہ بعض الفاظ کے غلط استعمال کی طرف دلائی گئی تو انھوں نے جواب میں لکھا کہ ''میں نے اس سے بھی زیادہ لفظوں پر نشان لگا رکھا ہے جن کے استعمال سے میں مطمئن نہیں لیکن انھیں در ت کرنے کا موقع نہیں ملتا'' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شاعرانہ انداز جو ان کے ابتدائی کلام کی خصوصیت ہے ماند پڑتا گیا اور آخر کار اس کی جگہ ایک عمیق اور واضح اسلوب نے لے لی۔ اب وہ جو کچھ کہتے تھے بلا قصد کہتے تھے اور اس کو آمد خیال کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ صورت من جانب اللہ ہوتی ہے۔ یقیناً ہوتی ہے لیکن ایک بات یہ بھی تھی کہ مشق و مہارت نے انھیں پختہ کار شاعر بنا دیا تھا۔ تخلیق کے وہ مراحل جو نومشق کے یہاں کاغذ پر طے ہوتے ہیں کہنہ مشق شاعر کے یہاں ذہن ہی میں طے ہو جاتے ہیں۔ حالی نے اسے ڈال ہی پر انگور کے اندر شیرہ پکنے سے تشبیہہ دی ہے۔ مشق و مطالعے نے اقبال کے یہاں یہی صورت پیدا کر دی تھی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ لفظوں کی فکر نہ کرتے تھے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اب لفظ ان کے کلام میں اپنی فکر آپ کرنا سیکھ گئے تھے۔

صوتی آہنگ سے اقبال نے اپنی شاعری میں بہت کام لیا ہے وہ لفظوں کے پارکھ تھے۔ علم موسیقی پر بھی ان کی نظر تھی اور وہ آوازوں کی تاثیر سے پوری طرح واقف تھے۔ ممکن ہے یہ صورت غیر شعوری طور پر پیش آئی ہو لیکن یہ اصلیت ہے کہ ان کے کلام میں صوتی آہنگ نے مطلوبہ فضا تیار کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔ اقبال کے بعض ناقدین نے لسانیات کی مغربی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر کلام اقبال کا مطالعہ کیا ہے جس سے کچھ غلط نتائج بھی برآمد ہوئے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ انگریزی شاعری میں س اور ش کی آوازوں سے حزن و ملال کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ افسردگی و مایوسی اقبال کا رویہ نہیں ہاں ایک لمحاتی کیفیت ضرور ہے۔ چنانچہ اقبال کی شاعری میں ان آوازوں (س۔ش) کو سکوت کی فضا پیدا کرنے میں معاون قرار دیا گیا اور مثال میں یہ شعر پیش کیا گیا۔

شب سکوت افزا ہوا آسودہ دریا نیم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب

لیکن کلام اقبال سے ہی اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے۔ مثلاً ع جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا

سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

عشق نے کردیا تجھے ذوق تپش سے آشنا بزم کو مثلِ شمع بزم حاصل سوز و ساز دے

شانِ کرم پہ ہے مدار عشق گرہ کشاے کا دیر و حرم کی قید کیا جس کو وہ بے نیاز دے

البتہ انھوں نے س، ش، ر، م، ن کی آوازوں اور ان کی تکرار سے اپنے کلام میں موسیقی ضرور پیدا کی ہے۔ مثلاً۔

خورشید بدا مانم، انجم بگر یبانم در من نگری ہیچم در خود نگری جانم

درشہر و بیا بانم در کاخ و شبستانم من دردم و در ماتم من عیشِ فرادانم

من تیغ جہاں سوزم من چشمہ ء حیوانم

فرصت کشمکش مدہ ایں دل بے قرار را

گفتند جہاں ما آیا بتومی سازد

گفتم کہ نمی ساز و گفتند کہ برہم زن

رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان

تو بھی اے فرزندِ کہستاں اپنی خودی پہچان

اپنی خودی پہچان

او رغافل، افغان

موسیقی پیدا کرنے کے لیے اقبال نے الفاظ کی تکرار سے بھی کام لیا ہے جیسے۔

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا

میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے ، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیراہن

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل ودمن نگر — سبزہ جہاں جہاں بہ بیں لالہ چمن چمن نگر
بادِ بہار موج موج مرغِ بہار فوج فوج — صلصل و ساز زوج زوج برسر ناروں نگر

اقبال کے عہد میں ردیف کے ساتھ قافیے کو بھی ترک کرنے کا رجحان پیدا ہو رہا تھا۔ اقبال نے نہ صرف یہ کہ قافیہ ترک نہیں کیا بلکہ بعض جگہ اس کا زیادہ اہتمام کیا اور اس سے اپنے کلام میں حسب ضرورت موسیقی پیدا کی۔ جہاں وہ اپنی بات کو بلند آہنگ میں پیش کرنا چاہتے ہیں وہاں ثقیل قوافی استعمال کرتے ہیں جیسے تصدیق، زندیق، عتیق، دقیق، خلیق، یا خویشی، نیشی، اندیشی، ، بیشی اور پرویز خونریز یا قند، پیوند وغیرہ۔ ان کی غزلوں میں بے ردیف غزلیں بھی موجود ہیں اور لمبی ردیف کی بھی جیسے: ہے تو کہ میں، سمجھا تھا میں اور بھی ہیں، کے سوا کچھ اور نہیں۔

اقبال عام قوافی کے علاوہ بعض جگہ اندرونی اور زائد قوافی بھی استعمال کرتے ہیں جن سے موسیقی میں اضافہ ہوتا ہے۔ چند مثالیں۔

میں نوائے سوختہ درگلو — تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو — تو حدیث ماتمِ دلبری

یعنی دلبری کے علاوہ گلو، بو اور آرزو

حلقہ بستند سرِ تربتِ من نوحہ گراں
دلبراں، زہرہ وشاں ، گلبدناں ، سیمبراں

مرا عیش غم مرا شہد سم مری بود ہم نفسِ عدم
ترا دل حرم گرد عجم ترا دیں خریدۂ کافری

غرض یہ کہ موسیقیت کلامِ اقبال کا وصف خاص ہے اور یہ موسیقی بلند آہنگ ہے۔ اقبال کے کلام میں ترنم کی دھیمی

دھیمی کیفیتیں کم ہیں اوراونچے سرزیادہ۔ دراصل نرم سروں کی موسیقی خواب آور ہوتی ہے۔اور افسردگی پیدکرتی ہے۔اقبال کے نزدیک یہ دونوں کیفیتیں موت سے ہم رشتہ ہیں اوروہ موسیقی جوافسردگی پیدا کرے ان کے مشرب میں حرام ہے۔

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے وچنگ ورباب

اور ہندوستانی موسیقی کا بیشتر حصہ اسی قسم کا ہے۔علالت کے دوران اقبال کی طبیعت پر اضمحلال طاری تھا۔کسی نے انھیں موسیقی سے لطف اندوز ہونے کا مشورہ دیا۔انھوں نے جواب دیا کہ ہندوستانی موسیقی الم انگیز ہے۔اس سے طبعیت میں شگفتگی پیدانہیں ہوسکتی۔انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ" ہندوقوم کواس کے فنِ موسیقی نے مردہ بنایا۔" موسیقی کے بارے میں جو یہ نقطہ نظر رکھتا ہواس سے سبک رفتار، دھیمی اورنرم سروں کی موسیقی کی توقع کم ہی کی جاسکتی ہے۔ تاہم یہ لے ان کے کلام میں یکسر معدوم نہیں۔ایک آرزواور کنارراوی نرم لہجے کی عمدہ مثالیں ہیں۔اسی طرح ایک اورنظم (عبدالرحمٰن اوّل کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت۔۔۔سرزمین اندلس میں) ملاحظہ ہو۔۔۔

میری آنکھوں کا نور ہے تو | میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں | میرے لیے نخلِ طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا | صحرائے عرب کی حور ہے تو
پردیس میں ناصبور ہوں میں | پردیس میں ناصبور ہے تو

غربت کی ہوامیں بارور ہو
ساقی تیرا نم سحر ہو

عالم کا عجیب ہے نظارہ | دامانِ نگہ ہے پارہ پارہ
ہمت کو شناوری مبارک | پیدا نہیں بحر کا کنارہ
ہے سوز دروں سے زندگانی | اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
صبح غربت میں اور چمکا | ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

بلاشبہ اس طرح کی کچھ اور مثالیں بھی ان کے کلام سے تلاش کی جا سکتی ہیں لیکن عام طور پر ان کی موسیقی میں صلابت اور توانائی پائی جاتی ہے تاہم ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ اس کی حدیں کرختگی اور درشتی سے جا ملیں۔ ان کے کلام میں جوش اور زور پایا جاتا ہے۔ معمولی الفاظ بھی ان کے ہاتھ میں آتے ہیں تو ان میں برقی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔

تواں از گرمیِ آواز من شناخت مرا

شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کے مانند ہو تیزی میں تری مے

توانا پُرشکوہ لہجہ کلام اقبال کی اہم خصوصیت ہے ان کا اسلوب قاری کو اپنے ساتھ آسمان کی بلندیوں میں لے جاتا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ انسان تخلقوا باخلاق اللہ پر عمل پیرا ہو کر بندۂ مولا صفات بن جائے اور اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جائے۔ اس خواہش کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہماری شاعری میں اقبال کی آواز آوازِ ربانی بن گئی۔ جو شاعر کلام اللہ کی تشریح و تفسیر کر رہا ہو اگر اس کا اسلوب قرآنی اسلوب متاثر ہو جائے تو اس میں کوئی حیرت کی بات بھی نہیں۔ کلام اقبال میں یہ انداز کہیں لفظوں کے آہنگ سے پیدا ہوا ہے، کہیں ردیف و قافیے سے اور کہیں بحروں کے انتخاب سے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے بحرِ متقارب کا استعمال کیا ہے۔ بحرِ ہزج، بحرِ مضارع اور بحرِ رمل کی مختلف شکلوں سے انھوں نے اپنے کلام میں موسیقی پیدا کی ہے۔

مستزاد سے بھی اقبال نے زور پیدا کرنے کا کام لیا ہے۔ مختلف اوزان نے بھی بعض جگہ یہ صورت پیدا کر دی ہے۔ بلند آہنگ موسیقی کے سلسلے میں فرمانِ خدا، جوابِ شکوہ، مسجد قرطبہ، ساقی نامہ، ذوق و شوق نیز زبورِ عجم کا مطالعہ خاص طور پر ضروری ہے۔ تاہم یہاں چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

خواجہ از خونِ رگ مزدور ساز ولعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی
دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی

اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی
صہبائے یقیں درکش و از دیرِ گماں خیز

از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خوب گراں خیز

دما دم رواں ہے یمِ زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

یہ ثابت بھی ہے اور سیّار بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر

لکہ ابرِ رواں . کشتیِ بے بادباں
مثلِ خضر راہ داں بر تو سبک ہر گراں
لختِ دل ساریاں تیز تر گامزن منزلِ ما دور نیست

ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

یہ پورب یہ پچھّم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کی شاعری میں رعنائی سے زیادہ تجمل ہے، جوئے نغمہ خواں سے زیادہ جوئے کہستاں کی روانی ہے اور نسوانی حسن سے زیادہ مردانہ وجاہت ہے۔ وہ خود اپنی شاعری کو بانگِ صورِ سرافیل کہتے ہیں اور اس کی تپش و براقی کا ذکر کرتے ہیں۔

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگِ صورِ سرافیل دلنواز نہیں

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا صورِ سرافیل

عزیز تر ہے متاعِ امیر و سلطاں سے
وہ شعر جس میں ہے بجلی کا سوز و براقی

کلامِ اقبال کا صوتیاتی نظام خصوصی توجہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ تنقید کی وہ شاخ جو شعر و ادب کے صوتیاتی نظام سے بحث کرتی ہے حال ہی میں وجود میں آئی ہے۔ اور ہمارے یہاں ابھی اس سمت میں بہت کم کام ہوا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس زاویے سے ادب بالخصوص شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے دلچسپ، کارآمد اور دوررس نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ پروفیسر نارنگ نے اقبال کے صوتیاتی نظام پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ان کی آواز میں ایک ایسا جادو، ایسی کشش اور نغمگی ہے جو پوری اردو شاعری میں کہیں اور نہیں ملتی۔ ان کے لہجے میں ایسا شکوہ، توانائی، بے پایانی اور گونج کی ایسی کیفیت ہے جیسے کوئی چیز گنبدِ افلاک میں ابھرتی اور پھیلتی ہوئی چلی جائے۔ اس میں دلنشینی اور دل آویزی کے ساتھ ساتھ ایک ایسی برش، روانی، تندی اور چستی ہے جیسے سرود کے کسے ہوئے تاروں سے کوئی نغمہ پھوٹ بہا ہو یا کوئی پہاڑی چشمہ ابل رہا ہو۔ آخر اس فطری نغمگی کا صوتیاتی راز کیا ہے یا اس کا تعلق کن خاص آوازوں سے ہے۔ یہ راز اگر ہاتھ آجائے تو اس سے اقبال کے پورے صوتیاتی نظام کی گرہ کھل سکتی ہے۔

اس کے بعد کلام اقبال کا تجزیہ کرنے کے بعد پروفیسر نارنگ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اقبال کی شاعری میں صفیری اور مسلسل آوازوں کی کثرت ہے اور طویل غنائی مصوتوں کے معاملے میں وہ غالب سے کہیں آگے اور میر کے ہم پلہ ہیں۔ اسی میں کلامِ اقبال کی دل آویزی کا اصل راز پوشیدہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزلیں بلکہ نظمیں بھی گلوکاروں میں مقبول رہی ہیں اور رہیں گی۔

رومانی عناصر اقبال کی شاعری میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے شاعری شروع کی تو اردو میں رومانی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس تحریک سے ان کا متاثر ہونا فطری بات تھی لیکن وہ یکسر رومانی شاعر نہیں کہے جا سکتے۔ ان کے یہاں رومانی عناصر کے پہلو بہ پہلو کلاسیکی عناصر بھی ملتے ہیں۔ رومانی تحریک دراصل حد سے بڑھی ہوئی تعقل پسندی کے خلاف ایک بغاوت تھی اور برگساں اس کا امام تھا۔ وہ عقل کو اس لیے رد کرتا ہے کہ عقل حقیقت کو بطور کل سمجھنے سے قاصر ہے۔ اقبال عقل کو مصلحت اندیش اور عیار قرار دیتے ہیں اور خطر پسند عشق کو اس پر ترجیح دیتے ہیں تاہم وہ خرد کی اہمیت کا سرے سے انکار نہیں کرتے۔ رومانیت انسان کو مرکز کائنات قرار دیتی ہے۔ اس معاملے میں اقبال بھی اس کے ہم نوا ہیں اور انسان کو خلاصۂ کائنات سمجھتے ہیں۔ ان کا مردِ حر رومانی مردِ کامل کے بہت نزدیک ہے لیکن اقبال کا مردِ مومن یا مردِ قلندر

اطاعت الٰہی کے ذریعے نیابت کے درجے پر فائز ہوتا ہے۔ رومانی فن کاروں کی طرح اقبال کو بھی حسن فطرت عزیز ہے۔ لیکن کلام کے علاوہ ان کی تمام شاعری میں فطرت نگاری مقصد کے طور پر نہیں بلکہ ذریعے کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ کہیں وہ اس سے پس منظر کا کام لیتے ہیں کہیں اپنی بات کو پر اثر بنانے کا بانگِ درا میں اقبال کی منظر نگاری کا انداز یہ ہے۔

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

فطرت نگاری کا یہ انداز اس زمانے کی یادگار ہے جب اقبال نے پیغامبری کا منصب اختیار نہیں کیا تھا۔ بعد میں فطرت نگاری کی حیثیت ضمنی ہوگئی اور وہ اسے اپنے پیغام کو نمایاں کرنے اور اپنے فلسفے کی وضاحت کرنے کے لیے استعمال کرنے لگے۔ مثال کے طور پر ساقی نامہ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی — اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی

اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی — بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ — پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ذرا دیکھ اے ساقیِ لالہ فام — سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

انسان دوستی اور داخلیت جو رومانیت کی اہم خصوصیات ہیں اقبال کے کلام میں موجود ہیں۔ رومانی فن کاروں کی طرح آزادی انھیں بے حد عزیز ہے۔ رومانیت پسندوں کی طرح وہ ماضی پرست نہیں لیکن پر عظمت ماضی کی یادیں اکثر انھیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ مستقبل ان کے لیے کہر میں لپٹا ہوا نہیں بلکہ آنے والی صبح ان کی نظر میں بے نقاب ہے۔ مادیت اور خالص منطق سے وہ بیزار ہیں۔ شدید جذباتی کیفیت ان کی شاعری میں جگہ جگہ ملتی ہے۔ اس طرح وہ رومانیت کے نزدیک آجاتے ہیں مگر اس سے انحراف بھی کرتے ہیں۔ رومانی شاعر زندگی سے گریز کرتا ہے اور اقبال اس گریز کے مخالف۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جدوجہد میں لافانی زندگی کا راز پوشیدہ ہے:

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

ایک اور اہم چیز جو انھیں رومانی فن کاروں سے جدا کرتی ہے وہ فن کے بارے میں ان کا کلاسیکی مزاج ہے۔ شاعری کے مقررہ سانچوں سے یکسر انحراف انھیں تخریب کاری معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کے زمانے میں ہیئت کے تجربے شروع ہوگئے تھے۔ اقبال نے ان کا مطالعہ کیا، ان پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ تبدیلیاں اردو میں مقبول ہونے والی

نہیں، چنانچہ نہ انھوں نے قافیے کو ترک کیا اور نہ مروجہ بحروں کو رد کیا۔ اس لیے ہم ان کے اسلوب کو کلاسیکی اسلوب کہہ سکتے ہیں۔ البتہ مروجہ شعری شکلوں میں معمولی رد و بدل کر کے انھوں نے جدت طرازی کا ثبوت دیا۔ مثلاً ایک ہی نظم میں مختلف وزن کے مصرعوں کا اہتمام یا ایک نظم میں دو مختلف زبانوں کا استعمال۔ مریدِ ہندی اردو میں سوال کرتا ہے اور پیر رومی فارسی میں جواب دیتا ہے۔

غزل کی فارم کو اقبال نے بطورِ خاص استعمال کیا۔ ان کی طویل نظموں کے بند غزل کی فارم میں ہیں اور ان کی طویل نظمیں گویا کئی کئی مسلسل و مربوط غزلوں کا مجموعہ ہیں۔ ایک غزل کو دوسری غزل سے ایک شعر الگ کرتا ہے جس کا اپنا قافیہ ردیف ہے۔ مثال کے طور پر ذوق و شوق کا پہلا بند ایک طرح کی مسلسل غزل ہے جو پانچ شعروں پر مشتمل ہے۔ قوافی ہیں سماں، رواں وغیرہ اس کے بعد درج ذیل شعر ہے جو پہلے بند کو دوسرے سے الگ کرتا ہے۔

آئی صدائے جبرائیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

پھر اگلا بند حیات، وردات، قوافی کے ساتھ شروع ہوتا ہے جو اپنی جگہ پر ایک غزل مسلسل ہے، خضر راہ کی شکل بھی یہی ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ اقبال کی طبیعت کو غزل سے خاص مناسبت ہے۔ جس کے نتیجے میں ان کی نظموں میں غزل کا انداز پیدا ہو گیا ہے اور جا بجا ایسے اشعار نظر آتے ہیں جن پر غزل کے شعر ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے۔

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں — یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
اڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے — چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

ہاں آشنائے لب نہ ہو طرزِ کہن کہیں — پھر چھڑ نہ جائے قصہ دار و رسن کہیں

پنہاں درونِ سینہ کہیں راز ہو ترا — اشکِ جگر گداز نہ غماز ہو ترا

اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا — دل کسی اور کا دیوانہ، میں دیوانہ دل

ہر دل مےِ خیال کی مستی سے چور ہے — کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے

ہمارے مزاج میں غزل اس طرح رچ بس گئی ہے کہ جو نظمیں نظم کی تعریف پر پوری اترتی ہیں وہ ہمیں روکھی پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔ نظم تو دور کی بات ہے۔ آج بھی ہم افسانہ سنتے ہیں تو اس کے دلکش جملوں پر اس طرح داد دیتے ہیں جیسے وہ کسی افسانے کا جزو نہ ہو غزل کا شعر ہو۔ اقبال کی نظموں کی مقبولیت میں اس بات کو بھی دخل ہے کہ ان کی نظموں کے بیشتر اشعار غزل کے شعروں کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ اب اسے عیب کہیے یا ہنر۔ اقبال کی غزل کا مطالعہ کیجیے تو اس میں کچھ نظم کا انداز ملے گا یعنی ربط و تسلسل۔ اقبال کے کلام میں تشبیہ کا استعمال استعارے سے زیادہ نظر آتا ہے اور یہ استعارے ترصیعی سے زیادہ توضیحی نوعیت کے ہیں۔

رموز علائم کو شاعری میں ہمیشہ سے بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ فلسفیانہ شاعری میں ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ علامت، استعارہ، کنایہ اور قصہ و حکایت کا سہارا لے کر شاعر کم سے کم لفظوں میں اپنی بات اپنے مخاطب تک پہنچا سکتا ہے۔ ہر زبان کے شعر و ادب میں ایسے رموز و علائم موجود ہوتے ہیں جو کہنے والے اور سننے والے کے درمیان رابطے کی مختصر زبان (کوڈ لنگویج) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح لفظوں کی کفایت بھی ہوتی ہے اور بات میں حسن بھی پیدا ہوتا ہے۔ عربوں میں ایک مقولہ رائج تھا کہ بہترین بات وہ ہے جو کنایے میں کہی جائے۔ اقبال کہتے ہیں۔

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی ست

حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا

حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

ہر بڑا شاعر رموز و علائم کے ذخیرے میں دو طرح سے اضافہ کرتا ہے۔ پہلی صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ پرانے رموز و علائم کے مفاہیم کو وسعت دے یا انھیں نئی معنویت عطا کرے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے خیال و جذبے کے ابلاغ کے لیے نئے رموز و علائم وضع کرے۔ اقبال اپنی شاعری میں ان دونوں صورتوں سے کام لیتے ہیں لیکن ان کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ فنی تدبیر ابہام پیدا نہ کرے بلکہ اختصار کے ساتھ ساتھ توضیح و تشریح کی صورت پیدا ہو۔ شاعری میں علامت نگاری کا استعمال روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے بڑا سلیقہ چاہیے۔ مغرب خصوصاً جرمنی میں اسے بڑا عروج حاصل ہوا مگر وہاں اس سے صراحت کے بجائے ابہام پیدا کرنے کا کام لیا گیا۔ ملارمے اور رامبو کی

علامتیں معنی سے بیگانہ ہوگئیں اور سی۔ ڈی لیوس کے بقول علامت کے اس استعمال نے ایک خفیہ زبان کو جنم دیا۔ علامت اگر نا قابلِ فہم ذاتی مفاہیم تک محدود ہو کر رہ جائے تو اس کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اقبال کی علامتوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مروجہ علامتیں مثلاً گل و بلبل، شمع و پروانہ، مے و ساقی، کعبہ و دیر، وہ علامتیں جو پہلے سے رائج تھیں مگر اقبال نے انھیں نئے معنی و مطالب عطا کیے جیسے شہباز، شاہین، ناقہ وِحدی، تیسری وہ علامتیں جو اقبال کی اپنی وضع کردہ ہیں مثال کے طور پر ستارے اور جگنو۔ یہاں صرف اس تیسری قسم کی علامتوں کے بارے میں کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

ستارے کی علامت سے اقبال نے مختلف مفاہیم ادا کیے ہیں۔ مثلاً اس کی پاکی درخشانی پیروی کے لائق ہے۔ اس کی یہ خصوصیت سبق آموز ہے کہ وہ اپنی دنیا کو آپ روشن کرتا ہے۔ ستارہ کہتا ہے:

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی — مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی

تو اے مسافرِ شب! خود چراغ بن اپنا — کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

''ستارے کا پیغام'' (بالِ جبریل)

ستاروں کی زندگی کا راز ان کی گردشِ مسلسل میں پوشیدہ ہے اور سکون موت کی نشانی ہے۔ ستارے شکایت کرتے ہیں کہ وہ برابر سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے رہتے ہیں۔ انھیں کبھی دو گھڑی کے لیے آرام نہیں ملتا:

کام اپنا ہے صبح و شام چلنا

چلنا چلنا مدام چلنا

چاند جواب دیتا ہے:

کہنے لگا چاند، ہم نشینو — اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی — یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ — کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے

چلنے والے نکل گئے ہیں — جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

چاند اور تارے (بانگِ درا)

ستاروں کی علامت کا تیسرا استعمال یہ واضح کرنے کے لیے ہے کہ ان کی قربانی بڑی نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ ہزاروں

لاکھوں ستارے فنا ہو جاتے ہیں تب کہیں ایک سورج طلوع ہوتا ہے اور اندھیرے کو اجالے میں بدل دیتا ہے:

اجل ہے لاکھ ستاروں کی اک ولادت مہر

اور

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

ستاروں کا باہمی اتحاد بھی انسان کے لیے سبق آموز ہے۔ نظر آنے والے ستارے اور ان کے ساتھ وہ کم ضو ستارے جو انسان کو نظر سے پوشیدہ ہیں سب مل کر کوشش کرتے ہیں تب کہیں اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی انفرادی کوششیں اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتیں جب تک اس کی مساعی ملت میں ضم ہو کر اجتماعی کوششیں نہ بن جائیں۔ بزم انجم میں شاعر ایک فرشتے کی زبان سے ستاروں سے خطاب کرتا ہے:

اے شب کے پاسبانو! اے آسماں کے تارو! — تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمہاری

چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھیں سونے والے — رہبر ہے قافلوں کی تابِ جبیں تمہاری

آئینے قسمتوں کے یہ تم کو جانتے ہیں — شائد سنیں صدائیں اہلِ زمیں تمہاری

ستاروں کی برتری ذہن نشین کرنے سے شاعر کی مراد یہ ہے کہ ان کے جواب میں زیادہ تاثیر پیدا ہو جائے۔ آخر خاموشی ٹوٹتی ہے اور یہ پیغام ملتا ہے۔

حسن ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں — جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں

یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا — قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں

آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم — داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں

اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے — جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے — پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

اس کے علاوہ ستارہ اقبال کی شاعری میں ناپائیدار زندگی کی علامت ہے۔ صبح کے ستارے کو گلہ ہے کہ: ملی نگاہ مگر فرصت نظر نہ ملی۔ وہ بلندی کی اس زندگی پر جس کی مدت کچھ لمحوں سے زیادہ نہیں پستی کی زندگی کو ترجیح دیتا ہے جس میں روز کا مرنا جینا نہ ہو۔ ستارے کو اس موتی پر رشک آتا ہے جو کسی تاج میں جگہ پاتا ہے، کسی کے ہار میں جگمگاتا ہے یا انگوٹھی کا نگینہ بن کر چمکتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ قطرہ شبنم بن کر کسی پھول کے رخسار پر ٹپک جاتا یا افشاں کا ستارہ بن کر کسی کی

مانگ کو روشن کرتا یا کسی حسینہ کی آنکھ کا آنسو بن کر اس کے شوہر کی رخصت کے وقت ٹپکتا اور مٹی میں جذب ہو کر امر ہو جاتا۔ یہاں ستارہ محرومی اور آرزومندی کی علامت بن جاتا ہے۔

جگنو کی علامت کے وسیلے سے بھی اقبال نے مختلف رازوں کے چہروں سے نقاب اٹھائی ہے۔ پروانے کے دل میں عشق کی آگ دہکتی ہے۔ آگ جگنو کے پاس بھی ہے لیکن تپش سے محروم: کس آتش بے سوز پر مغرور ہے جگنو۔ لیکن دوسری بات یہ ہے کہ ایک روشنی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور دوسرا خود سراپا روشنی ہے:

پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا

وہ روشنی کا جویا، یہ روشنی سراپا

دریوزہ گرِ آتش بیگانہ نہیں میں

استعارہ شاعری میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ بقول آل احمد سرور ارسطو کے وقت سے یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ شعر کی جان استعارہ ہے۔ شاعر اپنے تخیل سے استعارہ کو جنم دیتا ہے۔ شکسپیر نے کہا ہے کہ شاعر اپنے تخیل کی مدد سے پرچھائیوں کو جسم اور محسوسات کو زبان دیتا ہے۔ ''تشبیہہ میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں موجود ہوتے ہیں یعنی وہ چیز بھی جس کو تشبیہ دی جارہی ہے اور وہ چیز بھی جس سے تشبیہ دی جارہی ہے۔ استعارے میں ان دونوں میں سے صرف ایک موجود ہوتی ہے اس لیے تشبیہ میں صراحت و وضاحت ہوتی ہے اور استعارے میں رمز وایہام، نثر صراحت کا تقاضا کرتی ہے اس لیے تشبیہہ وہاں زیادہ کارگر ہوتی ہے۔ شاعری میں ابہام سے حسن پیدا ہوتا ہے لہذا استعارہ اسے زیادہ راس آتا ہے۔ مگر اقبال پیامی شاعر ہیں اور پیام میں پیچیدگی وابہام کی گنجائش کم ہوتی ہے اس لیے ان کے استعارے ترصیعی سے زیادہ توضیحی نوعیت کے ہیں۔ مطلب یہ کہ انھوں نے استعاروں سے تزئین کلام کا کام کم لیا اور تخلیق معانی کا زیادہ۔ کلیاتِ اقبال تشبیہات واستعارات سے معمور ہے۔ ان کی نظم ''جگنو'' ہم میں سے کس نے بچپن ہی نہ پڑھ لی ہوگی۔ اس نظم میں تشبیہوں اور استعاروں کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں

زرہ ہے نمایاں سورج کے پیراہن میں　　تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی　　نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

پیکر تراشی جسے صورت گری یا امیجری بھی کہا جاتا ہے، شاعری کا نہایت اہم فنی وسیلہ ہے۔ شاعر کو مشاہدے کے ذریعے جو حسی تجربے حاصل ہوتے ہیں انھیں وہ تخیلی پیکر کے ذریعے پیش کر دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ شاعر کا قلم تصویر کشی کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ کسی شے، کسی منظر، کسی حالت کی تصویر اس کے پردہ ذہن پر نقش ہو جاتی ہے اور لفظوں کے ذریعے اس تصویر کو قاری کے سامنے اس طرح پیش کر دیتا ہے کہ وہ اصل تصویر سے کہیں زیادہ حسین نظر آتی ہے۔ شبلی نے اسے محاکات کہا ہے۔ آج کی تنقیدی زبان میں اسے پیکر کہا جاتا ہے۔ یہ لفظی تصویر یا پیکر ہمارے پانچوں حواس میں سے کسی ایک اور کبھی ایک سے زیادہ کو متاثر کرتی ہے۔ مگر سب سے زیادہ متاثر ہونے والے حواس ہیں باصرہ اور سامعہ یعنی دیکھنے اور سننے کی قوت، شاعر کی اصل کامیابی اس میں ہے کہ وہ اپنے تجربے کو شعر کی تجسیمی شکل میں قاری کے سامنے پیش کر دے اور پیکر سازی اس تجسیم کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔

تسلیم کیا گیا ہے کہ شاعری مصوری سے برتر ہے۔ مصور ذہنی کیفیات کو بمشکل ہی پیش کر پاتا ہے اور حرکت کو گرفت میں لینا تو اس کے امکان میں ہے ہی نہیں جبکہ شاعری کو ان دونوں پر قدرت حاصل ہے۔ شبلی نے اس نکتے پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ شاعر تصویر کا ہر جز و نمایاں کر کے نہیں دکھاتا۔ اس کے باوجود اس کی بنائی ہوئی تصویر اس سے زیادہ اثر پیدا کر سکتی ہے جو اصل چیز کے دیکھنے سے ہوتا۔

اقبال نے اپنی شاعری میں پیکر تراشی سے بہت کام لیا ہے۔ ان کے پیکر لمسی اور مشامی سے زیادہ سماعی اور بصری ہوتے ہیں۔ بصری پیکروں میں لونی اور ان سے بھی زیادہ تعداد نوری پیکروں کی ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اقبال کے زیادہ تر پیکر حرکی ہوتے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

پتیاں پھول کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح
دستِ طفل خفتہ سے رنگین کھلونے جس طرح

چاند جو صورت گرِ ہستی کا اک اعجاز ہے
پہنے سیمابی قبا محوِ خرامِ ناز ہے　　(بصری، لونی، حرکی)

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سیمیں قمر
نور خورشید کے طوفان میں ہنگام سحر

جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل
چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول

جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضا ے کلیم
موجہ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم

ہے تیرے سیلِ حوادث میں یونہی دل میرا

(بصری،لونی،حرکی)

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامن کوہسار

گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

فضا نیلی نیلی ، ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی ، لچکتی ، سرکتی ہوئی

اچھلتی ، پھسلتی ، سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

(بصری،لونی،حرکی)

شاعرانہ مصوری میں اقبال کومہارت حاصل ہے۔ اپنے پیغام میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے وہ ایک مخصوص فضا اور ماحول تیار کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ عام طور پر مناظرِ فطرت سے کام لیتے ہیں اور ضرورت کے مطابق کبھی متحرک منظر پیش کرتے ہیں کبھی سکوت اور سناٹے کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ سننے والے مسحور کر کے گرفت میں لے لیا جائے ''خضرِ راہ'' کا آغاز اسی طرح ہوتا ہے۔

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشہ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب

جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل
چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

اور خضر کے نمودار ہونے کے لیے ایسی ہی طلسمی فضا درکار تھی۔ کلامِ اقبال سے ایک اور تصویر ملاحظہ ہو۔

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو　　طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور　　گہنے عروسِ شب نے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی　　چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے
وہ دور رہنے والے ہنگامہ جہاں سے　　کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں تارے

ڈرامائی عناصر بھی اقبال کی شاعری میں وافر مقدار میں موجود ہیں۔کہا گیا ہے کہ بڑی شاعری لامحالہ ڈرامے کے نزدیک آجاتی ہے۔اقبال نے اپنی شاعری میں جہاں جہاں تیسری آواز کا استعمال کیا ہے وہاں ڈرامے کی شان پیدا ہوگئی ہے مثال کے طور پر مکالمہ جبرائیل وابلیس، خضرراہ، لینن خدا کے حضور میں۔یہی نہیں اقبال نے غزل کے شعروں میں بھی جابجا ڈرامائی کیفیت پیدا کردی ہے مثلاً۔

جو موجِ دریا لگی یہ کہنے: سفر سے قائم ہے شان میری
گہر یہ بولا: صدف نشینی ہے مجھ کو سامان آبرو کا

یہ موج پریشاں خاطر کو پیغام لبِ ساحل نے دیا
ہے دور وصال بحر ابھی، تو دریا میں گھبرا بھی گئی

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر　　شمع بولی گریہ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

دمِ طوف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیث گداز میں

صنعت گری کی شعوری کوشش اقبال کے کلام میں نہیں ملتی۔ان کے ابتدائی کلام میں رعنائی زیادہ ہے مگر وہاں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ دانستہ طور پر صنعت گری کررہے ہیں۔صنعت کا کمال جب ہے کہ ہم کوئی شعر پڑھیں اور اس سے اس طرح متاثر اور محظوظ ہوں کہ صنعت کی طرف ذہن منتقل نہ ہو۔اگر شعر کی تاثیر پر صنعت غالب آجائے تو یہ پنترے بازی ہوجاتی ہے۔اقبال کے کلام میں صنعتوں کا غیر محسوس استعمال ملتا ہے۔جیسے:

میں تو جلتی ہوں کہ مضمر ہے مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا　　(ایہام تناسب)

گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفانِ اشک
شبنم افشاں تو کہ بزمِ گل میں ہو چرچا ترا

(ایہام تناسب ومراعات النظیر)

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

(تضاد)

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا نہ دوش

(تضاد)

جرات آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

(حشو ملیح)

تلمیحات سے بھی اقبال نے اپنی شاعری میں بہت کام لیا ہے۔ تلمیح ایک ایسی فنی تدبیر ہے جس سے لفظوں کی کفایت ہوتی ہے اور شاعر کسی واقعے کی طرف اشارہ کر کے ایک جہانِ معنی تخلیق کر دیتا ہے۔ تلمیحات اقبال کا سرچشمہ قرآن، احادیث، تاریخ اسلام کے واقعات، پیمبروں کی زندگی اور سبق آموز قصص و حکایت ہیں۔ وہ کہیں کلام پاک کی کسی سورت کا صرف حوالہ دے کر اپنی بات کہہ جاتے ہیں، کہیں اس سورت کے دو ایک لفظ استعمال کرتے ہیں اور بعض موقعوں پر صرف اشارہ کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ کہیں کسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو کہیں کسی بزرگ کا محض نام لے کر اپنی بات کی صراحت کر دیتے ہیں۔ اقبال نے اپنے کلام میں تلمیحات کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ یہاں صرف چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

ایک بار حضرت موسیٰ حضرت خضر کے ہم سفر تھے۔ اثنائے سفر میں حضرت خضر نے تین ایسے کام کیے جو حضرت موسیٰ کے لیے حیرانی کا باعث بنے۔ انھوں نے جس کشتی میں دریا پار کیا منزل پر پہنچ کر اس میں سوراخ کر دیا۔ آخر سبب یہ معلوم ہوا کہ اس علاقے کا ظالم بادشاہ کشتیاں چھین لیتا تھا۔ یہ کشتی اس عیب کے سبب محفوظ رہی۔ انھوں نے بے سبب

ایک لڑکے کو قتل کر دیا۔ وہ جوان ہو کر اپنے نیک والدین کے کے لیے باعث ننگ بننے والا تھا۔ ایک گرتی دیوار کی مرمت کر دی کیوں کہ اس کے نیچے یتیموں کا خزانہ دفن تھا۔ اب وہ ان کے جوان ہونے تک کے لیے محفوظ ہو گیا۔ ایک دریا کے کنارے اقبال کی حضرت خضر سے ملاقات ہوتی ہے۔ اقبال ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کچھ سربستہ رازوں کے چہرے سے نقاب اٹھائیں۔ یہاں ضروری ہے کہ حضرت خضر کے علم کا اعتراف کیا جائے۔ چنانچہ ایک مصرعے میں مندرجہ بالا تینوں واقعات کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ آپ کا علم تو اتنا وسیع ہے کہ اس پر پیغمبر بھی حیران رہ جاتے ہیں:

کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

اب بعض مثالیں بلا تشریح درج کی جاتی ہیں:

نظر تھی صورتِ سلماں ادا شناس تری
شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثلِ کلیم سودا تھا
اویس طاقتِ دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کو نور تھا گویا
ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا

(بلال)

سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصہ پیمانِ اولیں میں نے
لگی نہ میری طبیعت ریاض جنت میں
پیا شعور کا جب جام آتشیں میں نے
نکلا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے
کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے
کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کا سفر چھوڑ کر زمیں میں نے
کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلہ گردشِ زمیں میں نے

(سرگذشت آدم)

غرض یہ کہ اقبال نے مختلف فنی تدابیر کے ذریعے اپنے کلام کو حتیٰ المقدور دل نشیں اور پر اثر بنایا۔ پھر اس شاعری سے اپنے خیالات کی اشاعت کا کام لیا۔ شاعر دیدۂ بینائے قوم ہوتا ہے اور جب قوم کو مصیبت میں مبتلا پاتا ہے تو بے چین

ہو کر درماں تلاش کرنے لگتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے زوال آمادہ انگلستان میں ورڈز ورتھ اور کولرج پیدا ہوئے جو اپنی شاعری پر فلسفے کو ترجیح دیتے تھے۔ اقبال کا عقیدہ تھا کہ ''قومیں شعرا کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں'' چنانچہ انھوں نے اپنی قوم کو زبوں حالی میں دیکھ کر پیغامبری کا منصب اختیار کیا اور اس پر اتنا زور دیا کہ ان کی فکر ہی سب کی توجہ کا مرکز بن گئی جس کے نتیجے میں ان کی شاعری کی طرف وہ توجہ نہیں کی گئی جس کی وہ مستحق تھی۔ وہ شاعر بھی ہیں اور ایک مخصوص فلسفے اور خاص نظامِ فکر کے علمبردار بھی لیکن ان میں شاعری کی صلاحیت خداداد تھی جسے انھوں نے اپنے خونِ جگر سے اور نکھارا، فلسفے کی تحصیل انھوں نے مطالعے اور غور وفکر سے کی تھی اور ان کا فلسفہ اس عہد کے حالات کی پیداوار تھا چنانچہ ان کے یہاں اصلی چیز ہے شاعری اور فلسفہ ثانوی۔

INDIAN ROUND-TABLE CONFERENCE.

Tel. No.
GERRARD 7070.

ST. JAMES'S PALACE,
S.W.1.

16th Nov. 1931

Your Highness,

It is with the greatest pain that
I am writing this letter to you.
I have watched from the activities
of our Muslim Delegation from
the very beginning. Their secret
activities, the intrigues & even
disloyalty of some of the members
have pained me very much.
Disgusted with such behaviour
I am extremely sorry to inform
you that from today I shall have
nothing to do with what must
be described as a shadow cabinet
of the Muslim Delegation

Yours sincerely
Mohd Iqbal

[illegible]

اقبال کے غزلیہ تجربات --- چند نکات

طارق ہاشمی

حالی، اکبر اور اُن کے معاصرین کے تجربات اور تخریب و تعمیر کے عمل کے بعد اردو غزل کو اسلوب اور لہجے کی جو سمتِ نو میسر آئی وہ اقبال کی غزل ہے۔ اقبال نے جس انداز اور پیرائے میں غزل کہی اُس کے لیے جہت نمائی کا اعزاز اگرچہ اُس کے پیش رووں ہی کو حاصل ہے تاہم اقبال چونکہ ہر اک مقام سے آگے کی جستجو رکھنے والے شاعر ہیں، اِس لیے انہوں نے خود بھی بعض بڑے اہم تجربے کیے اور اردو غزل کو ایک ایسا اسلوب دیا جو صرف منفرد نہیں ہے بلکہ بے مثال بھی ہے، جس میں تنوع ہے، ترفّع بھی اور تغزل بھی۔ پرانی غزل کے نظامِ اقدار پر غالب کے ہاں جو تشکیک نمودار ہوئی تھی وہ اقبال کے ہاں یقین میں بدل جاتی ہے اور اقبال غزل کے خاکستر سے ایک نیا جہانِ غزل تیار کرتے ہیں۔ [1]

اقبال نے مسلسل غزل کے تجربے میں توسیع کر کے اِس انداز سے شعر کہے کہ غزل اور نظم کے مابین حدِّ فاصل قائم کرنا ایک مشکل معاملہ ہو گیا ہے تاہم ایسا ہرگز نہیں ہے کہ انہوں نے غزل کے اشعار میں انفرادیت یا اکائیت کو مجروح کیا ہو۔ اُن کی غزل میں اشعار اُسی طرح اپنی منفرد حیثیت رکھتے ہیں جیسا کہ غزلیہ اشعار کی روایت رہی ہے۔ اُن کے ہاں جہاں مختلف اشعار میں ہم آہنگی ہے وہاں بھی ہر شعر کی انفرادیت قائم رہتی ہے۔ [2] اشعار کی انفرادیت کی یہ خوبی اقبال کی صرف غزل ہی میں نہیں بعض اوقات یہ وصف اُن کی منظومات کے اشعار میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اُن کی متعدد نظمیں ایسی ہیں، جن سے اشعار الگ کر کے پڑھے جائیں تو وہ اُسی طرح ایک مکمل اکائی رکھتے ہیں جیسا کہ غزل کے اشعار کا امتیاز ہے۔ اقبال کے ایسے بہت سے اشعار مقبول خاص و عام ہیں جو فی الاصل اُن کی منظومات سے ماخوذ ہیں۔

اقبال نے نظم اور غزل کی حدِ تفریق کو کم کرنے کے لیے بعض تجربے بھی کیے ہیں۔ مثلاً زبورِ عجم (حصہ دوم) کی ایک غزل جس کا مطلع ہے:

فروغِ مشتِ خاک از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیرِ او گردوں شود روزے

جاوید نامہ میں ''نغمہ ملائک'' کے عنوان سے ہے۔ اِسی طرح ایک اور فارسی غزل جاوید نامہ میں ''توبہ آوردن زنِ رقاصہ عشوہ فروش'' کے عنوان کے تحت گوتم کی تقریر کے ایک جز کے طور پر پیش کی گئی۔

اقبال اردو غزل میں تو ایسا کوئی تجربہ منصہ شہود پر نہیں لائے تاہم چند نکات اِس حوالہ سے قابلِ توجہ ہیں:

۱۔ بالِ جبریل کی بعض ایسی غزلیں ہیں جو قلمی نسخوں میں عنوانات کے تحت ملتی ہیں۔ لیکن اقبال نے بوقتِ اشاعت اُن کے عنوان حذف کر دیے۔

۲۔ اقبال کی بعض منظومات ایسی ہیں جو مکمل طور پر غزل کی ہیئت میں ہیں۔ آخری شعر میں انہوں نے غزل میں مقطع کی روایت کے مطابق اپنا تخلّص بھی استعمال کیا ہے مثلاً پیامِ عشق، جاوید کے نام، ترانۂ ہندی، ترانۂ ملی وغیرہ۔ یہاں مارچ ۱۹۰۷ء والی غزل بھی قابلِ ذکر ہے جسے اقبال نے عنوان دے دیا ہے۔ اِن کے علاوہ بھی متعدد نظمیں ایسی ہیں جو غزل کی ہیئت میں ہیں البتہ مقطع نہیں ہے۔ مثلاً زہد اور رندی، دل، پیامِ صبح، دعا، لینن، سلطان ٹیپو کی وصیت، فرشتوں کا گیت، فرمانِ خدا، نپولین کے مزار پر، مسولینی وغیرہ

۳۔ اقبال کی بیشتر نمائندہ منظومات کے بند غزل کی ہیئت میں ہیں۔ اگر چہ وہ ہر بند کے آخر میں ایک الگ شعر کہہ کر اُسے ترکیب بند بنا دیتے ہیں۔ مثلاً تصویرِ درد، طلوعِ اسلام، مسجد قرطبہ، ذوق وشوق، جبریل و ابلیس، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ وغیرہ اِسی طرح محراب گل افغان کے افکار کے بیشتر حصے بھی غزل کی ہیئت میں ہیں۔

۴۔ اقبال کی منظومات میں اشعار کا تغزل بھی لائقِ توجہ ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے تنقیدی اصطلاحات کی توضیح کرتے ہوئے تغزل کی تعریف میں اقبال کی نظم ''شمع اور شاعر'' کے اشعار کے بطورِ خاص حوالہ دیا ہے۔ [۳] اقبال کے تغزل کی تعریف اُن کے بعض نظریاتی مخالفین نے بھی کی ہے اور یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ فطرتاً غزل گو تھے اور اتنے بڑے نظم نگار ہونے کے باوجود غزل گو ہی رہے۔ [۴]

۵۔ اقبال نے اپنی شاعری کے لیے جہاں موسیقی کی اصطلاحات نوا، نغمہ اور نے وغیرہ استعمال کی ہیں وہاں غزل کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً اپنی معروف نظم ''ذوق وشوق'' میں کہتے ہیں:

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

اقبال نے غزل میں کلاسیکی روایت سے گریز نہیں کیا ہے لیکن زبان کے آہنگ میں اتنے منفرد تجربات کیے ہیں کہ وہ روایت سے مختلف بلکہ کسی حدت اجنبی بھی محسوس ہوتی ہے۔ اِس اجنبیت کا احساس خود اقبال کو بھی ہے۔ ایک شعر میں انہوں نے بڑے انوکھے انداز میں اپنی غزل کی لسانی خاصیت کا اظہار کیا ہے، جس میں انکسار اور تعلّی کا امتزاج ہے:

نہ زباں کوئی غزل کی نہ غزل سے باخبر ہیں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

اِس شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے فتح محمد ملک نے لکھا ہے اگر وہ زبان سے باخبر نہ ہوتے تو غزل کے ہزاروں سال پرانے رموز وعلائم اور محاکات وتلازمات میں انقلاب برپا کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہوتے [۵] اس امر میں تو کوئی شک نہیں کہ اقبال غزل کی زبان سے آگاہ تھے لیکن وہ جس نوعیت کا انقلاب لائے اُس میں ایسا منفرد لسانی اور اسلوبیاتی تجربہ ہے جو قابلِ تحسین تو ہے مگر بعض سوالات بھی اٹھاتا ہے۔ چنانچہ جہاں بعض ناقدین نے اُن کی منظومات کو تغزل آشنا قرار دیا ہے وہاں بعض نے اُن کی غزل میں اِس عنصر کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے اُن کے زبان کو غزل کی زبان کے اوصاف سے خالی قرار دیا ہے۔ [۶] یہاں شمس الرحمٰن فاروقی کے ایک مضمون کا حوالہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس میں انھوں نے بالِ جبریل کے اُس کلام کی فہرست درج کی ہے جس کی بنیاد پر اقبال کی شہرت ایک بڑے غزل گو کی حیثیت سے ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ منفرد دلیل پیش کرتے ہوئے کہ بالِ جبریل کے مبینہ حصہ غزل میں کہیں بھی غزل کا عنوان نہیں دیا گیا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ یہ فرض کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ایک تا سولہ اور پھر ایک تا اکسٹھ نمبر شدہ کلام کے بارے میں اقبال کا خیال تھا کہ اُسے غزل کی طرح نہ پڑھا جائے۔'' اِس دعوے کے ساتھ انہوں نے نمبر پانچ (جس کے مقطع میں غزل کی روایتی ساخت سے انحراف کیا گیا ہے) کے آگے درج رباعی کو ملا کر یہ بات بھی وثوق سے کہی ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک نظم بناتے ہیں۔

فاروقی صاحب کی گفتگو کا لبِ لباب یہ ہے کہ بالِ جبریل کا حصہ غزل فی الاصل غزلوں پر مشتمل نہیں ہے بلکہ انھیں غزلیں فرض کر لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اقبال کے مخصوص فلسفۂ حیات کی تبلیغ کے باعث اُن کی غزل میں لوچ، دھیمی لے اور سرگوشی میں بات کرنے کے انداز کی کمی کی شکایت کی ہے [8]۔ اگرچہ انہوں نے جدید غزل گو شعراء پر اقبال کے اثرات کے حوالہ سے مفصل بحث کی ہے جو ایک لحاظ سے اُن کے اعتراض کا جواب بھی ہے نیز انہوں نے آگے چل کر یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ اقبال کے ہاں لوچ اور دھیما پن موجود ہے۔ شہزاد احمد نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ تغزل کوئی متعین چیز نہیں ہے (بلکہ اُردو غزل کی یہ صفت اپنے باطن میں ایک لچک رکھتی ہے) چنانچہ اقبال کی غزل میں جو پہلی تبدیلی نمایاں ہوئی وہ تغزل کے روایتی معنوں میں سے انکار تھا [9]۔ تاہم مذکورہ اعتراضات کو یک قلم رد بھی نہیں کیا جا سکتا، خصوصاً اس نوعیت کے اشعار کی روشنی میں:

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے
خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے
بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اِس زمانے میں کوئی حیدر کرّار بھی ہے

یہ بھی بجا ہے کہ اقبال بعض اوقات ''پیغمبرانہ'' لہجے میں مخاطب ہونے کی سعی کرتے ہیں لیکن اُن کی غزل کے سرمائے پر مجموعی انداز سے دیکھیں تو انہوں نے اپنے تجربات سے ایسے اشعار بھی نکالے نہیں جو اردو غزل کی روایت کی پاسداری بھی کرتے ہیں اور ایک روایتِ نو کے پیش رو بھی ہیں اور ایسی غزلیں، اقبال کی غزل کے مجموعی سرمائے میں مقدار اور معیار ہر دو اعتبار سے غالب حیثیت رکھتی ہیں۔ جن کی موجودگی میں مذکورہ اعتراضات اور تغزل کو مجروح کرنے والی چند غزلیں بے اہمیت ہو جاتی ہیں۔

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی
پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لیے شایاں خس وخاشاک نہیں ہے

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اقبال کی غزل میں تجربات کے حوالہ سے اُس کا علامتی نظام بھی قابل توجہ ہے۔ بعض علامتیں نئی ہیں جبکہ بعض مروجہ علامات کو نیا مفہوم دیا گیا ہے۔ اقبال کے ہاں ''لالہ'' کی علامت متنوع جہات رکھتی ہے۔ اِسی طرح بادِ سحر یا بادِ نسیم کی علامت ایک پورے معنوی نظام کے ساتھ آئی ہے۔ بعض داستانوی کردار جو اردو غزل کی روایت میں ایک خاص عشقیہ مفہوم کے حامل تھے۔ اقبال نے انہیں بطورِ علامت نیا اور وسیع مفہوم دیا ہے۔ مثلاً فرہاد اور مجنوں کے کردار نے انہیں جہدِ مسلسل کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ اِسی طرح لیلیٰ کا کردار منزل کا مفہوم رکھتا ہے۔ اقبال نے مذکورہ داستانوی کرداروں کے ساتھ ساتھ ان کرداروں سے منسوب داستانوں کے دیگر عناصر مثلاً محمل، ناقہ جرس، صحرا اور دشت کو بھی اپنے علامتی نظام کا حصہ بنایا ہے۔

اقبال کے علامتی نظام میں اسلامی تاریخ کے بعض کردار بھی قابل توجہ ہیں مثلاً خلیلؑ،، اسماعیلؑ، کلیمؑ، عیسیٰؑ، رسولِ کریمؐ، علی شبیرؓ، فاروقؓ، بوبکرؓ، ابوذرؓ، بلالؓ، اویسؓ، سلمانؓ اور زہراؓ ایسے کردار ہیں جو اقبال کی غزل میں مختلف مقامات پر مختلف معنوی مفہوم کے حامل ہیں۔ اِسی طرح فن و دانش اور تصوف سے وابستہ کردار رومی، رازی، جنید، بسطامی، عطار، غزالی، سنائی، اور خسرو کے کردار بھی لائق ہیں۔ اقبال نے بعض بلادِ اسلامیہ کے نام بھی اردو غزل میں بطور علامت استعمال کیے ہیں مثلاً مصر و حجاز، رومتہ الکبریٰ، کوفہ و شام، ترکی اور دلّی ایسے شہر ہیں جو شکوہِ ماضی یا شانِ استقبال ہر دو مفہوم میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اقبال کی غزل میں درویش اور قلندر کی علامت بھی متعدد مفاہیم رکھتی ہے۔

اردو غزل میں اقبال کے مذکورہ تجربات نہ تو محض وقت کا تقاضا تھے نہ ہی اقبال نے محض اپنی اسلام پسندی کے باعث ایسا کیا۔ یہ ایک پہلو ضرور ہو سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی شاعرانہ ذمہ داری سے پوری طرح آگاہ تھے اور انہوں نے اس فرض کی آگاہی سے سبکدوشی تک کا سفر متنوع تجربات کرتے ہوئے طے کیا۔ بڑی محنت، تلاش، تجربہ اور تراش

خراش کے بعد اپنی غزل کے لیے ساز اور سانچے بنائے ۔۔۔۔اور غزل کی بزمیہ کو رزمیہ کے درجے تک پہنچایا۔ انہوں نے غزل کو محفلِ سماع اور بزمِ ماتم سے نکال کر مجاہدوں کی صف اور دانشوروں کے حلقے میں پہنچایا ۱۰ لیکن اپنی نے نوازی میں میں لے کا توازن، تاثیر اور دلکشی نہ صرف برقرار رکھی بلکہ اپنے غنائی تجربات کو سمجھنے کے لیے سماعتوں کو دعوت بھی دی ہے:

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی

نفس ہندی مقامِ نغمہ تازی

استفادہ:

۱۔ فتح محمد ملک ،غزل اور نئی غزل، مطبوعہ ادبِ لطیف، سالنامہ ۱۹۶۴ء صفحہ ۵۹

۲۔ افتخار احمد صدیقی، فروغِ اقبال اقبال اکیڈمی لاہور ۱۹۹۶ء صفحہ ۱۰۵

۳۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی ،کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد صفحہ ۸۶

۴۔ مجنوں گورکھپوری، اقبال، مشمولہ اقبال بحیثیت شاعر (مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی) صفحہ ۵۷

۵۔ فتح محمد ملک، اقبال کی غزل، مطبوعہ فنون (جدید غزل نمبر) ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۸۹

۶۔ عبدالسلام ندوی، اقبالِ کامل، اقبال اکیڈمی لاہور، صفحہ ۷۸

۷۔ شمس الرحمن فاروقی، اُردو غزل کی روایت اور اقبال، مطبوعہ زاویہ نیویارک، جنوری تا مارچ ۲۰۰۳ء صفحہ ۱۳

۸۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اُردو شاعری کا مزاج، مکتبہ عالیہ لاہور (نویں اشاعت) ۱۹۹۳ء صفحہ ۲۸۲

۹۔ شہزاد احمد، اُردو غزل کے جدید تر رجحانات، مطبوعہ فنون، جون۔ جولائی ۱۹۷۱ء صفحہ ۹۰

۱۰۔ رشید احمد صدیقی، اقبال شخصیت اور شاعری، اقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۲۰

بالِ جبریل

سکندر علی وجد

اقبال کا کلام مردہ قوموں کے جمود وسکون کو توڑنے کے لئے اکیسر کا حکم رکھتا ہے۔اس کے شعروں کے پڑھنے سے رگوں میں بجائے خون کے زندگی بجلیوں کی طرح کوندنے لگتی ہے۔اسی باعث اقبال کا موجودہ دنیا کے بہترین شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔

''بال جبریل'' درحقیقت اس کے نظریوں کی تکمیل اس کے معتقدات وخیالات کی معراج اوراس کے مسلک کا نہایت صحیح عکس ہے۔

''بانگ درا'' کے مطالعہ سے اقبال کی غیر معمولی قوت متخیلہ بے نظیر روانی طبع اور جوش، لاجواب اُپج اور لاثانی استعداد شاعری کا حال معلوم ہوتا ہے۔لیکن اس میں وہ سوز وگداز نہیں پایا جاتا جو''بال جبریل'' کا طرہ امتیاز ہے۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ اقبال نے ابھی اپنا کوئی خاص نصب العین قرار نہیں دیا تھا۔وہ ہنوز اپنی اور کائنات کی اہمیت واصلیت سے پوری طرح واقف نہ تھا۔اسی لیئے صبح کا سماں،شام کی کیفیت، گور غریباں کا منظر، آب جو کا نظارہ اوراسی قبیل کی دوسری کیفتیں اس کے حساس دل کو بہت زیادہ متاثر کرتی تھیں ۔ چونکہ اس نے ابھی اپنی منزل مقصود مقرر نہیں کی تھی اس لئے وہ ہر نقش قدم پر سجدے کرتا اور ہر نغمے پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا اس دور میں وہ رہنما اور رہزن میں کم فرق کرسکتا تھا۔اس کی نظروں میں ابھی تک ''خودی'' کے جلوے نہیں سمائے تھے اس لئے وہ اس کی بے پناہ قوت سے باخبر نہ تھا۔بانگ درا بیشک اقبال کی شاعری کے شباب کا مرقع ہے۔لیکن اس میں رنگینی ، جوش اور زور کے ساتھ کہیں کہیں جوانی کی بے راہ روی اور ناتجربہ کاری بھی جھلکتی ہے۔بانگ درا میں اقبال ایک ڈھونڈنے والے کی طرح بے چین ہے اور بال جبریل میں وہ ایک پانے والے کے مانند مطمئن۔بانگ درا زیادہ تر رنگ ہے اور''بال جبریل تمام تر رس۔

اب اقبال خود آگاہ بھی ہے اور خدا آگاہ بھی۔ وہ مسلسل جدوجہد کے بعد، ٹھوکریں کھا کھا کر منزل مقصود پر پہنچ چکا ہے اور دوسروں کو بھی اس طرح چیخ چیخ کر بلا رہا

ہے۔راستے کے خطروں سے سب کو خبردار کررہا ہے اور ان کی سچی رہنمائی کرنے کے لئے بیتاب ہے۔اس کے نزدیک منزل مقصود تک صحیح سلامت پہنچنے کے لئے ''احساس خودی اور سخت کوشی۔ازبس ضروری ہیں اور اقبال کے پیام کے یہی دواہم اجزاء ہیں۔

آج اقبال ایک شاعر اور مصلح کی صورت میں نہیں بلکہ ایک پیغمبر کی حیثیت سے اپنے صحیفہ ''بال جبریل'' کے ذریعہ اہل عالم کو پیام زندگی سنا رہا ہے۔اب اس کی ہر بات تجربے پر مبنی ہے۔سوسائٹی کے امراض کے استیصال کے لئے وہ اپنے آزمودہ نسخے تجویز کرتا ہے۔چونکہ اب اس کا انداز بیان نہایت ہی یقین انگیز اور مدلل ہے۔اس لئے اپنی نظریوں کی بالکل آزادانہ تبلیغ کررہا ہے۔ایک سچے آدمی کی طرح اب اس کا طرز کلام صاف، پرجوش اور بے باکانہ ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''بال جبریل'' میں بانگ درا کا سا جوش اور رنگینی اور تنوع نہیں ہے۔یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے۔لیکن بیان کی سلامت، پیام کی ہم آہنگی، اخلاقی اور حکیمانہ مضامین اور طرز ادا کی بیباکی کے لحاظ سے بال جبریل کو بانگ درا پر فوقیت حاصل ہے۔

بال جبریل کے بیشتر اشعار من عرف نفسہ فقد عرف ربہ اور لیس للانسان الاماسعی انھیں دو نظریوں کی تشریح اور تفسیر ہیں برخلاف اس کے، بانگ درا میں شاعر نے کوئی مستقل پیام اس زور وشور کیساتھ نہیں پیش کیا۔ یہ سچ ہے کہ بانگ درا کے چند نغمے انسان کو آپے سے باہر کردیتے ہیں لیکن بال جبریل کی بعض جنبشیں چشم زدن میں انسان کو کہیں سے کہیں پہنچادیتی ہیں بانگ درا کے اکثر شعروں کے پڑھنے سے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اور منہ سے بے اختیار واہ! یا آہ نکل جاتی ہے لیکن بال جبریل کے اشعار سے قلب پر ایسی کاری ضرب پڑتی ہے کہ انسان میں پھر آہ بھرنے یا واہ کرنے کی سکت ہی باقی نہیں رہتی۔بانگ درا میں ایک پہاڑی ندی کا ساز ورشور پایا جاتا ہے۔اور بال جبریل میں ایک میدانی دریا کی وسعت، گہرائی اور سنجیدگی نظر آتی ہے۔

تعمیر خودی

اقبال نے تعمیر خودی اور احساس خودداری کی بڑی پرجوش تبلیغ کی ہے۔اس کا عقیدہ ہے کہ دنیا کسی انسان کی اہمیت کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتی جب تک وہ اپنی اہمیت خود منوا نہیں لیتا۔اس کے نزدیک وہی لوگ دنیا میں باعزت اور باوقار ہیں جو اپنی حقیقی عزت جانتے اور اپنے جوہر کو پہچانتے ہیں

زمانے میں کھوٹا ہے اس کا نگیں ۔۔۔ جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں

اس خودی کے معنی ''میں پن'' نہیں بلکہ اس کا مفہوم خود شناسی ''خودداری'' ہے۔ یہ خودی دراصل نیازمندی کی ایک شکل ہے۔

خودی کی شوخی وتندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذت نیاز نہیں

اقبال ترک دنیا، ترک خودی اور تن بہ تقدیر رہنے کا مطلق قائل نہیں، وہ ان خیالات کی شدید مخالفت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب یہ عقائد کسی قوم کی فطرت میں جگہ پکڑ لیتے ہیں تو وہ قوم بہت جلد فنا ہو جاتی ہے۔ برخلاف اس کے جن قوموں میں ''احساس خودی'' ہوتا ہے وہ دنیا پر حکمرانی کرتی ہیں کیونکہ ان کو اس احساس کی بدولت ہر طرف کامیابی ہی کامیابی نظر آتی ہے اقبال ساری دنیا کو خودی کی زد میں خیال کرتا ہے۔ پیغمبری، ولایت اور قلندری کو وہ خودی کے مختلف مظاہر کہتا ہے۔

خودی کی جلوتوں میں کبریائی　　خودی کی خلوتوں میں مصطفائی
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی　　زمین و آسمان و کرسی و عرش

ایک معمولی انسان احساس خودی کی بدولت ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج حاصل کر سکتا ہے اور اس احساس کے فقدان کے باعث ایک عالی مرتبہ شخص تنزل کی ادنیٰ ترین منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

پربت ضعف خودی سے رائی　　رائی زور خودی سے پربت

خودی ایک بحر ناپیدا کنار ہے۔ جس میں غرق ہو جانا ہی انسان کے حق میں عین کامیابی ہے۔ جس شخص نے اپنی خودی کے علاوہ کس دوسری شے سے محبت کی یا اس کے حاصل کرنے میں سرگرم رہا حقیقت میں اس نے اپنی زندگی ضائع اور اپنی اوقات خراب کی۔ اپنی خودی سے محبت کرنا ہی زندگی کا حقیقی مقصد ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے سب ہیچ ہے۔

تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں　　خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں

مگر ساتھ ہی ساتھ اقبال یہ بھی جتا دیتا ہے کہ اس سمندر میں تیرنا کھیل نہیں یہاں عالی ظرفی اور حوصلہ مندی درکار ہے۔

مگر یہ حوصلہ مرد ہیچ کارہ نہیں　　خودی میں ڈوبتے ہیں، پھر ابھر بھی جاتے ہیں

انسان کی عزت اور زندگی کا تمام تر دارومدار ''حفظ خودی'' ہی پر موقوف ہے۔

جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی　　تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے

موتی کے گراں بہا ہونے کا راز اس کا ''حفظ خودی'' ہے ورنہ حقیقت میں وہ ایک سنگریزے سے زیادہ قیمت نہیں رکھتا۔

گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ　　　　گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

جس انسان میں ابھرنے اور ترقی کرنے کی خواہش نہیں اس کی حیات، موت کے مترادف ہے۔ اس لئے کہ زندگی نام ہے۔ ایک کشمکش مسلسل اور سعی پیہم کا۔ کائنات کا ہر ذرہ حرکت ہی کے سبب سے زندہ ہے یہی اضطرار اس کی زندگی کی دلیل اور اس کی حیات کا عین مقصد ہے۔

بے ذوق نمود زندگی موت　　　　تعمیر خودی میں ہے خدائی

خودی کے مسلک کو اختیار کرنے کے بعد سالک کو راستے کے سیمیائی جلووں کو دیکھ کر ٹھٹک نہ جانا چاہئے بلکہ اس کی نظر میں وسعت اور خیالات میں رفعت ہونی چاہیئے۔ خودی کا اعلیٰ تریں زینہ وہ ہے۔ جہاں پہنچنے کے بعد ''بے طلب عطا'' کی نوبت آتی ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے۔

خودی کے ہتھیار کی دھاک سے انسان ساری دنیا کو اپنے قبضے میں لاسکتا ہے۔ خودی اسرار الٰہی کے مخفی خزانوں کی کنجی ہے۔

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا!

مقام رنگ و بو کا راز پا جا!

''لیکن سارے عالم کو مطیع کر کے اور یہاں کے تمام رازوں سے واقف ہونیکے بعد اگر انسان یہیں کے جھمیلوں میں پھنس جائے اور اسی کو اپنا مقصد زندگی سمجھنے لگے تو یہ سخت غلطی ہے۔ بلکہ دسترس حاصل ہونے پر بھی اسے گزشتی وگزاشتنی ہی سمجھے ورنہ مقصد حیات فوت ہو جائے گا۔

برنگ بحر ساحل آشنارہ!　　　　کف ساحل سے دامن کھینچتا جا!

ساز خودی کا نغمہ حیات ابدی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جو قومیں احساس خودی کی آگ میں جل رہی ہیں انہیں کا نام روشن ہے۔

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ

خودی کے سوز سے روشن ہیں اُمتوں کا چراغ

خوددار آدمی بے عزتی کی حیات جاوداں پر عزت کی مرگ ناگہاں کو ترجیح دیتا ہے۔

خودی کے نگہبان کو ہے زہر ناب

وہ نان جس سے جاتی رہے اسکی آب

وہ سخت سے سخت محنت و مشقت تو کرسکتا ہے۔ لیکن اپنا سر کسی کے آگے جھکا نہیں سکتا۔

وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

سخت کوشی اقبال اس راز سے خوب واقف ہے کہ سخت کوشی اور جفاکشی کے بغیر کوئی قوم دنیا میں پنپ نہیں سکتی کاہلی مہاروگ ہے۔ یہ مہلک مرض سوسائٹی کے تمام قوائے عملیہ کو معطل کر دیتا ہے۔ اچانک مصیبتوں اور ناگہانی آفتوں سے جو لوگ پست ہمت ہو جاتے ہیں وہ ہمشہ بے عزتی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اقبال اس امر پر بہت زور دیتا ہے کہ سختیاں اور تلخیاں زندگی میں حقیقی لطف پیدا کرتی ہیں چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے۔

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست — گفتا مئے کہ تلخ تر او نکو تر است

اسی تصور کو بال جبریل میں اس نے نہایت شدومد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انہی لوگوں کے سامنے دنیا کی ساری سرکش قوتیں سر جھکا دیتی ہیں جن کے ارادے لوہے کی طرح مضبوط اور پہاڑ کے سے اٹل ہوتے ہیں۔ یہ اہل ہمت طوفان حوادث کی ہیبت ناک موجوں سے کھیلتے ہیں۔ ان کی زندگی اس خطرناک کھیل میں بسر ہو جاتی ہے زمانے سے ڈرنا بزدلوں کا کام ہے۔ بہادر اس سے لڑ کر اپنا غلام بنالیتے ہیں۔

حدیث بے خبراں ہے تو بازمانہ بساز — زمانہ باتو نسازد، تو بازمانہ ستیز!

مخلصانہ جستجو اور مردانہ وار اقدام کی بدولت انسان بغیر کسی امداد کے اپنے مقصد میں نہایت آسانی کے ساتھ کامیاب ہوسکتا ہے۔

چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسس — جی سکتے ہیں بے روشنی، دانش افرنگ

حقیقی انسان بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی ہمت نہیں ہارتا۔ اس کا مضبوط ارادہ کبھی اسے اپنے مطمع نظر کے خلاف کوئی کام کرنے نہیں دیتا وہ صعوبتوں سے نصیحت حاصل کرتا ہے اور مصیبتیں جھیلنے اور تکلیفیں سہنے کے لئے سدا تیار رہتا ہے۔ کاہلی کفران نعمت ہے۔ خدا نے ہم کو طاقت، ہمت اور عقل جیسی بے بہا نعمتیں عطا کی ہیں اگر ہم ان کا استعمال نہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم عطیہ الٰہی فضول سمجھتے ہیں۔ جفاکش انسان بیچ سمندر کی موج کے مانند پیچ و تاب کھا کھا کر اپنی زندگی کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ ساحل سے قطعی ناآشنا رہتا ہے۔ کیونکہ یہ مقام آسائش ہے اور آرام عمل کی موت ہے۔

ظلام بحر میں کھو کر سنبھل جا تڑپ جا پیچ کھا کھا کر نکل جا!

نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج ابھر کر جس طرف چاہے نکل جا!

انسان جس کام کے کرنے کا مستقل ارادہ کرلے وہ ضرور حسب وخواہ انجام پاتا ہے لیکن مسلسل محنت شرط ہے۔ جفاکشی انسان کو کامیابی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس سے انسان کی پوشیدہ قوتیں ظہور میں آتی ہیں۔ اور وہ بڑے بڑے کام کر جاتا ہے۔

کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشاد شرق و غرب

تیغ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر

موجودہ تعلیم:

روح کی پیاس بجھانے کا سامان مشرق و مغرب دونوں کے پاس نہیں ہے۔ موجودہ طریقہ تعلیم نہایت ناقص ہے۔ اقبال اس علم تہی پر جہل کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ جس طلب کی بنیاد عشق پر ہوگی وہ پوری ہوگی اور جس کی بنیاد ہوس پر ہوگی اس کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ موجودہ علم کی بنیاد ہوس پر ہے۔ کسی طالب علم کو علم سے عشق نہیں ہے اور یہی سبب ہے اس کی خامی کا۔ بغیر عشق کے علم بے سود ہے۔

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

موجودہ تعلیم سے طالب علموں میں ہمت جفاکشی، اولوالعزمی اور خودداری کی صفتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ ایسی کھوکھلی عقل کے مقابلہ میں اقبال جنون ہی کو ترجیح دیتا ہے۔

عطا اسلاف کا جذب دروں کر شریک زمرہ لا یحزنون کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں مرے مولیٰ مجھے صاحب جنوں کر

یہ جنوں، دیوانگی یا خبط نہیں ہے بلکہ یہ دوسرا نام ہے سچی دھن اور اصلی لگن کا، جس کے بغیر انسان کسی ہنر میں کامل نہیں ہوسکتا جو لوگ اپنے مقصد کے پیچھے دیوانے ہو جاتے ہیں وہی کچھ کر بھی جاتے ہیں۔ ہماری یونیورسٹیوں کے طلبا اسی دھن اور لگن کی کمی کے باعث ادھورے رہ جاتے ہیں۔

یہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں
نہ ادائے کافرانہ، نہ تراش آذرانہ

حقیقی علم استاد کی نظر سے حاصل ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے طلبہ کی خامی کا باعث زیادہ تر ان کے خام اساتذہ ہیں۔ جن کی قابلیتیں تو مسلم ہوتی ہیں لیکن خلوص جو استادی کا جزوِ اعظم ہے ان میں بہت کم ہی پایا جاتا ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

انہیں نقلی استادوں کے ہاتھوں ہماری نئی پود بے عمل اور ناکارہ بن رہی ہے۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

موجودہ طریقہ تعلیم سے طلبا میں اخلاقی جرات اور بیبا کی مطلق پیدا نہیں ہوتی ان کے ارادے کمزور اور خیالات پست ہو جاتے ہیں۔ خدا کے سوا وہ ہر چیز کے آگے اپنا سر نیاز خم کرتے اور آزادی جیسی لاقیمت شئے کو در بدر کوڑی کے مول بیچتے پھرتے ہیں۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

تہذیب حاضر:

اقبال مغربی تہذیب وتمدن سے بھی اتنا ہی واقف ہے جتنا کہ مشرقی تہذیب وتمدن سے۔ اس نے اپنے قیام یورپ کے زمانے میں وہاں کے حالات کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ مغرب ومشرق دونوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ مغرب کی کمزوریوں سے بھی باخبر ہے اور مشرق کی خامیوں سے بھی آگاہی رکھتا ہے۔ ایک جگہ اس نے مشرق و مغرب کے فرق کو یوں بیان کیا ہے۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق ومغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

اسی باعث اقبال موجودہ مشرق ومغرب دونوں سے خفا ہے۔ وہ حرم وکلیسا دونوں میں یکساں مکاری کا بازار گرم پاتا ہے۔ اس لئے اپنے ''جنون'' ہی کی خیر منانے میں مست ہے۔

رہ و رسم حرم نا محرمانہ
کلیسا کی ادا سودا گرانہ

غنیمت ہے میرا پیراہن چاک
نہیں اہل جنوں کا یہ زمانہ

اہل یورپ نے اپنی تمام قوتوں کو عقل کا ماتحت بنایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سرتا پا عمل بن گئے۔ اہل مشرق نے اپنے ہر کام میں دل کو رہنما بنایا توکل اور قناعت اختیار کی اس کا اثر یہ ہوا کہ انکی عملی قوتیں کمزور پڑ گئیں۔ اب حالت یہ ہے کہ

یورپ کا آدمی ایک مشین ہے اور مشرق کا آدمی ایک مردہ۔ حقیقی انسانی روح دونوں میں باقی نہیں رہی۔ اس لیے اقبال کی یہ کوشش ہے کہ مشرق والے عملی آدمی بنیں اور مغرب والے روحانی۔ اس امتزاج ہی میں زندگی کا حقیقی لطف پوشیدہ ہے۔ مغرب کی عقل اور مشرق کا دل دونوں ملکر حیات انسانی کو نہایت ہی پر امن بنا سکتے ہیں۔ اقبال بار بار کہتا ہے کہ ''نہ اہلہ ءِ مسجد'' بنو اور نہ ''تہذیب کی فرزندی'' قبول کرو۔ افراط تفریط سے ہر صورت میں برے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

یورپ کی بھڑک دار چمکدار تہذیب معاشرت میں بظاہر بہت زیادہ کشش اور جاذبیت نظر آتی ہے۔ اس لئے وہاں پہلے انسان سوسائٹی ہی کے اثرات کے نشہ میں سرشار ہو جاتا ہے لیکن جب اسکی برائیاں اور کمزوریاں رفتہ رفتہ اس پر ظاہر ہوتی ہیں۔ تو وہ اس ماحول سے بیزار ہو جاتا ہے یورپ کی سوسائٹی اپنے اندر انواع واقسام کے نشہ رکھتی ہے جن کا اثر وہاں کی شراب کے نشہ سے بھی دیر پا ہوتا ہے۔

لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر　　　میخانہ یورپ کے دستور نرالے ہیں

اہل یورپ نے اپنی عقل کو اپنے اوپر پوری پوری طرح مسلط کر لیا ہے حتیٰ کہ ان کے دل بھی ان کی عقل کے غلام بن گئے ہیں اس سے ان کی زندگی میں وہ لچک اور لوچ باقی نہیں رہا جس سے زندگی عبارت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دماغ روشن اور دل تیرہ ہو کے رہ گئے اگر مغرب کا چندے یہی حال رہا تو ان کی تہذیب کا عنقریب پارہ پارہ ہو جانا یقینی ہے۔

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے　　　طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

اہل مغرب نے بجلی کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے سمندر کے سینے پر جہاز چلا رہے ہیں اور ہوا پر طیارے اڑا رہے ہیں لیکن یہ ترقیاں ان کو تباہی سے بچا نہیں سکتیں بلکہ یہی ایجادیں ایک دن ان کی بربادی کا باعث ہوں گی۔

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو　　　اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

مشرق اپنی قدیم روایتوں کو نہایت تیزی کے ساتھ ترک کر رہا ہے۔ اندھی تقلید جس سے انسان کے ذاتی کمال کی سوتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خشک ہو جاتی ہیں اس کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب خانقاہوں اور مدرسوں سے ''اہل دل'' اور اہل نظر'' نہیں نکلتے مدرسے کھلونا سازی کے بڑے بڑے کارخانہ ہیں جہاں سے ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں چمکدار رنگ لیکن ناپائدار نقلی انسان بن کر نکلتے ہیں جو زندگی کے سیلاب میں تھوڑی دیر ہاتھ پاؤں مار کر ہمیشہ کے لئے ڈوب جاتے ہیں اب رہی خانقاہیں تو ان کا یہ حال ہے۔

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے　　　خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

فطرت کی ستم ظریفی اور قوم کی بدقسمتی دیکھئے کہ انہیں کے ہاتھوں میں اس کی باگ ہے۔ رہزنوں سے رہنمائی کی توقع رکھنا حماقت ہے۔ انہیں کی شان میں اقبال کہتا ہے۔

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد   زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

رازِ زندگی:

اقبال کا عقیدہ ہے کہ حرکت زندگی ہے اور سکون موت آج دنیا میں جو قومیں ترقی یافتہ کہلاتی ہیں وہ تگ و دو ہی کے باعث اس رتبہ کو پہنچی ہیں۔ بغیر سعئ پیہم کسی کو کمال نصیب نہیں ہوسکتا۔

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا   سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

اسی خیال کو اقبال نے یوں ادا کیا ہے۔

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہ نو   کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو

انسان اگر خوب سے خوب تر بننے کی فکر نہ کرے تو لازمی طور پر ایک وقت ایسا آئیگا کہ وہ خوب بھی باقی نہیں رہیگا اس لئے خواہ کتنا ہی کمال حاصل ہو جائے اس کو کم سمجھنا اور انتہائی مدارج تک رسائی حاصل کرنا ہی زندگی ہے۔ قناعت اور توکل (کے غلط تصور) سے حیات انسانی کو ایک قسم کا گھن لگ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ انسان کے جذبات بالکل مردہ ہو جاتے ہیں۔

ناصبوری ہے زندگی دل کی   آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

کشمکش اور سخت کوشی ہی پر زندہ قوموں کی حیات کا دارومدار ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی   روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

ایک مقام پر پہنچنے کے بعد دوسری منزل کی طرف قدم اٹھانے چاہئیں اور وہاں پہنچ کر تیسری جگہ جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسی الاانتہا ذوق سفر میں رازِ زندگی پوشیدہ ہے۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا   حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

دھن اگر پکی اور طلب صادق ہے تو مشکل سے مشکل کام میں مزہ آنے لگتا ہے۔

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام   سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

لوگوں کا خیال کہ زندگی اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا بالکل غلط ہے۔ جن کے بازوؤں میں قوت اور دلوں میں جوش ہمت ہے ان کے نزدیک یہ ایک معمولی کھیل ہے۔

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی　　　　فقط ذوق پرواز ہے زندگی

جسکے بازو کمزور ہیں اور جن کے دلوں میں ذوق پرواز نہیں ہے ان کے لئے زندگی ہمیشہ ایک چیستان اور ایک راز بنی رہے گی۔ اقبال کے نزدیک کمزوری نا قابل معافی جرم ہے۔ وہ اس کے لئے مرگ مفاجات کی سزا تجویز کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں کمزوروں کو جینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ قوی ہمیشہ سے کمزور کو فنا کرتا آیا ہے اس میں نہ قوی کا کوئی قصور ہے۔ نہ فطرت کا کوئی ظلم۔ جو بقا کے خواہاں ہیں انہیں قوی بننے کی کوشش کرنی چاہیے ورنہ ان کو اپنے سے زیادہ قوت والوں کے منہ کا نوالہ بننا پڑیگا۔

اقبال سیرت کی بلندی اور مضبوطی پر بہت زور دیتا ہے۔ اعلیٰ سیرت والوں کے آگے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتیں ہاتھ ٹیک دیتی ہیں۔۔ کردار کی بلندی سے انسان صرف زندگی کے بھیدوں ہی سے واقف نہیں ہوتا بلکہ اس پر تقدیر کے راز بھی منکشف ہونے لگتے ہیں۔ جو مردان حق اعلیٰ سیرتوں کے حامل ہوتے ہیں، فطرت کی تمام قوتیں انہیں کا ساتھ دیتی ہیں۔

صف جنگاہ میں مردان خدا کی تکبیر　　　　جوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

عشق حقیقی:

اقبال عشق کو دنیا کی سب سے بڑی قوت اور حیات انسانی کی سب سے اہم ضرورت خیال کرتا ہے۔ بغیر عشق کے انسان کی زندگی کا حقیقی لطف آ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے وہ اپنے بیٹے کو یہ پیام دیتا ہے۔

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر　　　　نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

جو لوگ اپنے اعمال کی بنیاد عشق پر رکھتے ہیں وہ کامیاب ہوتے ہیں اس لئے عشق ایسا رہنما ہے۔ جو رہرو کو ٹھیک نشان دادہ منزل پر پہنچا دیتا ہے۔ لیکن عقل رہرو کے بیان پر جرح کرتی اور اسے چوں و چرا کے جھمیلوں میں پھنسا دیتی ہے۔ اس لئے اقبال کہتا ہے۔

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں　　　　عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

عشق لافانی ہے اور اس کی قوتیں لامحدود۔ یہی ایک قطرہ بے مایہ کو بحر بیکراں سے ہم آغوش کر دیتا ہے۔ اس کی بدولت ذرہ بے مقدار آفتاب عالم تاب سے جا ملتا ہے۔ اسی کے سبب ایک معمولی انسان انا الحق کے نعرے لگاتا ہے اور رتبہ بلند کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ موت کا بے پناہ وار بھی اس نازک رشتہ کو منقطع نہیں کرسکتا۔ زمانہ کی تیز و تند ہوا کے طوفان میں

بھی شمع محبت برابر منور رہتی ہے۔ حقیقی محبت اپنے اندر ہزاروں لذتیں اور لاکھوں کیفیتیں پوشیدہ رکھتی ہے۔ جو محبت انقلابات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ وہ دراصل بوالہوسی ہے جس میں نہ پائداری ہے اور نہ لطف۔ وہ عشق ہی نہیں جو اسی زندگی کے ساتھ ختم ہو جائے۔

وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک　　اس میں مزہ نہیں تپش و انتظار کا

عاشق صادق کے نزدیک حشر ونشر کوئی چیز نہیں۔ فراق دوست کے ہر لمحے میں اس پر سینکڑوں قیامتیں گزر جاتی ہیں اس کے اپنے محبوب کی ایک گردش چشم میں بیسیوں حشر دکھائی دیتے ہیں۔

کسے خبر ہے کہ ہنگامہ نشور ہے کیا　　تیری نگاہ کی گردش ہے میری رستا خیز

اقبال عشق کو ایمان کا سب سے اہم جزو خیال کرتا ہے بغیر عشق کے کوئی شخص مسلمان ہونے کا دعویٰ کر نہیں سکتا۔

اگر ہے عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی　　نہ ہو تو مرد مسلمان بھی کافر و زندیق

عاشق اپنے محبوب کے ظلم وستم کو عین لطف وکرم سمجھتا ہے۔

نخچیر محبت کا قصہ نہیں طولانی　　لطف خلش پیکاں آسودگی فتراک

بیان محبت خواہ کسی زبان میں ہو۔ شیریں معلوم ہوتا ہے۔ پریم کا رس ہر بول میں مٹھاس پیدا کر دیتا ہے۔

ترکی بھی شیریں تازی بھی شیریں　　حرف محبت، ترکی نہ تازی

حیات انسانی کی رنگینی اور لطف کا تمام تر انحصار محبت پر ہے اگر یہ مقدس جذبہ فطرت انسانی سے الگ کر دیا جائے تو وہ بہائم سے بھی بدترین بن جائیگا۔

عشق کے مضراب سے نغمہء تار حیات　　عشق ہے نور حیات عشق ہے نار حیات

عاشق صادق کی پر درد آہیں اور جانسوز نالے کبھی رائیگاں نہیں جاتے بلکہ عالم بالا سے وہ ضرور ایک دن تاثیر بدامن واپس ہوتے ہیں اور دل عاشق کے لئے مرہم ثابت ہوتے ہیں۔ ابتداء میں بیشک عاشق کی آنکھوں کے سامنے پردے ڈال دئے جاتے ہیں۔ اور وہ دیدار محبوب سے محروم رہتا ہے لیکن رفتہ رفتہ عشق کی آگ ان حجابات کو جلا دیتی ہے اور عاشق راز و نیاز کی ابدی لذتوں سے سرشار ہو جاتا ہے۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر　　کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

وصل کا تقاضہ کرنا عاشق صادق کو زیبا نہیں ہے۔ اگر کسی وقت حرف مدعا زبان پر آ بھی جائے تو یہ امر اتفاقی ہے

اس میں ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حسرت موہانی کا شعر ہے۔

طلب، عادت نہیں اہل رضا کی   یہ لغزش تھی زبان مدعا کی

اقبال نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

تھا ارنی گو کلیم میں ارنی گو نہیں   اس کو تقاضا روا مجھ پر تقاضا حرام

سچے عاشق کو ہجر میں وصل سے بھی زیادہ لطف آتا ہے وصل، عشق حقیقی کی موت ہے کیونکہ عشق کی بنیاد آرزو پر ہے اور وصل کے بعد یہ باقی نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اقبال ہی کا ایک فارسی شعر ہے۔

تو نہ شناسی ہنوز بمہرو وصل   چیست حیات دوام سوختن نا تمام

پروانہ جب تک شمع کا دیوانہ وار طواف کرتا ہے مجسم عشق بنا رہتا ہے۔ لیکن جونہی شعلہ شمع کی ہم آغوشی کی ہوس میں آگے بڑھتا ہے جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ اسی لیے عشاق ہجر کی مصیبتوں کو خوشی خوشی برداشت کرتے اور وصل سے موت کی طرح ڈرتے ہیں۔

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق   وصل میں مرگ آرزو ہجر میں لذت طلب

اخلاق:

بال جبریل میں اقبال سب سے زیادہ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اس کی زندگی بسر کرنے کے جو طریقے بتلائے گئے ہیں وہ موجودہ حالات کا بہت گہرا مطالعہ کرنے کے بعد مرتب کئے گئے ہیں۔ اور اقتضائے وقت کے لحاظ سے نہایت موزوں و مناسب ہیں۔ غلامی کی بیماری انسان کے احساسات و جذبات کو مردہ کر کے اس کو دنیا کی تمام نعمتوں اور زندگی کی ساری خوشیوں کی لذت سے محروم کر دیتی ہے۔

غلامی کیا ہے ذوق حسن و زیبائی سے محرومی   جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہیں وہی زیبا

آزادی کے چھنتے ہی انسان کی بصیرت مفقود ہو جاتی ہے یہی نہیں بلکہ اس کو اندھا بنا دیتی ہے جو شخص آنکھیں رکھتے ہوئے اپنے ہاتھ سے آزادی کا گوہر بے بہا گم کر دے اس کے اندھے پن پر کون شبہ کر سکتا ہے حق تو یہ ہے کہ جو آزاد ہیں وہی بینا کہلانے کے مستحق بھی ہیں۔

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر   کہ دنیا میں فقط مردان حق کی آنکھ ہے بینا

وہی لوگ دنیا میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو آج ہی کل کی فکر کر لیتے ہیں۔ وہ ”چوں بہ فردا برسی روزیِ فردا برسد“

کے مطلق قائل نہیں ہوتے۔

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے ۔۔۔ زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

جو لوگ کہ آج ہمیں شادکام نظر آرہے ہیں انہوں نے سب کچھ آج ہی حاصل نہیں کرلیا بلکہ وہ کل ہی اس ''آج'' کے روشن بنانیکی ترکیبیں سوچ چکے اور تدبیریں کرچکے تھے۔ ہرکام صرف اسی وقت تک مشکل نظر آتا ہے جب تک مشکل سمجھ کر اسے شروع نہ کیا جائے جہاں ایک مرتبہ ہمت کی تو۔

پھر کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا ۔۔۔ ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

ہمت کے آگے پربت رائی ہے اور اٹل ارادے کے سامنے زمین تو کیا آسمان بھی پیش پا افتادہ چیز ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے ۔۔۔ کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

غلام کا صرف جسم ہی اس کے آقا کے قبضہ میں نہیں رہتا بلکہ رفتہ رفتہ اس کے دل ودماغ پر بھی آقا کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔

پانی پانی کر گئی مجھکو قلندر کی یہ بات ۔۔۔ تو جھکا جب غیر کے آگے تو تن تیرا نہ من

جو انسان حقیقی معنوں میں خدا کا بندہ ہے وہ دراصل ساری خدائی کا مالک ہے اس لئے کہ خدا کی غلامی پادشاہی کے مترادف ہے برخلاف اس کے جو آدمی بندہ دنیا بن جاتا ہے وہ ذلیل خوار ہوتا ہے۔ ایک غلامی سے آقائی کی خلعت نصیب ہوتی ہے۔ اور ایک غلامی سے گدائی کی لعنت طوق گردن بنتی ہے۔ اب انسان جو چاہے اپنے لئے منتخب کرلے۔

یہ بندگی خدائی وہ بندگی گدائی ۔۔۔ یا بندۂ خدا بن یا بندہ زمانہ

کسب حلال انسان کو خوددار اور دلیر بناتا ہے۔ وہ کسی کے آگے اپنا سر نہیں جھکاتا۔ اپنی پھٹی پرانی کمبل ہی میں اس کو قیمتی شال کا لطف آتا ہے۔ اس کی زبان دل کی سچی ترجمان ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اظہار حق میں کبھی پس وپیش نہیں کرتا۔ لیکن ناجائز ذرائع سے جو روزی حاصل ہوتی ہے۔ وہ انسانوں کو بزدل خوشامدی اور کمینہ بنادیتی ہے۔ وہ اپنے حاکموں کے ہاتھ اپنی آزادی بیچ ڈالتا ہے۔ اقبال اس ذلیل زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی ۔۔۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

تصوف:

تصوف اقبال کے کلام کی جان ہے۔ اس کے تصوف کے بنیادی اصول مولانائے روم کے عقائد ہیں۔ اقبال

رومی پر مٹا ہوا ہے۔ اس والہانہ عقیدت مندی ہی کا اثر ہے کہ خود اس کے کلام میں بھی رومی کی سی بیبا کی اور ''فاش گوئی'' پیدا ہوگئی ہے۔ رومی کی طرح اقبال بھی اپنے خیال کے آگے شعر کی ظاہری خوبیوں کی مطلق پرواہ نہیں کرتا وہ خدا سے دعا کرتا ہے کہ ''مرا نور بصیرت عام کردے'' جس آگ میں وہ خود جل رہا ہے دوسروں کو بھی اسی میں جلانا چاہتا ہے۔ اس کوشش میں بعض بعض جگہ اس کا لہجہ کسی قدر تلخ بھی ہو جاتا ہے چنانچہ اس تلخی کا سبب وہ خود بتاتا ہے۔

میری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی　　　　کہ بانگ صور سرافیل دلنواز نہیں

اقبال شاعری کو اظہار کمال کا ذریعہ قرار نہیں دیتا بلکہ وہ اس وسیلہ سے کائنات کے رازوں کو آشکار کرتا ہے۔

میری نوائے پریشان کو شاعری نہ سمجھ　　　　کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

بال جبریل میں اقبال کا انداز حکیمانہ اور صوفیانہ سے زیادہ قلندرانہ ہے وہ اس امر کا خود اعتراف کرتا ہے۔

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری　　　　وگرنہ شعر میرا کیا ہے شاعری کیا ہے۔

جو لوگ ''اہل دل'' اور ''اہل نظر'' ہیں وہ ماضی اور حال ہی کے واقعات سے باخبر نہیں ہوتے بلکہ مستقبل میں پیش آنے والے حادثات کا بھی ان کے آئینہ دل پر صاف عکس پڑتا ہے۔

حادثہ وہ جو ابھی پردہ افلاک میں ہے　　　　عکس اس کا میرے آئینہ ادراک میں ہے

اقبال دراصل نہ قدری ہے نہ جبری بلکہ اس کا مسلک درمیانی ہے وہ اگر ایک طرف ارتکاب جرم پر انسان کو سزا کا مستحق سمجھتا ہے تو دوسری طرف خدا سے بھی شرمساری کا متوقع ہے کیونکہ جرم کے ارتکاب میں صرف انسانی ارادے ہی کو دخل نہیں ہے بلکہ یہ ارادہ بھی کسی اور ارادے کے اشاروں پر کام کرتا ہے اقبال قاتل کو جہاں قصاص کا حکم سناتا ہے۔ وہاں شمشیر ساز کو بھی تھوڑا سا جرمانہ کرتا ہے۔

روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل　　　　آپ بھی شرمسار ہو، مجھکو بھی شرمسار کر

عام لوگ جلوہ خداوندی کے دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتے یہ کام خاصان خدا کا ہے جن کے قلوب انوار الٰہی سے معمور رہتے ہیں۔ عامیوں کو نور مطلق کی ایک ہلکی سی جھلک بھی بے قابو کردیتی ہیں اور وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتے ہیں لیکن محرمان راز حقیقت تجلیات الٰہی کی بارش میں بھی اطمینان قلب نہیں کھوتے۔

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محراب منبر پر　　　　یہ نادان گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا

منظر عام پہ آنا حسن کی فطرت ہے۔ حسن مطلق ذرے ذرے میں سمایا ہوا ہے۔ صاحب نظر اس کا ہر جگہ نظارہ

کرتے ہیں۔ عام لوگوں کی بنیائی ہی ان کی آنکھوں کا پردہ بن جاتی ہے اور وہ جلوہ حق کی دید سے محروم رہ جاتے ہیں۔

وہ اپنے حُسن کی مستی سے ہیں مجبور پیدائی — کہ ان آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسباب مستوری

شوخی بیان:

اقبال کلام میں نہ صرف غالب کی سی شوخی، بلند پروازی اور خودداری موجود ہے۔ بلکہ اس میں عمر خیام کی سی آزاد مشربی اور بے باکی بھی پائی جاتی ہے۔

غلطیوں اور کمزوریوں کا پتلا، انسان خدا کا نافرمان بندہ ہی سہی لیکن حقیقت میں یہی اس ویرانہ آباد نما کی رونق اور چہل پہل کا باعث ہے۔

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن — تر خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

اس خرابے میں انسان ہی کی محنت کے طفیل مختلف نیرنگیاں، طرح طرح کی دلچسپیاں اور بھانت بھانت کی رنگ رلیاں مچ رہی ہیں۔ اسی کے دم سے اس ویرانے میں فلک بوس عمارتیں بنیں اور اس صحرا میں غیرت باغ جنت چمن تیار ہوئے۔

میری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے — وہ دشت سادہ وہ تیرا جہان بے بنیاد

گل ونرگس و سوسن و نسترن — شہید ازل لالہ خونیں کفن

جہاں چھپ گیا، پردہ رنگ میں — لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں

فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور — ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

اسی نظم میں پہاڑی ندی کی کیا چلبلی تصویر کھینچی ہے۔

وہ جوئے کہستان اچکتی ہوئی — اٹکتی، لچکتی سرکتی ہوئی

اٹکتی، لچکتی سرکتی ہوئی — بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ — پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

۹ حقیقی مومن:

ایک سچا مسلمان، بندوقوں، تلواروں، بموں اور ہوائی جہازوں کے بل پر نہیں لڑتا بلکہ وہ اپنے دشمن پر "تائید الٰہی" سے عروس فتح سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک خدا کے سوا کسی دوسری چیز پر بھروسہ کرنا کفر ہے۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ — مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

مومن حقیقی سوائے خدا کے کسی دوسرے کا سہارا یا پناہ قبول نہیں کرتا اسی لئے دنیا کی تمام قومیں اس کے آگے سر جھکا دیتی ہیں۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث　　مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے۔

بانگ درا میں اقبال نے مومن کی لامحدود قوتوں کیطرف یوں اشارہ کیا ہے۔

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا　　نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اسی خیال کا بال جبریل میں یوں اعادہ کیا ہے۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر، مسلمان　　مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

سچا مومن مفلوک الحالی میں بھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتا اسے اپنی فقیری میں شاہی کے مزے ملتے ہیں لیکن جس شخص کا اعتقاد کچا اور ایمان کمزور ہوتا ہے اس کو مال و دولت کے باوجود حقیقی آرزو، ایک بیش بہا نعمت ہے۔ اس کے بغیر زندگی بے لطف ہے خدا کے پاس ہر چیز موجود ہے اس کو آرزو کرنیکی ضرورت ہی پیش نہیں آتی اس لئے وہ اس کی لذت سے بھی غالباً واقف نہیں ہے۔ اقبال آرزو کے سوز و ساز کو بڑے سے بڑے معاوضے پر بھی دینے پر تیار نہیں ہے۔

متاع بے بہا ہے درد سوز آرزومندی　　مقام بندگی دیکر نہ لوں شان خداوندی

انسان کو خدا کے ہنر کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اس کے قبضے میں سمندر، بجلی، وغیرہ سب کچھ ہے لیکن اس میں نقائص یہ ہیں کہ وہ خود شناس خداشناس اور جہاں شناس نہیں ہے۔

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا　　کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں　　وہی شاہکار ہے تیرے ہنر کا

سیاسیات:

اقبال کو انسان کی موجودہ پستی کا شدید احساس ہے۔ اس کی یہ دلی تمنا ہے کہ انسان حقیقی معنوں میں اشرف المخلوقات بنے اس لئے وہ انسانی زندگی کے ہر شعبے کے مختلف خیالات پیش کرتا ہے۔ وہ کبھی علم و اخلاق کے خاص خاص نظریوں کی تلقین کرتا ہے تو کہیں تصوف کا درس دیتا دکھائی دیتا ہے ایک طرف زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کی تدبیریں بتاتا ہے تو دوسری طرف انسان کو اس کی اصلی عظمت یاد دلا کر اس کی حمیت کو جوش میں لاتا ہے۔

اس کا عقیدہ ہے کہ مذہب کو سیاسیات سے علیحدہ کرنا بڑی اہم غلطی ہے۔ حکومت کی کوئی شکل بری نہیں بشرطیکہ

حکمراں طبقہ اپنے دل میں حقیقی معنوں میں احساس مذہب رکھتا ہو۔ مذہب سے الگ رہ کر کوئی نظام حکومت عرصہ تک مفید نہیں رہ سکتا۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مذہب معلم اخلاق ہے۔ جب سیاست اس کے تحت آ جاتی ہے تو اہل سیاست اخلاق کی قائم کردہ حدود سے باہر نکلتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ ان پابندیوں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب ان کو مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اس صورت میں وہ اپنی پسند ''کو قانون'' اور اپنے مخصوص مسلک کو ''مذہب کی خلعت عطا کر کے اس کو رائج کرنیکی جان توڑ کوشش کرتے ہیں۔ ہر نیا حکمران اپنے نئے مسلک کی ترویج پر زور دیتا ہے۔ اس سے تھوڑی مدت کے بعد انقلابات ہوتے رہتے ہیں جو امن عامہ کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔ آج دنیا میں کسی جگہ اشتراکیت کا ڈھول پٹ رہا ہے تو کہیں جمہوریت کا نقارہ بج رہا ہے۔ کہیں فاسطیت کے دف کی آواز آ رہی ہے۔ تو کسی جگہ نازیت کے دمامے پر مسلسل ضربیں پڑ رہی ہیں۔ دنیا میں ایسا کون بدذوق ہے۔ جو اس عظیم الشان کورس (chorus) کو سنکر اپنی روح میں سکون محسوس کرتا ہے قومیت کا بھوت ہر ملک میں ناچ رہا ہے اس کا اثر یہ ہے کہ ہر ملک اپنے مفاد کے لئے سب سے پہلے اپنے ہمسائے پر ہی ہاتھ صاف کرنے کی فکروں میں لگا ہوا ہے۔ بھلا اس نفسا نفسی میں بھی کہیں امن پرورش پا سکتا ہے موجودہ تہذیب کے فرزند مذہب کے ہاتھوں کو ہمیشہ خون میں بھرا ہوا دیکھتے ہیں اور اس سے ایک درندے کی طرح خائف ہیں۔ لیکن ان اندھوں کو ذرا غور و فکر کی توفیق ہو تو معلوم ہو جائے کہ موجودہ تہذیب سراسر خون آلود ہے۔ جنگ عظیم کے مقابلے میں مہابھارت کی جنگیں بچوں کی لڑائیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں پھر ان روشن خیال لوگوں نے ترک مذہب کر کے ایسا کون سا تیر مار لیا سچ تو یہ ہے موجودہ ترقی یافتہ ملکوں کی حکومت کی بنیاد مکاری پر قائم ہے۔ جس کو ''ترقی یافتہ لوگ سیاست کے مہذب نام سے پکارتے ہیں یوں دیکھنے کو تو روس میں مزدور کی حکومت ہے۔ اور جرمنی و ترکی میں جمہوریت قائم ہے مگر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ صرف اسٹالن۔ ہٹلر اور کمال کے ارادوں اور عقیدوں کی روح دراصل تمام روس، جرمنی اور ترکی میں جاری و ساری ہے۔

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

حصول آزادی کے لئے اقبال قوت کو ضروری خیال کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ غلامی کے طوفان سے وہی لوگ صحیح سلامت پار اترتے ہیں جو اپنے سخت اور قوی بازوؤں سے موجوں کو مردانہ وار چیرتے چلے جاتے ہیں خالی ضد یا بھیک

مانگنے سے آزادی حاصل نہیں ہوتی جو لوگ میدان جنگ کو اپنے خونِ جگر سے لالہ زار بنا دیتے ہیں وہی ایک دن عیش و عشرت کی مئے لالہ فام کے مستحق قرار دیے جاتے ہیں۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے۔ شمشیر وسناں اوّل طاؤس ورباب آخر

مناظر قدرت:

بال جبریل میں اقبال نے مناظر قدرت کی عکاسی کی طرف بہت ہی کم توجہ کی ہے۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلے وہ اہل عالم کو جہان رنگ وبو کی سیر کا دلکش پیغام پہنچانا اپنا کام سمجھتا تھا۔لیکن اب وہ زمانے کو ''داغہائے سینہ من کمتر از گلزار نیست'' کا دلگداز نالہ سنانا اپنا فرض جانتا ہے اس کے باوجود بھی کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے مرقعے نظر آجاتے ہیں مثلاً

وادی کہسار میں غرق شفق ہے سحاب لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

یا

ہوا خیمہ زن کاروان بہار ارم بن گیا دامن کوہسار

کافر ہے مسلمان تو امیری نہ فقیری مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

مصیبت میں صبر نہ کرنا اور پریشانیوں سے تنگ آکر نالہ وفریاد کرنا بزدلوں کا کام ہے۔سخت سے سخت اذیت پہنچنے پر بھی مومن کی پیشانی پر شکن تک نہیں آتی۔

ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش میں بندہ مومن ہوں نہیں دانہ اسپند

اپنے متعلق:

یوں تو اقبال کا سمند طبع ہر میدان میں یکساں جولانیاں دکھاتا ہے لیکن جہاں کہیں اس کو اپنے متعلق کچھ کہنے کا موقع ملتا ہے وہاں خوب ہی جوہر دکھاتا ہے۔اس کے نزدیک خدارسی کا بہترین اور آسان ترین ذریعہ تلاش خودی ہے جس نے خود کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا اسی لئے وہ ایک جگہ کہتا ہے۔

غلام ہمت آن خود پرستم کہ از سوز خودی بیند خدارا

جب اقبال اپنے متعلق کچھ بیان کرتا ہے تو اس کا طرزِ کلام زیادہ قلندرانہ اور دلکش ہوجاتا ہے۔

فقیر راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی بہا میری نوائے دولتِ پرویز ہے ساقی

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم　　　　عصا نہ ہوتو کلیمی ہے کار بے بنیاد

نو گرفتار محبت بارگاہ حسن کے آداب سے پوری طرح واقف نہیں ہوتا۔ اس کو کیا خبر کہ روئے محبوب کی بیباکی سے دیکھنا کتنا بڑا جرم ہے وہ تشنگی، دیدار بجھانے کی خاطر بار بار چہرہ دوست کی طرف نظریں دوڑاتا ہے۔ ابھی اس کا دل ایک حد تک اس کے قابو میں ضرور ہوتا ہے لیکن اپنی آنکھوں پر اس کا مطلق بس نہیں چلتا۔

میں تو بے نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہی اولی　　　　کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو

موجودہ زمانہ کا مسلمان جس کے قوائے عملی تقریباً مفلوج ہو چکے ہیں اپنے اسلاف کے کارناموں پر ناز کرتا اور پدرم سلطان بود کے بے ہنگام راگ الاپتا پھرتا ہے اقبال اس سے یوں خطاب کرتا ہے۔

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے　　　　تری پرواز لولاکی نہیں ہے

یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری　　　　تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

جب تک مسلمانوں میں ان کے اسلاف کے جوہر پیدا نہ ہوں گے وہ ذلیل خوار ہی رہیں گے موجودہ مسلمان گفتار اور کردار کی صفت میں بھی اپنے آباواجداد سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے پھر ان کی زندگی کیونکر خوشگوار ہو سکتی ہے۔

اے لالہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں　　　　گفتار دلبرانہ کردار قاہرانہ

بعض اوقات انسان کو دشمنوں سے زیادہ دوستوں سے نقصان پہنچتا ہے۔ گھر کے بھیدی ہمیشہ سے لنکا ڈھاتے چلے آئے ہیں۔

خزاں میں بھی کب آ سکتا تھا میں صیاد کے بس میں　　　　میری غماز تھی شاخ نشیمن کی کم اوراقی

چھپانے کی کوشش میں راز اور بھی زیادہ آشکارا ہوتا ہے۔

کہہ گئی راز محبت پردہ داری ہائے شوق　　　　تھی فغاں وہ بھی جسے ضبط فغاں سمجھا تھا میں

عقل و عشق کا کس قدر پر لطف موازنہ ہے۔

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے　　　　عشق بے چارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

ایک سراپا نیاز بادہ خوار اپنے ساقی باوقار سے کس لجاجت کے ساتھ شراب مانگ رہا ہے۔

تو میری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ　　　　تیرا پیمانہ میں ہے ماہ تمام اے ساقی

انسان اگر اپنی ناکامیوں اور مصیبتوں پر روتا ہی رہے گا تو اس کے اس کام کے لیے اپنی عمر بھی کافی نہ ہوگی اس

جب اقبال کو اپنے کمال کا احساس ہے اور اس عطا پر وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ اپنی آزادی پسند طبیعت اور آزادروی کی ایک جگہ یوں تصویر کھینچا ہے۔

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں | غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی میری فطرت ہے لیکن | کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

مندرجہ ذیل شعروں میں اقبال کی سیرت کا عکس کس قدر واضح نظر آتا ہے۔

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی | خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویش خدا مست شرقی ہے نہ غربی | گھر میرا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمر قند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق | نے ابلہء مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش | میں زہر ہلا ہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندہ حق بین وحق آگاہ | خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند
ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش | میں بندہ مومن ہوں نہیں دانہ اسپند
پر سوز و نظر بازونکو بین و کم آزاد | آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم | کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوق شکر قند

ان مختلف اشعار کے علاوہ بعض مسلسل نظمیں مثلاً ''لینن'' ''ذوق شوق'' ''ساقی نامہ'' ''فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں اور روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے''۔ ''جبرائیل وابلیس'' ''جاوید کے نام'' اور ''مسولینی'' لاجواب ہیں ان میں اقبال کے عقائد کے نقوش زیادہ گہرے ہیں۔

بعض اشعار:

اب یہاں ہم وہ اشعار درج کرنا چاہتے ہیں جو گزشتہ سرخیوں کے تحت نہیں آئے مثلاً طاقتور کی حکومت کامیاب ہوتی ہے کیونکہ اس کی نافرمانی کی جرات بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا نظریہ بالکل پہلے کی طرح اب بھی صحیح ہے۔

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحر قدیم | گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم

حکومت تو پھر حکومت ہے قوم کی اصلاح بھی بغیر قوت۔ نہیں ہوسکتی۔

لیے ہر افتاد پر رنج و غم کرنا مصیبت میں زیادہ شدت پیدا کرنا ہے۔

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم　　　　مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

انسان کو حقیقی آزادی کبھی میسر نہیں آسکتی۔ جس طرح اس زندگی میں ایک مرتبہ مرنے پر انسان مجبور رہے اسی طرح دوسری زندگی میں وہ جینے پر مجبور ہے۔

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا　　　　یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

بال جبریل بیشک بیسویں صدی کی بہترین تصنیفوں میں شمار ہونے کے قابل ہے اس کے ہر صفحہ پر زندگی کا ایک زبردست تلاطم نظر آتا ہے۔ اشعار کیا ہیں طوفان حیات کی فلک بوس موجیں ہیں جن میں مردہ قوموں کا جمود خس وخاشاک کی طرح چشمِ زدن میں بہہ سکتا ہے۔ جس شد و مد کے ساتھ اس کتاب میں درس عمل پیش کیا گیا ہے اس کی نظیر پیش کرنے سے کم از کم اردو ادب تو قاصر ہے۔ یہ کتاب دراصل انقلابات وحوادث روزگار کے اسباب وعلل کا آئینہ ہے۔

والدہ مرحومہ کی یاد میں

ڈاکٹر نورالحسن نقوی

یہ نظم اقبال کی دلکش اور پرتاثیر نظموں میں سے ایک ہے۔ دراصل یہ ایک مرثیہ ہے اور وہ بھی شاعر کی ماں کا مرثیہ۔ اس لیے ہمارے دلوں پر جتنا گہرا اثر چھوڑے کم ہے۔تاثیر کے معاملے میں کوئی نظم مرثیے کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ دل پر چوٹ لگتی ہے تو بے اختیار زبان سے ایسے کلمات ادا ہوتے ہیں کہ سننے والے کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ کسی عزیز کی موت سے زیادہ دل کو رنج پہنچانے والا کون سا حادثہ ہوسکتا ہے؟ ماں کی موت سے اقبال کو جو صدمہ پہنچا اس نے ایک لافانی نظم کی شکل اختیار کر لی۔ نظم کا خالق چونکہ فلسفی بھی ہے اس لیے وہ یہاں موت و حیات کے پیچیدہ مسئلے پر اظہار خیال کیے بغیر رہ نہ سکا۔ نظم کی کامیابی کا اصل راز یہ ہے کہ خالص فلسفیانہ مباحث یہاں ایک مکمل شعری تجربہ اور قلبی واردات بن گئے ہیں۔ جن اشعار میں حیات و موت کی حقیقت واضح کی گئی ہے وہ بھی شعریت سے مملو ہیں۔

نظم کا آغاز بڑے ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے اور قاری کی توجہ کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ قاری چشم تصور سے ایک افسردہ و دل گرفتہ انسان کو دنیا کی بے ثباتی پر نوحہ کناں دیکھتا ہے۔ اسے غم ہے کہ آسمان، چاند سورج اور ستارے تقدیر کے آگے بے بس ہیں۔ جس راہ پر چلنے کے لیے انھیں مجبور کردیا گیا چپ چاپ اس پر چلے جارہے ہیں۔ کلیاں چمن میں کھلتی ضرور ہیں مگر مرجھانے کے لیے۔

آسماں مجبور ہے، شمس و قمر مجبور ہیں

انجم سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں

اور

ہے شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں

دوسرا بند پہلے بند کی توسیع ہے۔ یہ جان لینے کے بعد کہ دنیا کی ہر چیز فانی ہے شاعر کی قوتِ احساس مردہ ہوجاتی ہے۔ جو شے رہنے والی نہیں اس کے جانے کا کیا

غم۔ چنانچہ شاعر کا دل الماس کی طرح سخت اور بے حس ہو جاتا ہے، آنسو خشک ہو جاتے ہیں اور لب پر انقلاباتِ زمانہ کا گلہ باقی نہیں رہتا۔

میرے لب پر قصہ نیرنگیِ دوراں نہیں
میرا دل حیراں نہیں، خنداں نہیں، گریاں نہیں

اچانک پردہ گرتا ہے اور یہ منظر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

پر تری تصویر قاصد گریہ پیہم کی ہے
آہ یہ تردید میری حکمتِ محکم کی ہے

اب ایک نیا منظر پیش نظر ہے! شاعر کو کوئی ایسی خبر ملی ہے جس نے اس کی دانائی کو ختم کر دیا اور اس کے جذبات میں ایک ہلچل سی مچا دی۔ آنکھوں کو رونے پر مجبور کر دیا۔ ابہام دیر تک باقی رہتا ہے۔ یہ راز نہیں کھلتا کہ آخر ذہن میں کس کی تصویر ابھری جس نے شاعر کو اس کا بچپن یاد دلا دیا اور اسے کھوئی ہوئی جنت میں پھر سے پہنچا دیا۔ آخر کار یہ راز آشکارا ہوتا ہے کہ یہ ماں کی موت کی خبر تھی جس نے اس کی یاد تازہ کر دی۔

ماں کی موت کا شاعر ذکر نہیں کرتا لیکن جب وہ کہتا ہے کہ۔۔

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار؟ کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار؟
خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا؟

تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد نظم میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

۔۔۔۔۔۔ دنیا کی ہر شے فانی ہے۔ ہر طرف موت کی گرم بازاری ہے مگر موت کی کوئی حقیقت نہیں۔ زندگی فنا نہیں ہو سکتی۔ موت کی مثال ایسی ہے جیسے تھکا ہوا انسان تازہ دم ہونے کے لیے ذرا دیر کو سو جائے۔

۔۔۔۔۔۔ ستاروں کی عمر بے حساب ہے مگر یہ فنا نہیں ہوئے۔ انسان کا رتبہ تو ان سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ وہ کیسے فنا ہو سکتا ہے۔ بیج کو زمین میں دفن کر دیا جائے تو وہ پودا بن کر نمودار ہو جاتا ہے۔ انسانی جسم مٹی میں مل کر مٹ نہیں سکتا۔ اسے ضرور دوبارہ زندگی ملتی ہے۔

جوہر انسان عدم سے آشنا ہوتا نہیں

آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

صبح ہوتی ہے تو کمھلائے ہوئے پھول پھر سے کھل اٹھتے ہیں۔ سوئے ہوئے پرندے جاگ کر چہچہانے لگتے ہیں۔ قدرت کا یہ قانون ہے تو کیسے ممکن ہے کہ انسان کی رات صبح میں تبدیل نہ ہو۔

۔۔۔۔۔ اے ماں! میرا دل تیری یادوں سے اس طرح معمور ہے جیسے کعبے کی فضا دعاؤں سے۔ تو کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔ تیری زندگی مہتاب سے زیادہ روشن تھی۔ انسانی روح جسم کے تاریک زندان سے رہا ہو کے مر نہیں جاتی۔ اللہ تعالیٰ تیرے مرقد کو منور کر دے، آسماں تیری قبر پر شبنم کے موتی برسائے اور سبزہ نورستہ تیرے مرقد کی دربانی کرے۔

نظم کی تعمیر داد کی مستحق ہے اور اس کی عمارت اس طرح نہیں اٹھتی جسے معمار اینٹ پر اینٹ رکھ کے دیوار اٹھاتا ہے بلکہ ایک خیال سے دوسرا خیال اس طرح برآمد ہوتا ہے جیسے شاخ سے کونپل پھوٹتی ہے۔ شاعر کی خود کلامی سے نظم کا آغاز ہوتا ہے۔ اسے خیال آتا ہے کہ کائنات کی ہر شے مجبور اور قانون قدرت کے تابع ہے۔ یہ خیال اسے بے حس بنا دیتا ہے۔ ماں کی موت کی خبر سن کر یہ بے حسی ختم ہو جاتی ہے۔ آنکھ سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ پھر خیال آتا ہے کوئی شے فنا نہیں ہوتی، صرف شکل بدل لیتی ہے تو پھر اس کی ماں کیسے ختم ہو سکتی ہے۔ گویا ایک خیال سے دوسرا خیال پیوست ہے اور نظم ایک عضویاتی کل کی حیثیت رکھتی ہے۔

لب ولہجہ شروع سے آخر تک یکساں نہیں رہتا۔ فنی تقاضوں کے تحت تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ موت وحیات کا مسئلہ زیرِ غور آتا ہے تو رکا رکا لہجہ اختیار کیا جاتا ہے اور زبان کی سادگی باقی نہیں رہتی۔ یہاں موضوع کی مناسبت سے وہ زبان استعمال کی جاتی ہے جس کی وکالت کولرج نے کی ہے یعنی فلسفیانہ زبان! اس کے باوجود شعری آداب ملحوظِ خاطر رہتے ہیں اور پر پیچ فلسفیانہ مباحث شعری پیکر میں تبدیل ہو جاتے ہیں مثلاً کہنا یہ ہے کہ (۱) یہ کائنات کی ہر شے قانون قدرت کی پابند ہے۔ (۲) ہر شے جادۂ فنا پر گامزن ہے جس کا نتیجہ غم ہے اور (۳) زندگی کو فنا نہیں۔ دیکھیے یہ تینوں بیانات کس طرح شعری تجربہ بن جاتے ہیں۔

۱۔ ذرہ ذرہ دہر کا زندانیِ تقدیر ہے ۔۔۔ پردہ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے

۲۔ قافلے میں غیر فریادِ درا کچھ بھی نہیں ۔۔۔ اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

۳۔ زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

ماں کی موت کی خبر جب شاعر کو مصروف بکا کر دیتی ہے تو شاعر کا لہجہ بدل جاتا ہے۔زبان بھی سادہ استعمال کی جاتی ہے کیونکہ اس موقعے پر صناعی فطر تقاضے کے برخلاف ہوتی ہے۔دیکھیے۔

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار

خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی میں تری خدمت کے جب قابل ہوا تو چل بسی

شعری وسائل اس نظم میں بہت فراوانی سے استعمال ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ یہ ایک مرثیہ ہے لیکن ماں کی موت شاعر کے ذہن کو ایسے پیچیدہ مسائل کی طرف لے جاتی ہے کہ زندگی کیا شے ہے اور موت کی حقیقت کیا ہے۔اندیشہ تھا کہ ایسے مسائل شاعری کی زبان یعنی بالواسطہ زبان کے بجائے نثر کی زبان یعنی بلا واسطہ زبان میں ادا ہو جاتے اور نظم شعری حسن سے محروم ہو جاتی۔لیکن شاعر فنی تدابیر کے استعمال سے نظم کے حسن کو برقرار رکھتا ہے۔کبھی رمز و کنایے سے کام لیتا ہے، کبھی ایجاز و اختصار سے تو کبھی تشبیہ واستعارے سے۔مثلاً کہنا یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے فانی ہے۔اس خیال کو ادا کرنے کے لیے اسے کلی کا انجام یاد آتا ہے کہ کھلتی ہے اور مرجھا جاتی ہے۔یہی نہیں بلکہ کلی کی شکل اس کے ذہن کو صراحی کی طرف منتقل کر دیتی ہے اور یاد آتا ہے کہ صراحی ذرا سی چوٹ سے ٹوٹ جاتی ہے۔شاعر کہتا ہے

ہے شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں

ایک کائناتِ معنی ہے کہ اس چھوٹے سے مصرعے میں سما گئی ہے۔

کہنا ہے کہ دنیا کی بے ثباتی کا علم انسان کو صبر دیتا ہے۔س بات کو شاعر یوں ادا کرتا ہے علم وحکمت رہزنِ سامانِ اشک وآہ ہے۔''زندگی کی حقیقت کا علم انسان کو سخت دل بنا دیتا ہے۔سختی شاعر کو ہیرے کی یاد دلاتی ہے اور وہ کہتا ہے۔

''یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے'' اب استعارہ وتشبیہہ کی چند مثالیں بلا تشریح پیش کی جاتی ہیں۔

گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

آہ سیماب پریشاں ، انجم گردوں فروز
شوخ یہ چنگاریاں ممنونِ شب ہے جن کا سوز
شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا؟
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا؟

یہاں صرف چند مثالیں پیش کردی گئیں ورنہ پوری نظم اسی شعری نظام پر قائم ہے اور نظم کا ہر شعر طالبِ توجہ ہے۔

امیجری یعنی پیکر تراشی کے بہترین نمونے بھی اس نظم میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً

جھاڑیاں جن کے قفس میں قید ہے آہِ خزاں
سبز کر دے گی انھیں بادِ بہارِ جاوداں

اور یہ صبح کا منظر۔۔۔

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالہ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ
سینہ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے
سینکڑوں نغموں سے بادِ صبحدم آباد ہے
خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رودبار
ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہمکنار

غنائیت سے یہ نظم پوری طرح لبریز ہے۔ یہ دیکھنا ہو کہ فکر و فلسفہ کس طرح شعر کا لباس پہن کر سراپا ترنم بن جاتے ہیں تو یہ نظم اس کی بہترین مثال ہے۔ یہاں فلسفہ فلسفہ نہیں رہتا شاعر کے احساس کی گرمی اسے پگھلا کر شعری تجربہ اور قلبی واردات میں تبدیل کر دیتی ہے۔ فکر اور فن کی دوئی مٹ جاتی ہے۔ یہاں اس کا بہترین موقع بھی تھا کیونکہ یہ مرثیہ ہے جس کی بنیاد ہی جذبات و احساسات پر ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ مرثیے میں فکر جذبے کی شکل اختیار نہ کر لے۔

نظم کے لیے بحر رمل مثمن محذوف کا انتخاب کیا گیا ہے یعنی: فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن (دوبار) یہ بحر مترنم ہے اور بہت پسندیدہ۔ نظم مثنوی کی فارم میں ہے۔ ہر شعر کا قافیہ و ردیف جداگانہ ہے۔ معنی میں تسلسل ہے۔ لیکن خیالات و جذبات کئی اکائیوں میں تقسیم ہیں اور ہر ایک کے لیے ضرورت کے مطابق چھوٹا یا بڑا بند تشکیل پاتا ہے۔

نظم کا خاتمہ مرثیے کی مناسبت سے دعائیہ اشعار پر ہوتا ہے۔ آخری بند میں ماں سے تخاطب ہے۔ پہلے کہا گیا ہے کہ تیری یاد میرے دل میں اس طرح آباد ہے جیسے کعبے کی فضا دعاؤں سے۔۔

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے

جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

ماں کی یاد کے لیے کیسی مقدس تشبیہہ کا انتخاب کیا گیا ہے!

اس کے بعد ماں کی زندگی کو چاند سے زیادہ تابناک اور اس کے سفرِ حیات کو ستارے کی گردش سے خوب تر بتایا گیا ہے اور دل سے نکلی ہوئی اس پرتاثیر دعا پر یہ لازوال نظم ختم ہو جاتی ہے۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا!

نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا!

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

I am afraid you will find difficulties. You have got no money to live upon as I have now. You are not going to draw any salary at least for some months unless contributors allow you to do so. Contributors won't allow until a good sum has been collected. This will take some ... do I believe that the Peshawar people will send money

You take my subscription as 375 & such as 500/.
120 I will give you as a loan. ...
I will write one.

محراب گل افغان کے افکار ایک جائزہ

ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان

''محراب گل افغان کے افکار'' بیس قطعات یا غزل نما ٹکروں [۱] پر مشتمل، ضربِ کلیم (مطبوعہ جولائی ۱۹۳۶ء) کا آخری باب ہے۔ [۲] ضرب کلیم کی اشاعت کے دو ڈھائی ماہ بعد حکیم محمد حسن عرشی کے استفسار پر علامہ نے ان کے نام اپنے مکتوب محررہ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۶ء میں ''محراب گل'' کو ایک فرضی نام بتایا۔ [۳] البتہ ''خوشحال و اقبال'' کے مصنف میر عبدالصمد خان نے اس نام کے انتخاب کو علامہ کے ایک افغان دوست موضع خدر خیل (ضلع کوہاٹ) کے رسالدار سجید گل سے متضاد قرار دیا ہے۔ انہوں نے شاعر افغان شناس خوشحال خان خٹک کی شاعری سے علامہ کے تعارف کو بھی اس افغان دوست کے تعلق سے منسوب کیا ہے۔ وہ اس کے ثبوت میں سجید گل رسالدار کے فرزند زرین خان سے اپنے انٹرویو کا حوالہ لائے ہیں زرین خان نے میر صاحب کو بتایا کہ

> جب رسالدار صاحب نے اُن (اقبال) سے محراب گل افغان کی شخصیت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا ''مجھے پٹھانوں سے جتنی محبت ہے اتنی کسی اور سے نہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پٹھانوں کے ناموں کے آخر میں گل ہی ہوتا ہے جیسا کہ آپ کے نام کا آخری حصہ گل ہی ہے۔ بس میں نے اسی نسبت سے یہ ایک فرضی نام محراب گل چُن لیا ہے۔ [۴]

میر صاحب کے استدلال کے دوسرے حصے ''کلام خوشحال'' سے متعلق ان کا کہنا یہ ہے کہ علامہ کی سجید گل سے پہلی ملاقات ۱۹۱۹ء میں ہوئی جب سجید گل کا رسالہ میاں میر چھاونی لاہور میں تھا۔ اس سے قبل علامہ اقبال نے خوشحال خان خٹک کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ [۵]
لیکن ڈاکٹر عابد پشاوری محراب گل کے پردے میں خوشحال خان خٹک کو دیکھتے ہیں وہ ٹھوس دلائل لاتے ہیں مثلاً وہ نظم اقبال کے پہلے ٹکڑے

میرے کہستان تجھے چھوڑ کر جاؤں کہاں

کا تقابل خوشحال خاں کے پشتو شعر سے کرتے ہیں۔

هغه باد چه کابل خیز دے

په ما وارہ عنبر بیز دے

کابل سے اُٹھنے والی ہوا میرے لئے عنبر بکھیرنے والی ہے۔۔۔یعنی کہستان کابل سے یہ محبت رسالدار سجید گل سے تعلق نہیں رکھتی۔ نظم کی فضا بھی افغانی ہے جو سرزمین کوہاٹ سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ ٹکڑے کا یہ شعر بھی رسالدار سجید گل کی زندگی سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اے مرے فقرِ غیور فیصلہ تیرا ہے کیا

خلعت انگریز یا پیرہن چاک چاک

سجید گل ساری عمر انگریزی فوج میں ملازم رہا ہے یا وظیفہ خوار اسے اس حریت سے کیا واسطہ جو اس شعر میں

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش

جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

میں بیان ہوئی ہے۔

''خلعت انگریز کی جگہ 'خلعت سلطاں' رکھ دیجئے تو تصویر بدل جاتی ہے۔ اس کے پردے میں وہ مفکر، حکیم ملت افغانیاں سردار فقیر منش جھانکنے لگتا ہے جسے افغان بابائے پشتون اور اقبال حکیم ملتِ افغانیاں نابغہ اور مجاہد شاعر کا نام دیتے ہیں۔'' ۶؎ جس کے بارے میں علامہ اقبال نے بالِ جبریل (مطبوعہ جنوری ۱۹۳۵ء) میں ''خوشحال خان کی وصیت'' کے تحت عنوان لکھا

کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات — وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند

اڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ — مغل شہسواروں کی گردِ کمند

حاشیہ میں یہ نوٹ بھی درج ہے۔

خوشحال خان خٹک پشتو زبان کا مشہور وطن دوست شاعر تھا۔ جس نے افغانستان کو مغلوں سے آزاد کرانے کے لئے سرحد کے افغان قبائل کی ایک جمعیت قائم کی۔ ۷؎

علامہ کی پٹھانوں سے محبت، ان کی مختلف تحریروں میں ملتی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُن کے مستقبل کے

بارے میں مسلسل غور وفکر کرتے رہے۔ ظاہر ہے اس غور وفکر میں خوشحال خان خٹک کی پیدا کردہ روحِ حریت و جمعیت کا واضح عمل دخل تھا۔ ۱۹۱۰ء میں علامہ نے ''افغانستان کے مستقبل'' کے بارے میں لکھا تھا۔

تاریخ کا فیصلہ اٹل ہے کہ حائل مملکتیں عظیم سیاسی وحدتوں کی صورت اختیار کرنے میں ہمیشہ ناکام رہی ہیں۔ ملکِ شام جو سلطنتِ روما اور اہل فارس کے درمیان ایک حائل مملکت تھا۔ اسی صورت حال سے دوچار رہا۔ لہٰذا افغانستان کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی دشوار ہے۔ ۸

پیام مشرق (مطبوعہ مئی ۱۹۲۳ء) کے دیباچے میں اقبال نے ع زندگی جہد است واستحقاق نیست کی تاریخی حقیقت واضح کرتے ہوئے لکھا۔

فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے اِنَّ اللہ لَا یُغَیِّرُ مایقوم حَتّٰی یُغَیِّرُو امَابِا نفسِھم ۹ کے سادہ و بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرقی میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید وتولید ہو۔ قابل احترام ہے۔ اسی بنا پر میں نے ان چند اوراق کو اعلیٰ حضرت فرمانروائے افغانستان کے نامِ نامی سے منسوب کیا ہے کہ وہ اپنی فطری ذہانت و فطانت سے اس نکتے سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں اور افغانوں کی تربیت انہیں خاص طور پر مدنظر ہے۔ اس عظیم الشان کام میں خدا تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو۔'' ۱۰

علامہ نے 'پیش کش' تحتِ عنوان منظوم انتساب میں یہ ''عظیم الشان'' کام اُس ''ملتِ صد پارہ کی شیرازی بندی'' بتایا ہے جس کا آفتاب اقبال غروب ہو چکا ہے ع آفتابِ ماتورات بالحجاب بطحا سے ہند تک ہر کہیں شرارِ زندگی بجھ چکا تھا بس ایک قوم افاغنہ تھی جس کی رگ میں خونِ شیراں ابھی موجزن تھا مگر وہ رستخیز زندگی سے ناواقف، دنیا میں اپنے حصے سے غافل تھی، اسی لئے اس کا کوکب تقدیر بے چمک تھا۔

ملتے آوارۂ کوہ و دمن	در رگِ اُو خونِ شیراں موجزن
زیرک و روئیں تن و روشن جبیں	چشمِ او چوں جرّہ بازاں تیز بیں
قسمتِ خود از جہاں نایافتہ	کوکبِ تقدیر او نا تافتہ
در قہستاں خلوتے ورزیدۂ	رستخیز زندگی نادیدۂ
جانِ تو برمحنت پیہم صبور	کوش در تہذیب افغانِ غیور

تا ز صدیقان این امت شوی

بہرِ دیں سرمایۂ قوت شوی [11]

علامہ کے بقول

''اس عظیم الشان'' فریضے کی حقیقی اہمیت اور وسعت کا پورا پورا اندازہ تھا تو سید جمال الدین افغانی کو'' [12]

لہذا ''افغان'' محراب گل کے جن افکارِ عالیہ کا بیان اس نظم میں ہوا ہے وہ خوشحال خان خٹک اور سید جمال الدین افغانی جیسے ہر نابغہ پر چسپاں کئے جا سکتے ہیں۔

مئی ۱۹۲۸ء کے سہ ماہی اسلامک کلچر حیدر آباد دکن میں خوشحال خان خٹک کی شاعری پر علامہ کا ایک انگریزی مضمون چھپا جس میں انہوں نے افغانوں کو خوشحال خان خٹک کی شاعری کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے اور اسی سے اپنی ذہنی اور فکری حالت بدلنے کی تلقین کی ہے اور وزیر تعلیم افغانستان کو مشورہ دیا ہے کہ وہ خوشحال خان خٹک کے کلام کو مدون کرائیں اور اس پر تحقیق کرانے کا انتظام کریں۔'' [13]

جاوید نامہ (فروری ۱۹۳۲ء) میں آنسوئے افلاک جہاں ابدالی سے محو گفتگو ہیں۔ علامہ ایشیاء کو آب و گل کا پیکر اور ملتِ افغان کو اس پیکر کے اندر دل سے تشبیہ دیتے ہیں۔ وہ وہاں خوشحال خان خٹک کو شاعرِ افغان شناس حکیم ملتِ افغانیاں اور طبیب علتِ افغانیاں کے خطابات سے یاد کرتے ہیں۔ [14]

مثنوی مسافر میں (جو افغانستان کی چند روزہ سیاحت، اکتوبر ۱۹۳۳ء کی یاد دلاتی ہے) علامہ ''افغانوں کی عِلّت'' کی نشاندہی کرتے ہیں۔ خیبر کو تو ایسی زمین بتاتے ہیں جس کا کبک بھی شاہین مزاج ہے لیکن بے مرکزی کے باعث اس کے باشندوں کا ''امروز بے فردا'' ہے۔

خیبر از مردانِ حق بیگانہ نیست	دردِ دل او صد ہزار افسانہ ایست
سرزمینے کبک اُو شاہیں مزاج	آہوئے او گیرد از شیراں خراج
لیکن از بے مرکزی آشفتہ روز	بے نظام و ناتمام و نیم سوز
آہ قومے بے تب و تابِ حیات	روزگار بے نصیب از واردات

ریز ریز از سنگ او مینائے او

آہ از امروز بے فردائے او [15]

انجمن ادبی، کابل میں تقریر کرتے ہوئے علامہ نے جو پیغام دیا وہ بھی اسی نظم کا نثری جلوہ ہے اور مکمل پڑھے جانے کے لائق۔۔ کیونکہ آج بھی جب یہ حروف آپ کے سامنے ہیں کابل کو صرف اور صرف اس کی ضرورت ہے کہ وہ خود کو حائلی مملکت کے زمرے سے نکال لے اور وحدت آشنا ہو"۔۔۔قومیں شعراء کی دست گیری سے پیدا ہوتی ہیں اور اہل سیاست کی پامردی سے نشو ونما پاکر مر جاتی ہیں۔۔۔''افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو قبائلی زندگی سے نکال کر وحدتِ ملّی کی زندگی سے آشنا کر سکے۔" [16]

ستمبر ۱۹۳۴ء میں علامہ کو کتاب "ماڈرن افغانستان" کا پیش لفظ لکھنے کو کہا گیا علامہ نے اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا

''نہ صرف اس لئے کہ میں ہمیشہ سے افغان قوم کو لامتناہی قوتوں کا حامل سمجھتا ہوں بلکہ اس لئے بھی کہ مجھے مرحوم و مغفور بادشاہ نادر شاہ سے ذاتی نیاز حاصل تھا۔ مرحوم وہ سپاہی منش سیاست دان تھے جن کے فہم و ادراک نے ان کی قوم میں نئی زندگی کی لہر دوڑائی اور اسے جدید دنیا سے متعارف کرایا افغانوں کی تاریخ کا نہ اب تک بغور مطالعہ کیا گیا اور نہ بنظرِ استحساں دیکھا گیا۔۔۔ افغانوں کی تاریخ کے باب میں ابھی کام ہونا باقی ہے، ہندوستان میں اور افغانستان میں بھی وہ قوم جس نے محمد غوری، علاوالدین خلجی، شیر شاہ سوری، احمد شاہ ابدالی، امیر عبدالرحمٰن خان، بادشاہ نادر شاہ اور سب سے بڑھ کر مولانا سید جمال الدین افغانی جیسے سپوت پیدا کئے جو بعض پہلوؤں سے (اپنی اپنی جگہ۔م) عظیم مسلمان تھے اور ہمارے دور کے یقیناً عظیم ترین ایشیائی رہنما تھے اور جنہیں ایشیائی زندگی کا ایک اہم جزو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔۔۔۔۔ افغانوں کی قدامت پسندی تو ایک اعجاز ہے۔ یہ اپنی جگہ برقرار بھی ہے اور اسے جدید ثقافتی قوتوں کا نہ صرف شعور ہے بلکہ وہ اس کے مزاج میں رچ بس گئی ہیں۔ یہی افغان قوم کی صحت مندی کا راز ہے قدیم افغانستان دنیا کا تجارتی مرکز تھا اور ازمنۂ وسطیٰ تک اس کا یہی حال رہا۔ حتیٰ کہ جدید دنیا میں بحری آمد و رفت کا آغاز ہوا۔ ایشیاء کی تاریخ اور سیاست میں اس ملک کی حیثیت بنیادی رہی ہے اور رہی گی'' [17]

یہی وجہ ہے جب علامہ نے دور حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ کا علم ضربِ کلیم کے عنوان سے بلند کیا تو اس کی تان ''محراب گُل افغانی کے افکار'' پر ٹوٹی ضربِ کلیم (مطبوعہ جولائی ۱۹۳۶ء) کی اس نظم تک آنے سے پہلے محراب گل کو درج بالا تمام شخصیات کا عکس لینے کی اجازت کے ساتھ ڈاکٹر عابد پشاوری کے ایک اور مگر برحق قیاس سے اقتباس غیر مفید نہ ہوگا۔

اگر ان نظموں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ صریحاً اقبال کے اپنے خیالات ہیں جو انہوں نے افغانوں کو جگانے کے لئے افغان کے منہ سے کہلوائے ہیں یہ محض ایک پیرایۂ اظہار ہے اور بس یہ افکار اقبال کے لئے کچھ نئے نہیں ہیں بلکہ ان کی گونج ۱۹۰۸ء کے بعد کے کلام میں اکثر سنائی دیتی ہے مثلاً

لادینی و لاطینی، کس پیچ میں الجھا تو　　دارو ہے ضعیفوں کا لا غالبَ اِلّاھُو

ممکن نہیں تخلیقِ خودی فانقہوں سے　　اس مشعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی　　ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے خدائی

یہ نکتہ خوب کہا شیر شاہ سوری نے　　کہ امتیازِ قبائل تمام تر خواری

یہ تلقین خودی ایک رسالدار کا نتیجہ فکر نہیں خود اقبال کا اندازِ فکر ہے۔ شیر شاہ سوری کا قول بھی کوئی اقبال جیسا عالم ہی نقل کر سکتا تھا۔ معمولی رسالدار نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال افغانوں کی خودی کو بیدار کرنا چاہتے تھے نصیحت اگر اپنے کسی ہم قوم کی طرف سے ہو تو اس کا اثر بڑھ جاتا ہے لہذا اقبال نے ایک فرضی کردار تراش لیا یہ الگ بات ہے کہ اس کردار کی تخلیق کی طرف رہنمائی کسی ایسی شخصیت نے کی ہو جو خود افغانی ہو اور جس میں وہ تمام جوہر موجود ہوں جو اقبال معاصر افغان قوم میں دیکھنا چاہتے ہیں اس مقصد کے لئے بھی کسی ایک شخصیت نے اقبال کا دامنِ نگاہ اپنی طرف نہیں کھینچا بلکہ اس میں کئی لوگ شریک ہو سکتے ہیں مثلاً نام کے لئے بجید گل (محراب گل اور بجید گل کا ربطِ معنوی ظاہر ہے۔) خودی، خودداری، ہم آہنگی افکار اور آزادی کی تڑپ کے لئے شخصیت و کلامِ خوشحال خان خٹک، انگریزی پر تنقید کے لئے سید جمال الدین افغانی جن کے لئے علامہ نے نہایت بلند خیالات کا اظہار کیا۔ [۱۸]

زمانہ حال میں میرے نزدیک کوئی شخص مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے۔ مصر و ایران و ترکی و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اسے سب سے پہلے عبدالوہاب بخاری اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہوگا۔ موخر الذکر ہی اصل میں موسس ہے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا۔ [۱۹]

محراب گل افغان کے افکار پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو یہ نظم افغانوں کے بارے میں مِن حیثِ القوم

علامہ کے افکار و خیالات اور توقعات کا خلاصہ نظر آتی ہے بد قسمتی سے ضربِ کلیم کی اشاعت تک علامہ کی کوئی آرزو اس حوالے سے پوری نہ ہو پائی لہذا ضربِ کلیم کے خصوصی تناظر میں اس نظم کو افغانوں کے حق میں وصیت تصور کیا جانا چاہیے اور اس حوالے سے عالم اسلام کے لئے جامع پیغام دراصل عہد اقبال میں جیسا کہ پہلے بھی شاید عرض کیا گیا ایک افغانستان ہی فرنگی تسلط سے آزاد مسلم ریاست تھی اس لئے تو اسے ایشیا کا دل کہا گیا۔ لیکن اس کا حائلی مملکت ہونا جیسا کہ ۱۹۱۰ء میں علامہ اقبال نے دیکھا آج بھی اس کے مستقبل کے امکانات کو (جس کی اس میں ہر طرح سے صلاحیت ہے) مخدوش کئے ہوئے ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ علامہ اقبال نے اپنی ایسی نظموں کو خود ہی غزل نما ٹکڑے قرار دیا ہے ملاحظہ ہو مکاتیب اقبال بنام گرامی صفحہ ۲۴۱

۲۔ علامہ نے ضربِ کلیم کی نظموں کو چھے ۶ ابواب میں تقسیم کیا ہے، اگرچہ ہر باب کی نظمیں (قطعات یا غزل نما ٹکڑے) کو الگ الگ عنوان بھی دیئے ہیں۔ البتہ آخری باب ''محراب گل افغان کے افکار'' کے واحد عنوان کے تحت بیس ۲۰ ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔

۳۔ اقبال نامہ اول، مرتبہ عطا اللہ شیخ صفحہ ۳۳

۴، ۵۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خوشحال و اقبال میر عبدالصمد

۶۔ مقالہ اقبال اور ملتِ افغانیہ ڈاکٹر عابد پشاوری مشمولہ محفل اقبال صفحہ ۱۹۱ جموں و کشمیر اکیڈیمی آف کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر ۱۹۷۸ء

۷۔ کلیات اقبال اُردو صفحہ ۴۴۶ شیخ غلام علی لاہور

۸۔ شذراتِ فکر اقبال صفحہ ۸۹ اُردو ترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ملتِ افغانیہ سے علامہ کی توقعات اور خیالات وافکار کے لئے سہ ماہی مجلّہ اقبال (انگریزی) جنوری تا مارچ ۱۹۷۲ء میں بشیر احمد ڈار کا مقالہ ریفلیکشنز آف محراب گل افغان ملاحظہ ہو۔

۹۔ الرعد آیت ۱۱

۱۰۔ کلیات اقبال فارسی (پیام مشرق) صفحہ ۱۸۹ شیخ غلام علی لاہور

۱۱۔ ایضاً صفحہ ۱۸۸

۱۲۔ تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ اُردو ترجمہ سید نذیر نیازی (چوتھا خطبہ)

۱۳۔ خوشحال خان خٹک دی واریئر پوئٹ مشمولہ تھاٹس اینڈ ریفلیکشنز آف اقبال مرتبہ عبدالواحد سید

۱۴۔ کلیات اقبال فارسی (جاوید نامہ) صفحہ ۷۶۵ ایضاً

۱۵۔ کلیات اقبال فارسی (مثنوی مسافر) صفحہ ۸۵۳۔۸۵۲ ایضاً

۱۶۔ مقالات اقبال ۲۶۱۔۲۶۰ عبدالواحد معینی لاہور ۱۹۸۲ء

۱۷۔ اقبال اور ملتِ افغانیہ ڈاکٹر عابد پشاوری ایضاً صفحہ ۱۹۳

۱۸۔ مقالات اقبال صفحہ ۳۱۲۔۲۹۸ ایضاً

۱۹۔ اقبال نامہ دوم صفحہ ۲۳۲۔۲۳۱ ایضاً

خیابان کے سابقہ خصوصی نمبر

۱: خیابان اقبال نمبر

۲: خیابان فاروقی نمبر

۳: خیابان شرر نمبر

۴: خیابان انیس نمبر

۵: خیابان غالب نمبر

۶: خیابان پاکستانی ادب نمبر

۷: خیابان اسلام اور اُردو نمبر

۸: خیابان دانائے راز نمبر

۹: خیابان اصنافِ نثر نمبر

۱۰: خیابان اصنافِ سخن نمبر